27140 کلومیٹر

عشقِ مجازی کی تلاش میں ستائیس ہزار کلومیٹر کا
سفر طے کرنے والے پاکستانی مہاجر کی داستان

جرمنی اور امریکہ کا سفرنامہ

رضوان علی گھمن

پاکستان، ایران، ترکی، یونان، مسیدونیا، سربیا، ہنگری، آسٹریا، جرمنی، سوئزرلینڈ، اٹلی، بلجیم، فرانس، ڈنمارک، پولینڈ، میکسیکو، امریکہ

بغیر ویزے کے صحراؤں، پہاڑوں اور سمندروں کا سینہ چیر کر امریکہ پہنچنے والے پاکستانی مہاجر کی داستانِ محبت

27140 کلومیٹر

محبت کی تلاش میں ایک ملک سے دوسرے ملک کی
طرف ہجرت کرنے والے ایک عاشق کی داستان

بہاولپور کے صحراؤں سے جرمنی اور
امریکہ تک پہنچنے کی گیارہ سالہ جدوجہد

رضوان علی گھمن

Whatsapp: 0049 152 1122 9099

Facebook: Rizwan Ali Ghuman

پیش لفظ

آپ میں سے بہت سے قارئین نے یورپ اور امریکہ کے کئی اردو سفرنامے پڑھے ہوں گے۔ نیا ملک، نئے لوگ اور نئے رائٹر ایک شہر سے دوسرے شہر کی تفصیلات اپنے اپنے انداز میں لکھتے رہتے ہیں۔ ''27140 کلومیٹر'' ناول ان سبھی سفرناموں سے ہٹ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں خاص طور پر مہاجرین کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ پاکستانی مہاجرین جو یورپ اور امریکہ میں دھکے کھا رہے ہیں۔ شاید کچھ لوگ آج بھی ان مہاجرین سے نفرت کرتے ہوں گے۔ جن کے مطابق ان مہاجرین نے پاکستان کا نام خراب کیا ہے، پاکستانی پاسپورٹ کی ویلیو خراب کرنے والے بھی یہی مہاجرین ہیں۔ کیونکہ جو بھی ایک دو مہینے کا ویزہ لے کر یورپ آتا ہے وہ پھر واپس نہیں جاتا۔

یہ صرف تصویر کا ایک رخ ہے جبکہ دوسرا رخ کبھی کسی نے دکھانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان کا نام اور پاکستانی ثقافت کو پوری دنیا میں متعارف کروانے والے بھی یہی مہاجرین ہیں۔ آج یورپ اور امریکہ کے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور گلی محلے تک میں آپ کو پاکستانی ملیں گے۔ یورپ کی اپنی مقامی زبان کے بعد اردو ہی یہاں کی سب سے بڑی غیر ملکی زبان ہے، کیونکہ افغانی اور بنگالی بھی پاکستانی اور انڈین کمیونٹی کے ساتھ رابطے کے لئے اردو زبان سیکھتے ہیں۔ پاکستانی معیشت میں ہر مہینے اربوں روپیہ یہی پاکستانی مہاجرین بھیج کر اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ 27140 کلومیٹر سفرنامہ ایسے ہی مہاجرین کی داستان بیان کرتا ہے جو پاکستان سے دور ہیں لیکن پاکستان کی محبت ان کے دلوں میں رچی بسی ہے اور ہمیشہ بسی رہے گی۔

''27140 کلومیٹر'' ناول بہاولپور کے ایک نوجوان مہاجر راضی کی داستانِ محبت ہے جو اپنے محبوب کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے امریکہ کی تلاش میں نکلتا ہے۔ یہ راضی کی لگن، محبت، خلوص اور مستقل مزاجی کی ہی نتیجہ ہے جو اسے مسلسل مشکلات اور تنگدستیوں کے باوجود اپنے ارادے سے دستبردار نہیں ہونے دیتا اور وہ اس محبت کے لئے گیارہ سال میں ستائیس ہزار کلومیٹر کا سفر کر کے بالآخر امریکہ پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے سفر کی داستان ہے جس میں راضی کو منزل تو مل جاتی ہے لیکن محبت اسے ایک اور دوراہے پر کھڑا کر دیتی ہے۔

رضوان علی گھمن

محبت کرنا ہر جاندار کو آتا ہے۔۔۔خدا نے اس دنیا میں جتنے بھی جاندار بنائے ہیں انہیں محبت کرنے کا انداز بھی سکھایا ہے۔محبت ہر کوئی ہی کرتا ہے لیکن محبت کی اس آگ میں جلنا کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں انسان ہی محبت کا طلبگار رہے اور انسان ہی اس محبت کا سب سے بڑا دشمن بھی ہے۔عشق کی جب انتہا ہوتی ہے تو سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے۔

مجھے ایمان سے محبت تھی، میں ایمان سے عشق کرتا تھا اور یہی عشق مجھے ایران، ترکی اور یونان کی گلیوں میں گھماتا رہا۔میری ایمان امریکہ سے محبت کرتی تھی اور میں اپنی ایمان کا خواب پورا کرنے کے لئے امریکہ کے سفر پر نکل پڑا تھا۔اس راستے پر چلتے چلتے میں مقدونیا پہنچ گیا تھا۔منزل ابھی بھی بہت دور تھی، میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور مجھے پولیس کی گاڑی میں مقدونیا کے ڈی پورٹ کیمپ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔جہاں میری رجسٹریشن ہوتی اور کچھ ضروری کاغذی کاروائی کرنے کے بعد وہ مجھے یونان ڈی پورٹ کر دیتے۔

مجھے یہاں تک لانے والی امریکی ڈاکٹر ایسگارڈ بھی پکڑی گئی تھی۔اسے پولیس کی دوسری گاڑی پکڑ کر سکوپیا لے گئی تھی۔انسانی سمگلنگ کے جرم میں اس پر کیس چلتا اور پھر جیل ہو جاتی۔انسانی سمگلنگ کے جرم کی سزا کم از کم آٹھ سال تھی۔ایسگارڈ کو مجھ سے محبت کرتی تھی اور وہ بے چاری اسی محبت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ایسگارڈ مجھے کار کی ڈگی میں چھپا کر مقدونیا سے سربیا لے جا رہی تھی۔میرے پاس کوئی بھی ویزہ یا کاغذات نہیں تھے، میں غیر قانونی بارڈر کراس کر کے یونان آیا تھا اور مجھے یونان میں سیاسی پناہ ملی ہوئی تھی۔اس سیاسی پناہ کی بنا پر میں یونان میں شادی نہیں کر سکتا تھا۔

جرمنی اور ڈنمارک میں قانون اس کے برعکس تھا کیونکہ وہ بڑے اور امیر ترین مما لک ہیں۔وہاں شادی نسبتاً آسان تھی۔ایسگارڈ اسی لئے مجھے جرمنی لے کر جا رہی تھی تا کہ ہم دونوں وہاں جا کر شادی کر لیں۔لیکن بدقسمتی سے ہم مقدونیا میں ہی پکڑے گئے۔ایسگارڈ پر انسانی سمگلنگ کے جرم میں سکوپیا میں مقدمہ چلتا جبکہ مجھے ڈی پورٹ کیمپ لے جایا جا رہا تھا۔میرے پاس چونکہ یونان کا سیاسی پناہ کا کارڈ تھا اس لئے مجھے یونان ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔

میرا یہ سفر بہاولپور کے ایک چھوٹے سے ریگستانی گاؤں سے شروع ہوا تھا۔میری یہ کہانی ایمان کی محبت سے شروع ہوئی تھی۔ایمان 10 سال کی عمر میں بیاہ کر ہمارے گاؤں آئی تھی۔اسے 30 ہزار روپے

میں اسلم گجرات سے خرید کر لایا تھا۔ 50 سالہ بوڑھا اسلم بھی ایمان سے محبت کرتا تھا لیکن ایمان مجھے سے محبت کرتی تھی۔ ہماری اس بچپن کی محبت کی مخالفت پورا گاؤں کر رہا تھا۔ گاؤں والوں کی نفرت نے ایمان کو مجھ سے علیحدہ کر دیا اور وہ کراچی چلی گئی۔ میں ایمان کے خواب کو پورا کرنے کے لئے امریکہ کے لمبے سفر پر نکل پڑا۔ میرا سفر کراچی سے شروع ہوا اور ایران اور ترکی سے ہوتا ہوا یونان پہنچ گیا تھا۔

میرے اس سفر کی داستان پچھلی تین کتابوں دوسرا خدا، مہاجر اور کالا چاند میں لکھی جا چکی ہے۔ یہ اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری کتاب ہے جو مقدونیا سے شروع ہوگی اور آخر تک جائے گی۔ اگر آپ اس کتاب کو پڑھنے سے قبل پہلی تین کتابوں کو پڑھ لیں تو آپ کو اس سفر کا زیادہ مزہ آئے گا۔

مہاجر ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن اس ایک لفظ کے پیچھے کیسی کیسی دردناک کہانیاں ہوتی ہیں ان کا اندازہ آپ کو میری پہلی تینوں کتابیں پڑھنے سے ہی ہوگا۔ میں خود بھی ایک مہاجر ہوں جو پچھلے بارہ سال سے یورپ کے مختلف ملکوں کے دھکے کھا رہا ہوں۔ یہ سارے درد اور تکالیف میں جھیل چکا ہوں اور وہی درد آپ کو سنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری یہ تینوں کتابیں محبت، نفرت، بھوک اور بے بسی سے بھری ہوئی ہیں۔ اگر آپ میری کتابیں پڑھیں گے تو آپ کو ایک مہاجر کی زندگی کا اندازہ ہو جائے گا اور آپ کبھی بھی کسی مہاجر سے نفرت نہیں کریں گے۔ میں اپنی کہانی کو اب آگے بڑھاتا ہوں اور اسے مقدونیا سے ہی شروع کرتا ہوں۔

پولیس کی گاڑی مجھے لے کر مقدونیا کے سرحدی گاؤں بوگوروڈیسا کے بیرونی طرف بنے ہوئے ایک عارضی کیمپ میں لے آئی۔ یہ تقریباً میدانی علاقہ تھا اور چھوٹی چھوٹی اور ہموار پہاڑیاں بھی تھیں۔ گاؤں بوگوروڈیسا کے باہر اندازاً ایک ایکڑ کے قریب ایک خالی پلاٹ تھا۔ جس کو پولیس والوں نے تار لگا کر کیمپ بنا دیا تھا۔ ایک کونے میں تین کنٹینر رکھے ہوئے تھے جہاں ڈیوٹی پر موجود پولیس والے ڈیوٹی دینے کے بعد آرام کرتے تھے۔ کنٹینروں کے ساتھ ہی سات آٹھ پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں اور باقی پورا گراؤنڈ ہم مہاجرین کے لئے تھا۔ کوئی کمرہ کوئی چھت وغیرہ نہیں تھی۔ ہم سارے مہاجرین کھلے آسمان کے نیچے گھاس پر بیٹھے تھے۔ بارش سے بچنے کا کوئی بھی انتظام نہ تھا۔ اس عارضی کیمپ میں ایک دن کے لئے بھی لڑکوں کو نہیں رکھا جاتا تھا۔

بارڈر یہاں سے صرف ایک کلومیٹر دور تھا۔ یہاں کوئی اندراج یا نام پتہ نہیں لکھا جاتا تھا۔ جب بھی لڑکے چالیس پچاس ہو جاتے تو پولیس والے گاڑی میں بٹھا کر بارڈر پر چھوڑ آتے۔ مجھ سے پہلے قریباً دس

مہاجرین پہلے سے پکڑے گئے تھے۔ان میں ایک شامی (Syria) فیملی بھی تھی۔ یہ میاں بیوی اور تین بچوں پر مشتمل فیملی تھی۔ بڑی بیٹی تقریباً 10 سال کی تھی، اس سے چھوٹی تقریباً 7 سال اور بیٹا ابھی تقریباً 5 سال کا تھا۔ باقی ایک افغانی، دو پاکستانی، ایک عراقی اور دو افریقن تھیں۔ یہ دونوں افریقن نوجوان لڑکیاں تھیں جن کا تعلق نائجیریا سے تھا۔شامی فیملی بہت اچھی تھی، یہ حلب سے آئے تھے۔حلب ترکی سے صرف 50 کلومیٹر دور شامی شہر ہے۔تقریباً سبھی لوگ حلب شہر کو جانتے ہیں اس لئے میرے خیال سے یہ مقدس شہر کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

ہم یہاں قریباً دو گھنٹے مزید رکے رہے لیکن کوئی بھی اور ڈنکی نہیں پکڑی گئی۔لڑکے زیادہ تر رات کو ہی بارڈر کراس کرتے تھے اور رات کو پکڑی جانے والی ڈنکیاں صبح صبح ڈی پورٹ کردی جاتی تھیں۔ دن کو صرف ہم گیارہ لوگ ہی پکڑے گئے تھے۔شام کو چھ بجے کے قریب ہم سب کو پولیس کی دو الگ الگ گاڑیوں میں ڈالا گیا۔شامی فیملی کو ایک گاڑی میں جبکہ باقیوں کو دوسری گاڑی میں ڈال کر وہ ہمیں باہر لے آئے۔شامی فیملی کو پولیس والے کاموہ کی طرف لے گئے۔وہ انہیں سربیا بارڈر کے پاس اتار کر آجاتے جہاں سے وہ سربیا کا بارڈر کراس کرنے کی کوشش کرتے۔

ان دنوں پورا یورپ ہی شامی مہاجرین کی مدد کرتا تھا۔ پولیس والے انہیں خود بارڈر تک چھوڑ کر آتے تھے۔ یہ اجڑے ہوئے لوگ تھے جو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب کسی اچھے ملک میں پناہ کی تلاش میں دربدر دھکے کھا رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے چھ چھ مہینے کے بچوں کو ان کی ماؤں کی گود میں سفر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ پولیس والے ان فیملیوں پر رحم کرتے تھے اور انہیں پکڑ کر خود بارڈر تک چھوڑ آتے تھے۔جبکہ ہم نوجوان لڑکوں کو واپس ڈی پورٹ کر دیا جاتا تھا۔

پولیس کی دوسری گاڑی ہمیں لے کر بارڈر پر آ گئی۔انہوں نے ہمیں گاڑی سے نیچے اتارا اور یونان کی طرف چلے جانے کا کہا۔ یہاں کوئی باقاعدہ بارڈر لائین نہیں تھی۔ پولیس والوں نے ہمیں جنوب کی طرف آگے بڑھنے کا کہا۔کوئی دو سو میٹر آگے بڑھنے پر ہمیں ایک چھوٹی سی سڑک مل گئی۔ہم اس سڑک پر چلتے چلتے یونانی گاؤں چولیادس (Tsoliades) پہنچ گئے۔ یہاں سے ہمیں بس مل گئی جو ہمیں لے کر پولی کاسترو (Polikastro) آ گئی۔

پولی کاسترو ایک چھوٹا سا یونانی قصبہ ہے۔سبھی ایجنٹ یا ڈنکر اسی ٹاؤن کے اردگرد ہی رہتے ہیں۔ یہاں

سے روزانہ ہنگری کے لئے گیمیں نکلتی ہیں۔ میں پولی کاسترو کے بس اڈے پر اترا اور سب سے پہلے سبرینہ کو فون کرنے لگا۔

''راضی! کیا بنا؟ کدھر ہو؟'' کال کرنے پر سبرینہ نے فون اٹھایا تھا اور وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔

''جی! مجھے واپس یونان ڈی پورٹ کر دیا گیا ہے، میں پولی کاسترو میں ہوں۔ ادھر یونان میں پولیس زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرتی ہے۔ ایسگارڈ کو تو وہ پکڑ کر سکوپیا لے گئے ہیں۔۔۔ تم کدھر ہو؟'' میں نے انہیں ایسگارڈ کا بتاتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ہمیں پتہ ہے، وہ سکوپیا میں ہے۔ ہم بھی ادھر سکوپیا میں ہی ہیں۔ میں اس سے مل کر آئی ہوں، وہ ٹھیک ہے۔ ادھر امریکن ایمبیسی میں بھی خبر کر دی تھی اور ان کا ایک افسر بھی ایسگارڈ کے پاس گیا تھا۔ ابھی بھی ہم دونوں امریکن سفیر کے پاس ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔۔۔ یہ تسلی دے رہے ہیں، ایک دو دن کے اندر ایسگارڈ رہا ہو جائے گی۔'' سبرینہ مجھے تسلی دے رہی تھی۔

''یار راضی! اسے تمہاری بڑی فکر ہو رہی تھی۔ اب میں پھر اس کے پاس جاؤں گی اور تمہاری خیریت کی اطلاع دے دوں گی۔ تم تو ابھی واپس تھیوا چلے جاؤ گے نا؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔

''نہیں سبرینہ! میرا ارادہ آگے جانے کا ہے۔ کام تو ادھر یونان میں نہیں ہو گا۔ میں جتنا عرصہ مرضی ادھر گزاروں، پھر بھی آگے جرمنی ہی جانا پڑے گا۔۔۔ تو پھر ابھی کیوں نہیں؟ آپ کو یا ایسگارڈ کو تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، آپ کبھی بھی جرمنی آ سکتے ہو۔'' میں نے آہستہ آواز میں بولتے ہوئے کہا۔

''راضی یار! سفر بہت خطرناک ہے۔ تم رک جاؤ! ہم ایک بار پھر کوشش کریں گے۔'' اس نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

''نہیں سبرینہ! اس بار میں تم میں سے کسی کو بھی اس میں ملوّث نہیں کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ اتنی جلدی مرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے اکیلا جانے دو، اب کی بار جرمنی میں ہی ملاقات ہو گی۔'' ایسگارڈ ایک بار میری وجہ سے مصیبت میں پھنس گئی تھی اور اب میں ان میں سے کسی کو بھی کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

''راضی پلیز! مت جاؤ، اگر خدانخواستہ تم کو کچھ ہو گیا تو ہم اپنے آپ کو کبھی بھی معاف نہیں کر سکیں گے۔'' وہ ابھی تک مجھے روک رہی تھی۔

''نہیں سبرینہ! کچھ بھی ہو جائے لیکن میں نے صرف آگے ہی بڑھنا ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے! جیسے تمہاری مرضی۔۔۔ایجنٹ کتنے پیسے لے گا؟ تم بات کرلو، میں ابھی ادھر سے چلوں تو ڈیڑھ گھنٹے تک تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ میں آ کر تمہیں پیسے دے دیتی ہوں۔'' سبرینہ نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! میں ابھی ایتھنز میں شفاقت بھائی کو فون کرتا ہوں، وہ کسی پاکستانی دوکان پر گارنٹی کے لئے پیسہ رکھ دیں گے۔ اگر میں جرمنی پہنچ گیا تو ایجنٹ اس پاکستانی دوکاندار سے پیسہ اٹھا لے گا۔''

یونان سے جرمنی، اٹلی یا فرانس کی سبھی گیمیں ایسے ہی ہوتی تھیں۔ ہم لوگ کسی بڑی پاکستانی دوکان پر گارنٹی کے طور پر پیسے رکھ دیتے اور دوکاندار مطلوبہ رقم کی ایک رسید بنا کر دے دیتا تھا۔ اگر ہم مطلوبہ ملک پہنچ جاتے تو ایجنٹ اس دوکاندار سے رقم لے لیتا تھا۔ دوکاندار پچاس یا سو یورو کاٹ کر بقایا رقم اس ایجنٹ کو دے دیتا ہے۔ اور اگر ہم پکڑے جاتے ہیں اور واپس ڈی پورٹ ہو جاتے ہیں تو اپنی پوری رقم وہاں سے واپس اٹھا لیتے ہیں۔ دوکاندار صرف گارنٹیوں سے ہی لاکھوں کما لیتا ہے اور کبھی بھی کسی کو دھوکہ نہیں دیتا۔ اس کی ایمانداری سے ہی اس کا کاروبار چلتا ہے۔

میں پولی کاسترو کے ایک پارک میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں اس پارک میں تقریباً ساٹھ ستر کے قریب لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سبھی آگے جانے والے تھے۔ یونانی پولیس یہاں پر کسی کو کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔ میرے پاس دو ایجنٹ آ چکے تھے لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔ میں نے شفاقت کو ایتھنز میں فون کر کے کسی ایجنٹ کا پتہ کرنے کو کہا جو مجھے آگے جرمنی لے جائے۔ شفاقت نے مجھے انتظار کرنے کو کہا۔ میں نے فون بند کیا اور ادھر ہی ایک بنچ پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد شفاقت کا فون آ گیا۔

''جی پا جی! کام ہو گیا ہے۔''

''آپ نے گارنٹی رکھوا دی ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں یار! میں رکھوانے لگا تھا لیکن مجھے وقاص کا فون آ گیا تھا۔ وہ بھی فرانس جانا چاہتا ہے، اگر تم ایک دن انتظار کرلو تو وہ بھی تمہارے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ وہ آج رات تھیوا کی ٹرین پر بیٹھے گا تو صبح صبح تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ میں تم دونوں کی گارنٹی ادھر دوکاندار کے پاس رکھوا دوں گا۔''

وقاص فرانس جانا چاہتا تھا۔شفاقت نے تھیوے فون کیا تھا تو اس نے بھی جانے کا بول دیا۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا، مجھے ہنگری تک کا ساتھ مل گیا تھا۔ہنگری سے پھر وہ آسٹریا اور اٹلی سے ہوتا ہوا فرانس چلا جاتا جبکہ میں ہنگری سے آسٹریا اور پھر جرمنی چلا جاتا۔ وقاص اور میں پچھلے سات سال سے اکٹھے چلے آ رہے تھے۔ میری اس کے ساتھ بہت دوستی تھی۔ یہ وہی لڑکا ہے جو 14 سال جی عمر میں یونان آیا تھا اور ساری پاکستانی کمیونٹی بلو چک کے اس چھوٹے سے بچے کو دیکھنے آتی تھی۔ اب تو یہ 21 سال کا ایک خوبصورت نوجوان بن گیا ہے اوراس نے اپنا چھوٹا بھائی صدام بھی یونان بلوالیا ہے۔تھیوے میں یہ دونوں بھائی اکٹھے میرے ساتھ ہی رہتے ہیں۔

''ٹھیک ہے پاجی! میں ادھر پولی کاسترو میں ہی انتظار کرتا ہوں۔ وہ کل آجائے تو پھر کل رات کی ڈنکی سے ہی بارڈر کراس کریں گے۔'' میں نے شفاقت سے کہا اور فون بند کر دیا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد ہی وقاص کا فون آ گیا۔شفاقت نے اسے فون کر کے بتا دیا تھا۔اس نے مجھے کل صبح صبح پہنچنے کا کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے اسے احتیاط سے آنے کا کہا اور فون بند کر کے بنچ سے ٹیک لگا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے آج رات ادھر ہی پارک میں سونا تھا، اگلے دن وقاص آجاتا تو اکٹھے ہی آگے ڈنکی لگاتے۔ میں ایک بار پھر مہاجر بننے جا رہا تھا۔مہاجر تو میں پہلے بھی ادھر یونان میں تھا لیکن سات سال تک ادھر رہتے رہتے میں اس ماحول میں رچ گیا تھا۔ یونان اب بالکل گھر جیسا لگنے لگا تھا لیکن یونان میری منزل نہیں تھی۔ میری منزل امریکہ تھی اور میں امریکہ کے لئے ہی اپنے گھر سے نکلا تھا۔ میں خوابوں کی سر زمین کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ میں ایمان کی محبت حاصل کرنے کے لئے امریکہ جانا چاہتا تھا۔ وہی پرانی محبت جو وہ کرنا ہی بھول گئی تھی اوراسی محبت کے لئے میں ایک بار پھر مہاجر بن رہا تھا۔

رات کو ایک بار پھر سبرینہ کا فون آ گیا۔ وہ ایسگارڈ کے پاس گئی تھی اور اسے میرے بارے میں بتایا تھا۔ وہ میری خیریت کا سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ بس ناراض تھی کیونکہ میں زبردستی آگے جا رہا تھا۔امریکن گورنمنٹ اس پورے معاملے میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ ان کی شہری جیل میں تھی اور گورنمنٹ اسے بچانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ امریکہ اسی وجہ سے دنیا کا عظیم ترین ملک ہے۔ یہ اپنے شہریوں کی دنیا کے ہر کونے میں حفاظت کرتا ہے۔ امریکی اگر اپنے ملک میں غلط اشارہ بھی کراس کر لیں تو انہیں جیل ہو جاتی ہے لیکن یہی امریکی اگر بیرون ملک کسی بڑے سے بڑے جرم میں بھی پکڑے جائیں تو بھی امریکی گورنمنٹ انہیں بچانے

کے لئے سب کچھ کرتی ہے۔ سفارتی اور معاشی ہر طرف سے دباؤں ڈالتی ہے تا کہ اپنے شہری کو چھڑ وا سکیں۔ یہاں بھی یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

مقدونیا چھوٹا سا ملک تھا اور امریکہ جیسے بڑے ملک کے سامنے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ یہ جنگ ابھی تک صرف سفارتی سطح پر چل رہی تھی۔ مقدونیا زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کرنے کے چکر میں کیس کو طول دینا چاہتا تھا۔ چونکہ امریکی سفیر ان سب چالاکیوں کو جانتے تھے اس لئے وہ پرانے مفادات کے بدلے میں اسے لے جانا چاہتے تھے۔ دوسرے دن صبح عدالت میں کیس جاتا تو وہاں سے اس کی ضمانت ہو جاتی۔ ابھی تک وہ تھانے میں ہی تھی۔

میں نے رات اسی بنچ کے اوپر گزار دی۔ رات کو سردی بڑھ گئی تھی لیکن پھر بھی قابلِ برداشت تھی۔ پورے یورپ میں ایسا ہی موسم ہوتا ہے۔ یہاں جتنی مرضی گرمی ہو لیکن رات کو ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ جون جولائی کی گرمی میں بھی رات کو چادر لے کر سونا پڑتا ہے اور سارا سال پانی گرم کر کے ہی نہانا پڑتا ہے۔

وقاص دوسرے دن صبح صبح آٹھ بجے آ گیا۔ شفاقت نے امونیا کی ایک دوکان پر جا کر گارنٹی کے پیسے دے دیئے تھے۔ دوکاندار اس کے گاؤں ساہووالا کا ہی تھا اس لئے ہمیں پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ چار ہزار یورو کی رقم تھی۔ 4000 یورو اس وقت پاکستانی تقریباً پانچ لاکھ روپے بنتے تھے۔ دو دو ہزار یورو میرے اور وقاص کے جرمنی اور اٹلی کے لئے تھے۔ ایجنٹ آگے فرانس تک نہیں لے کر جاتے تھے۔ اٹلی سے آگے فرانس تک وقاص نے خود ہی جانا تھا۔ فرانس کو جرمنی کا بارڈر بھی لگتا تھا۔ میں نے وقاص کو بولا بھی تھا کہ وہ میرے ساتھ ہی جرمنی تک چلا جائے۔ خلیل بھائی جرمنی ہی ہوتے تھے۔ وہ وقاص کو جرمنی سے پیرس کی ٹکٹ لے کر دے دیتے اور وہ ادھر سے پیرس چلا جاتا۔ یہ شینگن زون تھا۔ ایک دن میں کوئی پانچ سو سے اوپر لوکل ٹرینیں جرمنی سے فرانس آتی جاتی تھیں۔

جرمن شہر کیل (Kehl) سے فرانسیسی شہر سٹراسبرگ (Stras bourg) کے لئے تو ہر دس منٹ بعد ٹرین نکلتی تھی اور ہر ٹرین ہی بھری ہوئی ہوتی تھی۔ جرمنی سے فرانس جانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ آسٹریا سے آگے پورا یورپ ایسے ہی ہے کیونکہ یہاں بارڈر کے اوپر کوئی تار کوئی پولیس نہیں ہوتی۔ یہاں اٹلی سے ایک ٹرین نکلتی تھی جو سوئزرلینڈ اور فرانس سے ہوتی ہوئی جرمنی پہنچتی تھی اور پھر جرمنی سے لکسمبرگ اور بیلجئم سے ہوتی ہوئی نیدرلینڈ چلی جاتی تھی۔ یہ ٹرین چھ ملکوں کا بارڈر کراس کر کے نیدرلینڈ پہنچتی تھی اور راستے میں ایک

بھی پولیس والا یا امیگریشن کا افسر آپ کو چیک نہیں کرتا تھا۔ یہاں کوئی آپ کو آپ کے مذہب یا فرقے کی کی بنیاد پر مارتا نہیں ہے۔ یہاں ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لئے کسی ویزہ یا پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی چیز یورپ کو حسین بناتی ہے۔

میں نے وقاص کو جرمنی سے فرانس جان کا کہا لیکن اس نے منع کر دیا۔ اس کا ایک کزن سان مرینو (San Marino) میں رہتا تھا۔ وہ پہلے اٹلی کے شہر سان مرینو جاتا اور پھر وہاں سے پیرس چلا جاتا۔ میں اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ 12 بجے کے قریب ایجنٹ بھی آ گیا تھا۔ اس نے ہمیں 4 بجے تک تیار رہنے کا کہا۔ وہ چار بجے ہمیں ایک گاڑی کے ذریعے پولی کاسترو سے مقدونیا کے بارڈر تک لے جاتا۔ وہاں سے آگے پھر پیدل ہی بارڈر کراس کرنا تھا۔ ایجنٹ کے جانے کے فوراً بعد ہی ایسگا رڈ کا فون آ گیا۔ اسے ضمانت پر رہائی مل گئی تھی لیکن اس کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات پولیس والوں نے رکھ لئے تھے۔ وہ سکوپیا شہر چھوڑ کر باہر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ قریباً دس منٹ تک مجھ سے بات کرتی رہی اور دس منٹ میں پانچ منٹ تو صرف روتی ہی رہی تھی جبکہ باقی پانچ منٹ اپنی محبت کا یقین دلاتی رہی۔

مجھے اس کی محبت کا یقین تھا لیکن میں اس کی محبت قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں صرف ایمان سے محبت کرتا تھا اور میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی صرف ایمان ہی تھی۔ ایمان کے علاوہ میں کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتا تھا لیکن اس پاگل لڑکی کو تو چپ کروانا تھا۔ وہ میری وجہ سے ہی آج اس مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی۔ جانے انجانے میں وہ لڑکی مجھ سے محبت کر بیٹھی تھی۔ میں اس کو محبت کے بدلے محبت تو نہیں دے سکتا تھا لیکن پھر بھی دوستی کر کے اس کے درد کو کچھ تو کم کر سکتا تھا۔ وہ مجھے بغیر کسی معاوضے کے امریکہ لے کر جا رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹری کی نوکری چھوڑ دی تھی اور صرف میرے لئے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا رہی تھی۔ میں نے اس کو حوصلہ دیا اور کچھ دیر تک ہلکی پھلکی بات کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

میرا کھانے کا کوئی موڈ نہیں تھا لیکن وقاص دو سپلا کیاں لے آیا۔ جرمنی میں اسے افکا اور پاکستان میں شوارما کہتے ہیں۔ وہ ساتھ میں ایک بڑی کوکا کولا کی بوتل بھی لے آیا۔ یونان میں پانی اور کوکا کولا کا تقریباً برابر ہی ریٹ ہے، صرف کچھ پیسوں کا فرق ہے۔ یہاں کوکا کولا اور بیئر بہت سستی ہے اس لئے عام استعمال ہوتی ہے۔ ہم دونوں نے ایک ایک شوارما کھایا اور باری باری کوکا کولا پینے لگے۔ ہمارے پاس کوئی گلاس نہیں تھا اس لئے دونوں باری باری ایک ہی بوتل کو منہ لگا کر پی رہے تھے۔

4 بجے ایجنٹ نے ہمیں ایک گاڑی میں بٹھایا اور بارڈر پر لے آیا۔ یہ وہی دریائے وردر کا دلدلی کنارہ تھا جہاں سے پرسوں ہم نے بارڈر کراس کیا تھا۔ آج بھی ہم ادھر ہی آئے تھے لیکن اب دن کا ٹائم تھا۔ ایجنٹ نے ہمیں وہیں درختوں کے جھنڈ میں لیٹنے کا کہا۔ ہم نے رات کو بارہ بجے کے بعد یہاں سے نکلنا تھا۔ یہاں پر آج بھی ہم قریباً 100 لڑکے تھے اور تقریباً ہر ملک کے ہی لوگ موجود تھے۔ شام اور عراق کی فیملیاں تھیں، افریقی بھی بڑی تعداد میں تھے اور پاکستان اور افغانستان کے نوجوان لڑکے بھی اس ڈنکی میں شامل تھے۔ لیبیا کی تقریباً ساری ہی گیمیں سپیڈ بوٹ کی ڈائریکٹ اٹلی کے لئے نکلتی تھیں۔ انہیں اٹلی بالکل سیدھا لگتا تھا جبکہ سمندر کا راستہ خطرناک ضرور تھا لیکن آسان تھا۔ زمینی راستہ ترکی کی طرف سے بہت لمبا اور خطرناک تھا اس لئے کوئی بھی لیبیا کا باشندہ اس راستے کو استعمال نہیں کرتا تھا۔ یہاں ہمارے ساتھ شام اور عراق کی بہت سی فیملیاں بھی تھیں جو اپنے گھروں کو چھوڑ کر ایک اچھے مستقبل کے لئے جرمنی جا رہے تھے۔

شام ویسے عربی زبان بولنے والا ایشائی مسلم اکثریتی ملک ہے لیکن یہاں کے لوگ شکل وصورت سے یورپین لگتے ہیں۔ آپ ان کو دیکھ کر اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ یہ ایشین عربی ہیں یا کسی یورپی ملک سے ہیں۔ یہی حال افریقی ملک تیونس کا ہے۔ یہاں کی 100 فیصد آبادی گوروں کی ہے جو عربی بولتے ہیں۔ جب سپین کی آٹھ سو سالہ مسلمان حکومت ختم ہوئی تھی اور سارے مسلمان سپین سے ہجرت کر کے مرزش اور دوسرے افریقی ممالک میں چلے گئے تھے تب تیونس بھی انہی ممالک میں شامل تھا۔ یہ لوگ یورپین مسلمانوں کی نسل میں سے ہیں۔ شام پیغمبروں کی سرزمین ہے اور اس کی مٹی میں بھی حسن ہے۔ شامی عورتیں برقع نہیں لیتی ہیں بلکہ صرف حجاب اوڑھتی ہیں جس سے ان کے سر کے بال اور سینہ ڈھک جاتا ہے جبکہ چہرہ کھلا ہی رہتا ہے۔ ہم سب لڑکے ایک طرف بیٹھے ہوتے تھے جبکہ فیملیاں دوسری طرف ذرا ہٹ کر بیٹھی ہوتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت شامی بچے دریا کے کنارے پر کھیل رہے تھے۔ میں اور وقاص دونوں ان بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''راضی بھائی! کتنے پیارے بچے ہیں۔۔۔ بالکل انگریز لگ رہے ہیں۔'' وقاص ان کو کھیلتا ہوا دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

''ہاں یار! واقعی بالکل انگریز ہی لگ رہے ہیں۔۔۔ کتنے معصوم کتنے پیارے ہیں۔ بے چارے گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں، دوست احباب اور گھر بار سب کچھ چھوٹ گیا ہے۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے ان کا

پورا ملک اجاڑ کر رکھ دیا ہے لیکن پھر بھی ان کی معصومیت ختم نہیں ہوئی۔ یہ کیسی عرب بہار تھی جس نے پورے عرب کو ہی جلا کر رکھ دیا ہے؟'' وقاص ایک بار مجھ سے پوچھنے لگا۔

''واقعی! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

اس عرب بہار میں صرف سعودی عرب اور اس کے ساتھ تین چار امیر ترین ریاستیں ہی بچی تھیں۔ جبکہ باقی پورا عرب ہی جل گیا تھا اور اب بھی جل رہا تھا۔ یہ آگ یمن سے لے کر افریقہ کے آخری عرب ملک مراکش تک پھیلی ہوئی تھی اور لاکھوں لوگ اس آگ کا نوالہ بن گئے تھے۔ عرب اب بھی جل رہا تھا اور ہر روز ہزاروں لوگ اس جنگ کا ایندھن بن رہے تھے۔ داعش نے اس پورے عرب خطے کو کھنڈرات میں بدل کر رکھ دیا تھا۔

ایک شامی بچہ کھیلتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ اس کی عمر چار سال کے قریب تھی۔ نیلی آنکھیں اور سنہرے بال اس کے سفید چہرے پر بہت جچ رہے تھے۔ مجھے پرسوں راستے میں کھانے کے لئے ایسگارڈ نے چاکلیٹ کے کچھ پیکٹ دیئے تھے اور وہ پیکٹ ابھی تک میری جیب میں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک پیکٹ نکال کر بچے کی طرف بڑھایا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ بچے کا باپ بھی اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

''السلام وعلیکم! ہم بھی مسلمان ہیں۔ پاکستان سے۔۔۔'' میں نے اس کے باپ سے ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کروانے لگا۔

اس نے بچے کو پکڑا اور ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ میں نے ایک بار پھر چاکلیٹ بچے کی طرف بڑھائی لیکن بچہ اپنے باپ کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ وہ اس کی اجازت لینا چاہتا تھا۔ باپ نے صرف اجازت ہی نہیں دی بلکہ اسے میرے پاس بٹھا دیا۔ میں نے اسے چاکلیٹ پکڑائی تو وہ خوشی خوشی کھانے لگا۔

''آپ کدھر سے آئے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ اس کو انگلش اچھی آتی تھی کیونکہ وہ شامی کرد تھا۔ کرد شام، عراق، ایران اور ترکی کے سرحدی علاقوں میں رہتے تھے۔ احمد بھی کرد تھا اور وہ ایران سے تھا جبکہ یہ شامی کرد تھے۔

بچہ اب مجھے چھوڑ کر وقاص کے پاس چلا گیا جبکہ میں اس کے باپ سے گپ شپ لگانے لگا۔ یہ تین لوگ ہی تھے۔ میاں، بیوی اور ان کا چار سالہ بیٹا۔۔۔ بس یہی لوگ تھے۔ ماں باپ دونوں داعش کے

ہاتھوں مارے گئے تھے جبکہ یہ لوگ جان بچا کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔اس آدمی کا نام سعد تھا، وہ کمپیوٹر انجینئر تھا اور اسی وجہ سے اسے انگلش بھی آتی تھی۔جلد ہی ہم ایک دوسرے سے فری ہو گئے اور گپ شپ لگانے لگے۔وہ جنگ کا ستایا ہوا تھا۔اس نے اس جنگ میں اپنے ماں باپ اور دوسرے رشتے داروں کو کھو دیا تھا۔اسے بشارالاسد کی پالیسیوں سے سخت نفرت تھی۔

''راضی! مجھے داعش سے کوئی لینا دینا نہیں ہے، وہ دہشت گرد ہیں اور ان کا کام ہی دہشت پھیلانا اور لوگوں کو مارنا ہے۔ یہ اگر اسلام کے نام پر لوگوں کو مارتے ہیں، اسلام اور جہاد کو بدنام کرتے ہیں تو سبھی اسلامی ملکوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مل کر اس فتنے کا مقابلہ کریں۔اسلام کو داعش کی دہشت گردی سے بچانا سبھی مسلمان ملکوں کی ذمہ داری ہے۔اس نے دور خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن ہمارے ملکوں کی اپنی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ویسے بھی آپ کی مدد امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک کر رہے ہیں۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بھائی! بات ان کی نہیں ہے، امریکہ تو مدد کر رہا ہے اور وہ ہمیشہ ہر ملک کی مدد کرتا ہے۔میں آپ کے ملک کی بات کر رہا ہوں۔ پاکستان دنیا کا سب سے طاقتور ترین اسلامی ایٹمی ملک ہے۔آپ نے ہمارے لئے کیا کیا ہے؟10لاکھ سے زیادہ آپ کی آرمی ہے اور ہماری حفاظت کے لئے 10ہزار فوجی بھی نہیں دے سکتے؟ دہشت گردی کا کوئی مذہب کوئی فرقہ نہیں ہوتا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تو آپ جانتے ہونا؟ ہمارے پہلے خلیفہ۔۔؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں بے اختیار بول اٹھا۔

''حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سارا اسلام ہی جانتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا مسلمان نہیں ہو گا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی عظمت اور بزرگی کو نہ مانتا ہو۔

''راضی صاحب! ان کے دورِ خلافت کو ذرا غور سے پڑھنا، انہوں نے جو جنگیں جھوٹے نبیوں اور منکرینِ زکوٰۃ کے خلاف لڑی ہیں ان کی گہرائی میں جاؤ گے تو سب سمجھ آجائے گی۔ مدینہ کے اندر اسلام کی نوزائیدہ ریاست کو ہر طرف سے خطرہ تھا لیکن انہوں نے پھر بھی اسلام کو نقصان پہنچانے والے ان عناصر کے خلاف جنگ لڑی۔مرزا غلام احمد قادیانی انیسویں صدی میں آیا تھا اور کتنے مسلمان گمراہ ہو کر اسلام سے قادیانیت کی طرف چلے گئے۔سوچو! اگر مسیلمہ کذاب کو اس وقت چھوڑ دیا جاتا، حضرت ابوبکر صدیقؓ اس کو چھوڑ کر مدینہ کو بچانے کی فکر میں لگ جاتے اور اسے تھوڑی مہلت مل جاتی تو کتنے لوگ گمراہ ہو جاتے؟ ہم

آج بھی مسیلمہ کے ماننے والوں سے مناظرے کر رہے ہوتے ہیں، جیسے قادیانیوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ راضی بھائی! اسلام یہ نہیں ہے کہ آپ ڈنڈا لے کر یورپ جائیں اور ان کافروں کو مارنا شروع کر دیں۔ جو لوگ اس ڈنڈے کو پکڑتے ہیں ان کے خلاف لڑنا جہاد ہے۔ داعش اسلام کے نام پر پورے اسلام کو مار رہی ہے اور اسلام کے عقائد کو بدل رہی ہے۔ ہماری نوجوان نسل گمراہ ہو کر ان سے مل رہی ہے۔ ان کے خلاف لڑنا جہاد ہے۔ امریکہ کے غیر مسلم فوجی وہ سب کچھ نہیں کر سکتے جو آپ کے مسلمان فوجی کر سکتے ہیں۔ اپنے اپنے مدینے کو بچانے کی کوشش کرو گے تو ایک دن سب ختم ہو جاؤ گے۔'' اس نے اپنے بچے کا ہاتھ پکڑا اور دوسری طرف اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔

ابھی صرف چھ ہی بجے تھے۔ نیلی آنکھوں والا چھوٹا شہزادہ ایک بار پھر ہمارے پاس آ گیا اور وقاص کے ساتھ کھیلنے لگا۔ وقاص کی اس کے ساتھ کافی دوستی ہو گئی تھی۔ وقاص نے 14 سال کی عمر میں اپنے گھر کو چھوڑا تھا اور یونان آ گیا تھا۔ اس کا بچپن ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ یہی بچپنا اسے ننھے شہزدے سے کھلانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کا والد ایک بار پھر میرے پاس آ گیا لیکن اس بار میں نے دوسرے موضوعات چھیڑ دیئے۔ اسلام پر میری گرفت اتنی کمزور نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ یہاں فتوے اور گالیاں دینے والے بہت ہیں۔ آپ سُنیوں اور وہابیوں کے خلاف جتنا گلا پھاڑ پھاڑ کر بولو گے اتنی ہی آپ کی پذیرائی ہو گی لیکن اسلام کی صحیح تشریح کرنے کی کوشش کرو گے اور اس کوشش میں اگر کوئی انجانے میں غلطی کر بیٹھو گے تو یہ لوگ آپ کو جنید جمشید کی طرح کسی ایئرپورٹ پر تھپڑ مار رہے ہوں گے یا گالیاں دے رہے ہوں گے۔ میں بہت کمزور سا لکھاری ہوں اور مجھ میں تھپڑ کھانے اور گالیاں سننے کی ہمت نہیں ہے۔

وہ انگلش فلمیں بہت شوق سے دیکھتا تھا۔ میں اس سے مختلف انگلش فلموں کے بارے میں بات کرنے لگا۔ رات کو بارہ بجے کے قریب تین ڈنکر ہمیں بارڈر کراس کروانے کے لئے آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی ہمیں جلدی جلدی کھڑا ہونے کو کہا اور ساتھ لے کر آگے چلنے لگے۔ یونان سے مقدونیا میں داخل ہونے کیلئے ہمیں چار گھنٹے مسلسل پیدل چلنا پڑا۔ یہ اتنا مشکل سفر نہیں تھا، 100 لوگوں میں 12 فیملیاں تھیں اور اتنی ہی تعداد بچوں کی تھی۔ 5 سال سے کم عمر کے بچے رات کو اندھیرے میں پیدل نہیں چل سکتے تھے۔ انہیں باری باری لڑکے کندھوں پر اٹھا رہے تھے۔ تینو ڈنکر پاکستانی تھے اور تینوں نے ہی ایک ایک بچے کو کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ یہ روزانہ بارڈر کراس کرتے تھے اور پیدل چلنے کے عادی ہو گئے تھے۔ انہیں ایک بچے کو اٹھا کر چلنے میں

کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔

یونان سے جرمنی تک کی ساری گیمیں پاکستانی ہی چلاتے ہیں۔ یہ ایجنٹ یونان سے جرمنی تک کی گیم کے دو ہزار یورو وصول کرتے تھے۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے ایجنٹوں کو سو دو سو دے کر بھی ان کو فی لڑکا ایک ہزار یورو بچ جاتا تھا۔ روزانہ چار پانچ لوگ بارڈر کراس کرتے تھے۔ ایک دن کا دس لاکھ یورو۔۔۔ یہ کسی ایک آدمی کے پاس نہیں جاتا تھا بلکہ اس گیم میں تقریباً سات آٹھ سو کے قریب مختلف ایجنٹ تھے۔ مین ایجنٹ جو ایتھنز یا سلونیکی میں بیٹھے ہوتے تھے وہ بھی پچاس کے قریب تھے۔ ساری گیمیں پولی کاسترو سے شروع ہوتی تھیں۔ سارے لڑکے اپنی ٹکٹ خرید کر سلونیکی اور پھر پولی کاسترو پہنچتے تھے۔ اس سے آگے ایجنٹ کی جواب داری شروع ہو جاتی تھی جو جرمنی کے شہر بلزانو (Bolzano) تک چلتی تھی۔ ایجنٹ ان دونوں شہروں میں لڑکے پہنچا کر پیسے وصول کر لیتے تھے۔

افغانیوں نے بھی اس گیم میں حصہ لینا چاہا لیکن پاکستانیوں سے ہار گئے تھے۔ وہ لڑکوں کو مارتے بھی تھے اور ان سے موبائل اور پیسے بھی چھین لیتے تھے۔ جبکہ پاکستانی ایجنٹ کبھی بھی کسی سے کچھ نہیں چھینتے تھے۔ وہ عورتوں اور بوڑھوں کی عزت بھی کرتے تھے اور ان کی وجہ سے آہستہ بھی چلتے تھے۔ پہلے پاکستانی اور افغانی دونوں ہی یونان سے گیمیں نکالتے تھے اور ان کی آپس میں لڑائی بھی بہت ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ لوگ پاکستانیوں پر اعتماد کرنے لگے اور سبھی گیمیں پاکستانی ہی نکالنے لگے۔ اب اس کاروبار میں ایک بھی افغانی ایجنٹ نہیں رہ گیا تھا۔ جو تھوڑے بہت افغانی ایجنٹ سلونیکی میں رہ گئے تھے ان کو بھی پاکستانیوں نے پولیس میں مخبری کروا کر پکڑوا دیا تھا۔ وہ جیلوں میں آٹھ آٹھ دس دس سال کی سزا کاٹ رہے تھے اور پاکستانی اکیلے ہی اس پورے نیٹ ورک کو سنبھال رہے تھے۔

یہاں دریا کے کنارے دلدلی علاقے میں پولیس کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہم آسانی سے چلتے ہوئے بارڈر کراس کر گئے۔ صبح 4 بجے کے قریب ڈنکروں نے ہمیں جیوجیلیا (Gevgelija) گاؤں کراس کروایا اور جنگل میں پہنچا دیا۔ یہ بہت بڑا جنگل تھا جو یونان سے شروع ہوتا تھا اور تقریباً 100 کلومیٹر چوڑا اور اتنا ہی لمبا ہوگا۔ ہم نے 2 گھنٹے یہاں آرام کیا اور ایک بار پھر سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ صبح کے چھ بج گئے تھے اور سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ ہم سورج کی روشنی میں ہی جنگل کے مزید اندر کی طرف چلنے لگے۔ اس بار سفر 4 گھنٹے سے زیادہ تھا۔ ڈنکر ہر گھنٹے کے بعد پانچ منٹ کے لئے بٹھا دیتے تھے اور سانس لے کر ایک بار

پھر چلنا شروع کر دیتے تھے۔ 12 بجے تک قریباً سبھی تھکنا شروع ہو گئے تو انہوں نے ہمیں ایک چھوٹے سے نالے کے قریب بٹھا دیا۔

''آپ سب لوگ آرام سے پانی پی کر لیٹ جاؤ، مزید تین گھنٹے کا سفر ہے۔ ہم لوگ آرام سے دو گھنٹے لیٹ کر آرام کر لیتے ہیں اور اس کے بعد دوبارہ چلیں گے۔ یہ بہت گھنا جنگل ہے اور پولیس یا فوج کا کوئی ڈر نہیں ہے۔'' ایک پاکستانی ڈنکر نے اونچی آواز میں کہا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش بول رہا تھا۔ انگلش سے آگے باقی لوگ اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے ساتھیوں کو بتا رہے تھے۔

پاکستانی لڑکے کا نام یاسر تھا، یہ لڑکا بھی بعد میں جرمنی چلا گیا تھا۔ اس نے صرف 6 مہینے ایجنٹی کی تھی اور ان چھ مہینوں میں دو لاکھ یورو کما کر ایک سائیڈ پر ہو گیا تھا۔ مجھے گجرات سے ویسے ہی محبت تھی۔ میں اور وقاص جا کر اس لڑکے کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ ایک خوبصورت سے شامی بچے کو اپنے بیگ سے چاکلیٹ نکال کر دے رہا تھا۔ اس نے اپنا گال بچے کے آگے کیا تو اس نے اس کا گال چوما، چاکلیٹ پکڑی اور اپنی ماں کے پاس بھاگ گیا۔

''میرا نام یاسر ہے اور میں شادیوال سے ہوں۔ آپ کا کیا نام ہے؟'' اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ وہ شکل سے کافی بے وقوف سا لگتا تھا لیکن دل کا بہت صاف تھا اور تھوڑا افلسفی بھی تھا۔

''جی! میرا نام راضی ہے اور یہ میرا دوست وقاص۔۔۔ ہم دونوں سیالکوٹ سے ہیں۔'' میں نے اپنا مختصر تعارف کروایا تو وہ ہم سے ہاتھ ملانے لگا۔

''راضی بھائی! یہ کام میں عبادت سمجھ کر کرتا ہوں۔ عراق اور شام میں جاری اس خونریز جنگ نے لاکھوں لوگوں کی جان لی ہے اور یہ لوگ اپنی جانیں بچا کر آئے ہیں۔ ہمارے نبی پاکؐ نے بھی ہجرت کی تھی، یہ لوگ بھی ہجرت کر رہے ہیں۔ میں بہت گناہ گار ہوں لیکن ان مہاجرین کی دل سے خدمت کرتا ہوں اور ان کو بحفاظت ان کی منزل تک پہنچاتا ہوں۔ یہ پیچھے سب کچھ بیچ کر اپنی ساری جمع پونجی اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں لیکن مجال ہے جو کوئی ان سے ایک یورو بھی چھین لے۔ افغانی ان سے پیسے چھین لیتے تھے لیکن ہم ان افغانیوں سے لڑ پڑتے ہیں۔ خود میں بھی قریباً دس بار ان افغانی لٹیروں سے لڑا ہوں۔ میں نے تین لوگوں کو خنجر مارا ہے۔ ہم لوگ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں لیکن کسی بھی گروپ کو لوٹنے نہیں دیتے۔ آج ترکی سے لے کر جرمنی تک پورا علاقہ ہم پاکستانی ایجنٹوں کا ہے اور کسی کی مجال نہیں ہے جو ان کو لوٹ سکے۔ راضی

صاحب! یہی عبادت ہے۔ ہم معقول معاوضہ لیتے ہیں لیکن ان کو بحفاظت ان کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔''
ایک اور بچہ اس کے پاس آ گیا۔

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر بچے کو پکڑ لیا اور اس سے بوسہ دینے کو کہنے لگا۔ بچے نے ایک دو بار زور لگا کر اس سے چھوٹنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور آخر ہار مان کر اس کو بوسہ دینے لگا۔ اس نے پیار سے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بیگ سے ایک چاکلیٹ کا پیکٹ نکال کر اسے دینے لگا۔

''راضی بھائی! یہ بچے بہت ڈرے اور سہمے رہتے ہیں، اتنی جلدی کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ ان بچوں کا اعتماد جیتنے کے لئے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یونانی اور مقدونوی پولیس ہمیں انسانی سمگلر سمجھتی ہے لیکن ہم اس کام کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔'' دو گھنٹے تک آرام کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر ادھر سے چل پڑے۔ اس بار سفر کچھ آہستگی سے کٹ رہا تھا۔

شام چھ بجے کے قریب ہم جنگل میں موجود کیمپ پر پہنچ گئے۔ یہ اصل میں کیمپ نہیں تھا بلکہ مہاجرین کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ یہاں کم از کم 500 کے قریب مہاجرین موجود تھے۔ ایک طرف لکڑیوں کی مدد سے ایک چھوٹا سا کمرا بنایا ہوا تھا۔ ایجنٹ اور ڈنکر اسی کمرے میں کچھ گھنٹے آرام کرتے تھے اور واپس یونان یا پھر کمانوہ ڈنکی لے کر چلے جاتے تھے۔ ریل کے حادثوں کی وجہ سے ایجنٹ پیدل کی بجائے ٹرک یا ٹینکر کی گیم کرتے تھے۔ گاڑی اگر مین روڈ پر صحیح رفتار سے سفر کرے تو ڈیڑھ گھنٹے میں کمانوہ بارڈر پر پہنچ جاتی ہے۔ یہ بہت چھوٹا سا ملک ہے۔ بڑی لوڈر گاڑیاں 200 سے زیادہ لوگوں کو بٹھا کر دو گھنٹے میں کمانوہ پہنچا دیتی ہیں۔

یہاں چھوٹے چھوٹے جھاڑی نما درخت تھے اور ایجنٹوں نے چھوٹی چھوٹی ترپالیں ان درختوں کے اوپر ڈال کر باندھی ہوئی تھیں۔ یہ بہت بڑا ایریا تھا اور تقریباً 200 کے قریب درختوں کے اوپر ترپالیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک درخت کے نیچے آسانی سے پانچ چھ لوگ لیٹ کر آرام کر سکتے تھے۔ یہاں پر باقاعدہ ایک کینٹین بھی تھی جہاں بسکٹ اور دوسری کھانے پینے کی اشیاء ملتی تھیں۔ دس سینٹ کی چیز یورو میں بک رہی تھی۔ میں نے اور وقاص نے ایک درخت ڈھونڈا اور اس کے نیچے جا کر لیٹ گئے۔

رات کو آٹھ بجے کے قریب ان لوگوں نے ہمیں اکٹھا کیا اور مختلف ایجنٹوں کے نام لے کر ہمیں علیحدہ علیحدہ کرنے لگے۔ کوئی ایک گھنٹہ لگا کر انہوں نے ہمیں گروپوں میں بٹھا دیا۔ یہاں کوئی 30 کے قریب گروپ تھے۔ یہاں ڈنکر اور ایجنٹ بھی دس سے اوپر تھے۔ انہوں نے 200 لوگوں کو علیحدہ کیا اور آگے لے

گئے۔ان دوسو میں ساری عورتیں اور بچے شامل تھے۔

''آرام سے بیٹھو! آدھے گھنٹے تک مزید گیم نکلے گی۔'' انہوں نے ہمیں گروپوں میں ہی بیٹھنے کا کہا اور آدھے ڈنکر دوسرے دوسو لوگوں کو لے کر آگے چلے گئے۔

ہم ایک گھنٹے تک ایسے ہی ادھر بیٹھے انتظار کرتے رہے۔اس کے بعد پھر انہوں نے ہم میں سے مزید ایک سو لوگوں کو علیحدہ کیا اور ان کو لے کر آگے چلے گئے۔ میں اور وقاص ابھی تک یہیں پر ہی تھے۔ہم آدھے گھنٹے تک ادھر بیٹھے رہے۔اس کے بعد انہوں نے ہمیں سو جانے کے لئے کہا۔آج صرف دو ہی گیمیں نکلنی تھیں۔

''آپ لوگ اب سو جاؤ! کل رات کو آپ سبھی آگے نکل جاؤ گے۔'' ایک لڑکے نے انگلش میں کہا اور ہم سب رات گزارنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگے۔

رات کو سردی تو کافی تھی لیکن ہم نے جرسیاں پہنی ہوئی تھیں اس لئے زیادہ محسوس نہیں ہوئی اور آرام سے رات گزر گئی۔ دن کو بارہ بجے تک ہم اٹھ گئے۔ وقاص کے پاس بیگ میں کافی بسکٹ کے پیکٹ پڑے ہوئے تھے۔اس نے دو پیکٹ نکالے اور ہم دونوں پانی کے ساتھ بسکٹ کھانے لگے۔شام کو پانچ بجے کے بعد مزید گیمیں آنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری تعداد پھر 500 سے زیادہ ہوگئی۔رات کو آٹھ بجے انہوں نے پھر ہمیں علیحدہ علیحدہ گروپوں میں تقسیم کیا اور پہلے نکالے گئے 150 لوگوں میں میرا اور وقاص کا بھی نمبر لگ گیا۔تین ڈنکر ہمیں لے کر آگے چلنے لگے۔کوئی ایک گھنٹہ مسلسل چلنے کے بعد ہم جنگل سے باہر آ گئے۔

ڈنکر ہمیں لے کر ایک گیراج میں آ گئے۔ یہ بہت بڑا گیراج تھا،جس میں تقریباً 50 کاریں آسانی سے کھڑی ہو سکتی تھیں۔ڈنکروں نے ہمیں جلدی سے اکٹھا کیا اور پچیس پچیس کے چھ گروپ بنا کر پہلے گروپ کو گیراج سے باہر بھیج دیا۔ میں اور وقاص تیسرے گروپ میں تھے۔ایک ڈنکر ہمیں لے کر باہر آیا۔ہم سب ایک لائین میں باہر نکل کر سڑک کے کنارے کنارے جلدی جلدی چلنے لگے۔قریباً 50 میٹر آگے جانے کے بعد ایک خالی گراؤنڈ تھا،ہم سب اس گراؤنڈ میں داخل ہو گئے۔ڈنکر ہمیں لے کر گراؤنڈ کے دوسرے کنارے پر پہنچا تو ہمیں دریا کے پانی کی آواز آنے لگی۔

یہ وہی دریائے وردار تھا جس کے کنارے چلتے ہوئے ہم نے یونان سے مقدونیا کا بارڈر کراس کیا تھا۔ دریائے وردار کوسوہ اور البانیہ کے بارڈر کے نزدیک مقدونوی گاؤں وروتک (Vrutok) کے پہاڑوں سے

نکلتا ہے اور مقدونیا کے دارالحکومت سکوپیا کے درمیان سے گزرتا ہوا نیچے جنوب کی جانب جاتا ہے۔ یونانی ٹاؤن پولی کاسترو سے یہ یونان میں داخل ہوتا ہے اور پھر سلونیکی کے قریب بحیرہ ایجیئن میں گر جاتا ہے۔ 338 کلومیٹر لمبا یہ دریا مقدونیا کا سب سے بڑا اور مرکزی دریا ہے۔ ہم پھر اسی دریا کے کنارے پر آ گئے تھے۔

گراؤنڈ کے کنارے پر لوہے کا ایک پل بنا ہوا تھا۔ یہ چھوٹا سا لوہے کا پل صرف پیدل چلنے والے لوگوں کے لئے تھا۔ اس پل پر ایک وقت میں صرف دو ہی لوگ چل سکتے تھے۔ ہم سب جلدی جلدی دو قطاروں میں ہو کر پل کراس کرنے لگے۔ پل کی دوسری طرف ایک اندھیرے کونے میں ہمیں پہلے والے دو گروپ بھی نظر آ گئے۔ ڈنکروں نے ہمیں بھی ادھر خاموش کھڑا کر دیا۔ آدھے گھنٹے تک باقی پیچھے والے بھی پہنچ گئے تو انہوں نے ہمیں لے کر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ مزید آدھے گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد ہی ہمیں ایک سڑک کے کنارے ایک بڑا ٹریلر کھڑا نظر آ گیا۔ اس کے اوپر کپڑے کی ترپال پڑی ہوئی تھی۔ ڈنکروں نے ہمیں جلدی سے ٹریلر میں سوار کروا دیا۔ ٹریلر 150 لوگوں کے لئے چھوٹا تھا لیکن انہوں نے ہمیں ٹریلر کے اندر کھڑے ہونے کا کہا۔ سب سے پہلے عورتیں اور ان کے بچے آگے سوار کروائے گئے۔ اس کے بعد ہمیں بھی سوار کروا دیا گیا۔ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کے پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے تھے۔

''یار! صرف دو گھنٹے کا سفر ہے، تھوڑی دیر برداشت کر لو! اس کے بعد آسانی ہے۔'' ایک ڈنکر نے اونچی آواز میں کہا اور ٹریلر کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

ٹریلر سڑک پر دوڑنے لگا اور اندر دس پندرہ منٹ میں ہی حبس ہونی شروع ہو گئی۔ ایک ٹریلر میں جب 150 لوگ سانس لیں گے تو اندر خود بخود ہی حبس اور گرمی ہو جائے گی۔ ٹریلر کے اوپر کپڑے کی ترپال تھی اور اس کے اندر کچھ سوراخ بھی ہوا کے لئے موجود تھے۔ اس سے بہت تھوڑی مقدار میں ہوا کراس ضرور ہو رہی تھی اور اسی وجہ سے اتنی زیادہ حبس ہونے کے باوجود برداشت کے قابل تھی۔ ٹریلر میں بچے بھی کافی تعداد میں تھے لیکن کسی ایک بھی بچے کے رونے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ اس سفر کے عادی ہو چکے تھے۔ انہیں خطرے کا احساس تھا اس لئے وہ خاموش تھے۔

مقدونیا چھوٹا سا ملک ہے اور یہاں آٹھ دس گھنٹوں والا معاملہ نہیں تھا۔ دو گھنٹے میں ہی ٹریلر پورا

مقدونیا کراس کر جاتا۔ ہم دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے دعائیں کر رہے تھے۔ آدھے گھنٹے تک مسلسل سفر کرنے کے بعد ہمیں پولیس سائرن کی آواز سنائی دی اور ٹریلر کی رفتار بڑھ گئی۔ پولیس کی ایک پٹرولنگ کار کو ٹریلر پر شک پڑ گیا تھا اور وہ اسے روکنے کا اشارہ کر رہے تھے لیکن ڈرائیور نے ٹریلر روکنے کی بجائے مزید تیز کر دیا۔ وہ ٹریلر کو جلدی سے جلدی کسی محفوظ جگہ پر لے جانا چاہتا تھا تاکہ فرار ہو سکے۔ ڈنکی تو پکڑی گئی تھی لیکن اب ڈرائیور اپنی جان بچا رہا تھا۔ پانچ دس منٹ تک ایسے ہی بھاگتے ہوئے ہمیں تین چار فائروں کی آواز آئی اور ٹریلر سڑک پر لہرانا شروع ہو گیا۔

پولیس والوں نے ٹریلر کے ٹائر کو برسٹ کر دیا تھا۔ یہ بہت خطرناک تھا، اگر ٹریلر الٹ جاتا تو اندر موجود لوگ زخمی ہو جاتے۔ اتنی رفتار سے ٹریلر اگر الٹتا تو پانچ چھ لوگ ضرور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔۔۔ لیکن ڈرائیور بہت مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ٹریلر کو الٹا ہونے سے بچا کر کھڑا کیا، دروازہ کھول کر باہر نکلا اور مین روڈ سے نیچے اتر کر جنگل میں غائب ہو گیا۔ پولیس والے اس کے پیچھے ہوائی فائرنگ کرتے رہے لیکن وہ بھاگ گیا۔ پولیس والے اب ٹریلر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے ٹریلر کے گرد گھیرا ڈالا اور وائرلیس پر پیچھے تھانے میں رابطہ کرنے لگے۔

یہاں صرف ایک ہی پولیس کی گاڑی اور چار پولیس والے تھے۔ چار پولیس والوں سے پورا ٹریلر قابو نہیں ہو سکتا تھا اس لئے وہ گھیرا ڈال کر باقی نفری کا انتظار کرنے لگے۔ ٹریلر جب چلتا رہا تھا تب ہوا اندر آتی رہی تھی لیکن اب جب کھڑا ہو گیا تو حبس اندر پھر سے بڑھنے لگی اور آہستہ آہستہ ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔ پولیس والے کسی کو بھی ترپال کے نزدیک نہیں آنے دے رہے تھے۔ کسی بھی لڑکے کا ہاتھ اگر ترپال سے لگتا تو کپڑے کی وجہ سے باہر پتہ چل جاتا تھا۔ وہ جگہ ادھر سے ابھر آتی تھی اور پولیس والے ادھر ڈنڈا مار دیتے تھے۔ وہ پوری طاقت سے ڈنڈا مارتے تھے، جس لڑکے کو بھی ایک بار ڈنڈا پڑ جاتا وہ دوبارہ ترپال کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہ کرتا۔ گرمی اور حبس بہت زیادہ بڑھ گئی تو بچوں نے چیخنا شروع کر دیا۔

بچوں کے رونے کی آواز باہر گئی تو پولیس والے پریشان ہو گئے۔ اندر بچے اور عورتیں تھیں، اگر کوئی بھی عورت یا بچہ سانس گھٹنے سے مر جاتا تو یہی پولیس والے جو ہیرو بن رہے تھے ساری زندگی انکوائریاں بھگتتے رہتے۔ وہ کچھ دیر تو باہر سے چلّاتے رہے لیکن بچوں کی چیخیں حد سے بڑھ گئیں۔ گھٹن بہت بڑھ گئی تھی اور سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ لوگ بے ہوش ہونا شروع ہو گئے تو آخر ان پولیس والوں کو بھی رحم آ گیا۔ ان

میں سے ایک پولیس والا اوپر چڑھا اور اس نے کٹر کی مدد سے ٹریلر کی چھت میں ترپال کے اندر سوراخ کرنا شروع کر دیئے۔ اس نے تین چار جگہوں سے ترپال کو کاٹ دیا۔ اس سے تھوڑی ہوا اندر آئی تو ہم کو کچھ سکون ملنے لگا اور سب خاموش ہو گئے۔ پولیس والا نیچے اتر گیا تھا۔ ترپال میں جب ایک سوراخ ہو جائے تو پھر اس کو پھاڑنا آسان ہوتا ہے۔ لڑکوں نے ان سوراخوں کو مزید پھاڑنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری ترپال ہی اوپر سے پھٹ گئی۔ سائیڈیں ابھی بھی ویسی ہی تھیں، صرف اوپر سے پوری چھت پھاڑ دی گئی تھی۔ سائیڈوں پر اب بھی کسی کا ہاتھ لگتا تھا تو پولیس والے ادھر ڈنڈا مار دیتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد پولیس کی تین اور گاڑیاں ادھر آ گئیں۔ پولیس کا ایک ڈرائیور ٹریلر کے اندر بیٹھا، اس نے ٹریلر سٹارٹ کیا اور آہستہ آہستہ سڑک پر چلانے لگا۔ پولیس کی سبھی گاڑیاں ٹریلر کے آگے پیچھے چل رہی تھیں جیسے کسی وزیراعظم کا پروٹوکول جا رہا ہو۔ دو پولیس والے ٹریلر کی دونوں اطراف پر لٹکے ہوئے تھے کیونکہ لڑکے چلتی گاڑی سے بھی نیچے کود سکتے تھے۔ ٹریلر کا چونکہ ایک ٹائر برسٹ سے پھٹ گیا تھا اس لئے اب وہ جھٹکوں سے چل رہا تھا۔ بریک کا ہائیڈرالک سسٹم بالکل ختم ہو گیا تھا اور اب بریک لگانے پر ٹریلر ادھر ہی جام ہو جاتا تھا۔

پولیس ڈرائیور بڑی مہارت سے چلا رہا تھا لیکن پھر بھی تین ٹائروں پر اتنی بڑی گاڑی چلانا بہت مشکل تھا۔ وہ ہلکا سا ریس سے پیر اٹھاتا تھا تو جھٹکے سے ہم سب آگے کی طرف گرتے تھے جہاں عورتیں اور بچے کھڑے تھے۔ اگر کوئی بچہ نیچے آ جاتا تو بچے کی آواز تو آتی ہی، اس کی ماں کی آواز اس سے زیادہ چیخ کی صورت میں آتی تھی۔ پورا ٹریلر عورتوں اور بچوں کے رونے کی آوازوں سے بھرا ہوا تھا اور ان کی آوازیں دونوں اطراف میں کھڑے پولیس والوں کو پاگل کر رہی تھیں۔ وہ اونچی آواز میں آگے ڈرائیور کو گالیاں دے رہے تھے۔ ڈرائیور پوری احتیاط کر رہا تھا لیکن پھر بھی ہلکی سی بھی رفتار اوپر یا نیچے ہوتی تھی تو جھٹکے لگنے شروع ہو جاتے تھے۔ بچوں کی آنے والی چیخوں سے ہم سب بھی ڈر رہے تھے اور مضبوطی سے جم کر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے تھے لیکن پھر بھی جب جھٹکا لگتا تھا تو ہم سب آگے ان پر گرنے لگتے تھے۔

پولیس والے ہمیں لے کر مین روڈ کے اوپر ہی موجود ایک ٹاؤن نیگوٹینو (Negotino) کے ایک پرائمری سکول میں لے آئے۔ اصل میں یہ سکول نہیں تھا بلکہ پانچ سال سے جو چھوٹے بچے ہوتے ہیں ان کا ایک کیئر سنٹر تھا۔ جرمن زبان میں تو اسے کنڈرگارٹن (Kindar Gartan) کہتے ہیں۔ یہ 2 سال سے

5 سال کے بچوں کے لئے ہوتا ہے۔ یہاں بچے سارا دن کھیلتے ہیں، پینٹنگ بناتے ہیں اور بس! اور کچھ نہیں۔ بچے کھیل ہی کھیل میں سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسرے بچوں سے دوستیاں کرتے ہیں۔ یہاں کی استانیاں بچوں کو بچپن سے ہی اعتماد دیتی ہیں جو بچے کی آنے والی ساری زندگی میں کام آتا ہے۔ کنڈر گارٹن سے ہی بچوں میں ذہانت آتی ہے۔

مجھے پاکستان چھوڑے ہوئے 10 سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آج سے 10 سال پہلے تو کوئی بھی ایسا ادارہ پاکستان میں نہیں تھا لیکن اب شاید بن گیا ہو اور اس کا کوئی نام بھی آ گیا ہو۔ یہاں اس عمارت کا ایک بڑا سا گیٹ تھا۔ عمارت کے صحن میں آسانی سے 5 گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ عمارت کے اندر ہی ایک چھوٹا سا گھاس کا گراؤنڈ بھی تھا جس میں جھولے لگے ہوئے تھے۔ اصل عمارت پانچ بڑے بڑے کمروں پر مشتمل تھی۔ پولیس والوں نے ہمیں نیچے اتارا اور اندر لے گئے۔ یہاں پر انہوں نے شام اور عراق سے آئی ہوئی فیملیوں اور بچوں کو علیحدہ ہال نما کمرے میں منتقل کیا اور ہم لڑکوں کو دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا۔

قریباً ایک گھنٹے تک ہم ادھر ہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد ایک پولیس والا اندر آیا اور وہ 18 سال سے کم عمر لڑکوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ اب یہاں پر ہم تقریباً 50 کے قریب وہ نوجوان تھے جو اٹھارہ سال سے زیادہ کے تھے۔ باقی 90 مہاجرین وہ عورتیں یا بچے تھے یا پھر ان کے ساتھ ان کے ماں باپ یا شوہر تھے۔ 18 سال سے کم عمر کے نوجوان لڑکے بھی تھے جو اکیلے سفر کر رہے تھے۔ یہ زیادہ تر پاکستان کے تھے۔ ان کو بھی پولیس والے علیحدہ کر کے دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔ پولیس والے ان کا نام اور پتہ لکھ کر ان کو ایک لیٹر بنا کر دیتے۔ یہ تین دن کا مقدونیا کا سٹے ہوتا تھا۔ اس سٹے کے اوپر وہ آرام سے ٹرین یا بس پر کمانوہ جا سکتے تھے۔

کمانوہ (Kumanovo) مقدونیا کا آخری سرحدی شہر ہے اور اس سے آگے سربیا شروع ہو جاتا ہے۔ کمانوہ سے بارڈر کی طرف کچھ چھوٹے چھوٹے دیہات ہیں جہاں ایجنٹوں کے سیف ہاؤس ہیں۔ ایجنٹ ہمیں یونان سے روانہ کرتے ہوئے ان دیہات کے نام بتاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس ایجنٹوں کے فون نمبر بھی ہوتے تھے تاکہ اگر کسی وجہ سے ہم ڈنکی سے بچھڑ جاتے ہیں یا پولیس والے ہمیں پکڑ کر چھوڑ دیتے ہیں تو ہم اپنے طور پر بھی اس گاؤں تک پہنچ جائیں۔ وہاں سے پھر سربیا کا بارڈر کراس کروایا جاتا ہے۔ شامی فیملیوں کو جب مقدونیا کا تین دن کا سٹے مل جاتا ہے تو وہ ٹرین سے کمانوہ جاتے ہیں اور پھر کوئی

ٹیکسی وغیرہ کر کے آسانی سے اس گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سے آگے یہ پیسے دے کر بارڈر کراس کرتے ہیں۔

ہمیں یہاں اس عمارت میں آئے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔آخر ایک پولیس والا ہمارے پاس اندر آیا اور اس نے دس لڑکوں کو اٹھایا اور باہر لے گیا۔تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ پھر آیا اور مزید 10 لڑکے لے کر چلا گیا۔ پہلے لڑکے واپس نہیں آئے تھے، شاید ان کو تھانے یا پھر واپس یونان ڈی پورٹ کے لئے لے گئے تھے۔ میں اور وقاص کمرے کے کونے میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہماری باری سب سے آخر میں ہی آئی۔ باہر ایک ٹیبل کے اوپر لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا اور اس کے پیچھے ایک سادہ کپڑوں والا اہلکار ہمارے نام اور شہریت لکھنے لگا۔ یہ صرف کاغذی کاروائی تھی، ہم الٹے سیدھے جیسے بھی نام لکھواتے وہ لکھتا جاتا تھا اور نام کے سپیلنگ تک نہیں پوچھتا تھا۔ہم 10 لڑکوں کو اس نے 20 منٹ میں فارغ کر دیا اور پھر ایک پولیس وین میں بٹھا دیا۔ پولیس وین ہمیں لے کر ٹاؤن سے باہر نکل آئی اور ہمیں ایک چھوٹے سے سنسان روڈ پر اتار دیا۔

''یہ روڈ سیدھا سربیا جاتا ہے۔'' انہوں نے ہمیں انگلش میں بتایا اور وہیں چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ہم سب لڑکے حیران و پریشان کھڑے رہے۔ہمیں کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''میں تو سمجھا تھا کہ یہ پولیس والے ہمیں واپس یونان ڈی پورٹ کریں گے لیکن انہوں نے تو ہمیں یہیں چھوڑ دیا ہے اور سربیا جانے کا راستہ بھی بتا رہے ہیں؟'' وقاص حیرانگی سے پوچھنے لگا۔

''ہاں یار! میں بھی حیران ہو رہا ہوں، انہوں نے اتنی آسانی سے ہمیں یہیں چھوڑ دیا ہے۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ واقعی! انہوں نے ہمیں ایسے ہی چھوڑ دیا تھا۔

''اب آگے کیا کرنا ہے؟ آپ کے موبائل میں پیسے ہیں تو ایک فون کال کر لو!'' وقاص مجھ سے کہنے لگا۔

یورپ میں سبھی کمپنیوں کی سمیں انٹرنیشنل ہوتی ہیں۔آپ ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کے موبائل پر ایک میسیج آتا ہے اور آپ کی سم رومنگ پر چلی جاتی ہے۔رومنگ چارجز بہت زیادہ ہوتے ہیں اور کال سننے پر بھی پیسے کاٹے جاتے ہیں۔ مجھے ایسگارڈ نے سام سنگ کا ایک نیا سمارٹ فون خرید کر دے دیا تھا اور سم کے اندر 100 یورو کا بیلنس بھی ڈلوا کر دے دیا تھا۔ 100 یورو بہت ہی زیادہ بیلنس تھا۔ہم پورا سال موبائل استعمال کرتے تھے اور ایک سال میں بھی ٹوٹل 100 یورو کے کارڈ نہیں بنتے تھے۔

ایسگارڈ نے اکٹھا ہی ایک بار بیلنس ڈلوا دیا تھا تا کہ راستے میں مجھے کہیں بھی کوئی پرابلم نہ آئے اور میں ہر گہ سے اس کو فون کر سکوں۔

''یار! فون کر لو ایجنٹ کو۔۔۔'' وقاص نے ایک بار پھر مجھ سے کہا تو میں نے سم نکال کر فون میں ڈالی اور موبائل آن کر لیا۔

میں سم کو موبائل میں ڈال کر نہیں رکھتا تھا تا کہ اگر کہیں کوئی موبائل چھین بھی لے تو سم بچ جاتی تھی۔ میں نے موبائل آن کر کے سب سے پہلے نقشے پر اپنی لوکیشن چیک کی۔ ہم نیگوٹینو گاؤں سے باہر مین روڈ (جو سکوپیا کی طرف جاتا تھا اس روڈ کے ساتھ ایک سنگل روڈ تھا جو مین روڈ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا) پر کھڑے تھے۔ پولیس والوں نے ہم سے سچ بولا تھا۔ وہی راستہ سکوپیا اور پھر آگے سربیا کی طرف جاتا تھا۔ ابھی میں راستہ ہی دیکھ رہا تھا جب سبرینہ کی کال آ گئی۔ میں نے فون رسیو کیا تو وہ آگے سے لڑنے لگی۔

''راضی! حقیقت میں تم سے زیادہ بے پرواہ لڑکا میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا ہے۔ پتہ ہے ہم پچھلے دو دن سے تمہارے فون کے آن ہونے کا انتظار کر رہے ہیں؟ لیکن تمہارا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔ کدھر ہو؟ ابھی تک یونان میں ہی یا پھر آگے مقدونیا چلے گئے ہو؟'' وہ لگاتار بولتی چلی گئی۔ واقعی مجھے بالکل ان کا پتہ ہی نہیں تھا اور ہم دونوں بالکل ہی بھول گئے تھے۔

''وقاص کدھر ہے؟ تمہارے ساتھ ہی ہے یا پھر وہ الگ ہو گیا ہے؟'' سبرینہ وقاص کا پوچھنے لگی۔

''جی! وہ میرے پاس ہی ہے۔۔۔ میں بات کرواتا ہوں۔'' میں نے موبائل وقاص کی طرف بڑھایا تو وہ بات کرنے لگا، بلکہ سبرینہ کی گالیاں سننے لگا۔ اس نے ایک بار بھی مجھ سے فون آن کرنے اور اس سے بات کرنے کا نہیں کہا تھا۔ وقاص کے پاس بھی فون موجود تھا لیکن اس کے موبائل میں بیلنس نہیں تھا۔ سبرینہ نے اس سے اس کا نمبر لے لیا اور کہا کہ وہ تھوڑی دیر تک اسے کارڈ لکھوا دے گی۔ وقاص نے بات کر کے دوبارہ فون میری طرف بڑھا دیا۔

''سبرینہ! ایسگارڈ کیسی ہے؟'' میں اس سے ایسگارڈ کا پوچھنے لگا۔

''اب یاد آ گئی ہے ایسگارڈ کی؟ وہ واپس چلی گئی ہے امریکہ۔۔۔ مقدونیا کی گورنمنٹ نے اسے امریکہ ڈی پورٹ کر دیا ہے اور وہ مونٹانا (Montana) اپنے گھر میں ہے۔ اس کا پاسپورٹ سٹیٹ گورنمنٹ کے پاس ہے اور وہ امریکہ سے باہر نہیں جا سکتی۔ راضی صاحب! کیس ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔''

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے آہستگی سے کہا تو اسے ایک بار پھر غصہ آ گیا۔

''پتہ ہے کتنی دیر تک تمہیں فون کرنے کے لئے ٹرائی کرتی رہی ہے؟ جہاز کے اندر بیٹھ کر بھی وہ تمہیں فون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ راضی! اس کی پوری زندگی اور کیریئر سب تباہ ہو گیا ہے لیکن مجال ہے جو ایک شکن بھی اس کے ماتھے پر آئی ہو۔۔۔ وہ جاتے ہوئے بھی تمہارے لئے فکرمند نظر آ رہی تھی۔'' اس نے غصے سے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''ابھی تم کہاں ہو؟'' میں اس سے پوچھنے لگا۔

''ابھی تو ہم واپس آ گئے ہیں۔۔۔ کل سے کوستے نے ڈیوٹی پر جانا ہے اور مجھے بھی اکیڈمی جانا ہے۔ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو، تمہارے گھر فون کر کے ان کو تمہاری خیریت کی اطلاع دے دیتی ہوں؟'' وہ دوبارہ پرانی سبرینہ بن گئی تھی۔

''نہیں! ابھی مت اطلاع کرو، میں ہنگری پہنچ کر خود ہی اطلاع دے دوں گا۔'' میں نے اسے منع کرتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے ایجنٹ کو فون کیا، وہ ہمارے ہی فون کا انتظار کر رہا تھا جبکہ باقی سبھی گروپوں نے انہیں فون کر دیا تھا۔ میں نے انہیں اپنی لوکیشن کا بتایا تو وہ ہمیں دریا کے کنارے کی طرف جانے کا کہنے لگا۔

پولیس والوں نے ہمیں کافی آگے جا کر اتارا تھا۔ ہم سڑک پر تقریباً درمیان میں تھے۔ پیچھے کی طرف گاؤں سے فاصلہ 3 کلومیٹر تھا جبکہ اگر ہم سیدھے آگے بڑھتے جاتے تو پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ٹرین کی پٹڑی ہمارے ساتھ مل جاتی۔ پٹڑی کی دوسری طرف دریا تھا جس کے کنارے کنارے کچی سڑک تھی۔ ڈنکروں کی زیادہ کوشش دریا کے کنارے کنارے ہی ہوتی تھی کیونکہ دریا کا کنارہ سیف تھا۔ کنارے پر موجود کچی سڑک پر صرف سائیکل یا موٹر سائیکل ہی چل سکتی تھی، گاڑی کے لئے یہ سڑک ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے لئے مین روڈ یا پھر اس کے ساتھ چھوٹی سڑک تھی۔ مین روڈ، اس سے متصل چھوٹی روڈ، ریل کی پٹڑی اور دریا یہ چاروں ساتھ ساتھ چلتے تھے جو یونان کے بارڈر سے شروع ہوتے تھے اور آگے سکوپیا تک جاتے تھے۔ کچھ جگہوں پر دریا کا کٹاؤ مین روڈ سے کوئی چھ سات کلومیٹر ہٹ جاتا تھا لیکن آگے جا کر یہ پھر مل جاتے تھے اور ایسے ہی سکوپیا تک چلے جاتے تھے۔

سکوپیا کے بعد کمانوہ کے لئے صرف ریل کی پٹڑی تھی۔ دریا تو اوپر ورتک (Vrutok) تک چلا جاتا تھا جبکہ مین روڈ بھی پہاڑی علاقے کی وجہ سے دوسری طرف سے جاتی تھی۔ سکوپیا سے آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ سڑک پر چلتے ہوئے پولیس کا خطرہ رہتا تھا اس لئے آگے سارا سفر ریل کی پٹڑی پر ہی ہوتا ہے۔ ابھی ہم نے دریا کے کنارے پر جانا تھا تاکہ ڈنکر ہمیں وہاں سے لے سکیں۔ کچھ ڈنکر پیچھے سے ایک ڈنگی لے کر آرہے تھے اور انہوں نے کل دوپہر تک ادھر پہنچنا تھا۔ وہ چلتے ہوئے راستے میں ہمیں بھی ساتھ لے لیتے۔ میں نے باقی لڑکوں سے پوچھا اور پھر آگے کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ پیچھے سفر کم تھا لیکن اگلے دن ڈنکر کے ساتھ بھی تو آگے ہی آنا تھا اس لئے پہلے ہی ہم پانچ کلومیٹر آگے جا کر دریا کی طرف چلے جاتے۔ رات کے اس وقت ساری سڑک سنسان تھی، صرف مین روڈ ہی چل رہی تھی۔ ہم سب لڑکے سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم دریا کے کنارے پر پہنچ گئے۔

ابھی صبح ہونے میں کافی وقت تھا اس لئے ہم مزید آدھا گھنٹہ دریا کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ آگے ہمیں ایک اور گروپ بھی مل گیا۔ وہ کچی سڑک سے ہٹ کر ایک خالی کھیت میں لیٹے ہوئے تھے۔ ہم بھی ان کے پاس جا کر لیٹ گئے۔ اب ہماری تعداد 20 ہو گئی تھی۔ دن کی روشنی پھیلی تو دریا کے اس کنارے پر آمدورفت شروع ہو گئی۔ یہ اِکاُدکا زمیندار یا کھیتوں میں کام کرنے والے تھے۔ وہ ہمیں سلام کرتے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ ان کے لئے یہ نارمل بات تھی کیونکہ ہر روز دریا کے کنارے پر ڈنکیاں چلتی رہتی تھیں۔ سربیا جانے کے لئے یہی سیدھا راستہ تھا اور اس راستے پر روزانہ ہزاروں مہاجرین گزرتے تھے۔ سورج کچھ نظر آیا تو میں اور وقاص اٹھے اور دریا کے پانی سے منہ ہاتھ دھونے لگے۔ منہ دھونے کے بعد میں نے ایک بار پھر موبائل آن کیا تو سبرینہ اور ایسگارڈ دونوں کے میسیج آئے ہوئے تھے۔ ایسگارڈ تو رات سے ہی ٹرائی کر رہی تھی لیکن میں نے موبائل آف کر دیا تھا۔ یہاں دریا کے کنارے کوئی بجلی نہیں تھی، اگر موبائل کی بیٹری ختم ہو جاتی تو پرابلم بن جاتی۔۔۔ اس لئے مین نے موبائل آف کیا ہوا تھا۔ ایسگارڈ کے ڈبل زیرو ون (001) والے میسیج میرے موبائل پر ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں ابھی تک امریکہ تو نہیں پہنچ سکا تھا لیکن امریکہ کے اندر میری پہچان پہنچ چکی تھی۔

''فوکسی! 001 کا کوڈ غور سے دیکھ لو، ایک دن تمہارے بھائی کے پاس بھی اسی کوڈ والی سم ہو گی اور میں وہاں سے تمہیں فون کروں گا۔'' میں نے وقاص کو فون دکھایا اور ایسگارڈ کے 001 کوڈ والی سم پر مس

کال دے دی۔ ایک منٹ بعد ہی اس کی کال بیک آ گئی اور اس نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا۔

''راضی! میں مر جاؤں گی تمہارے بغیر، ہر پل ہر لمحہ تمہاری محبت پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ بہت درد ہوتا ہے مجھے۔۔۔'' وہ سسک سسک کر رو رہی تھی اور بات کر رہی تھی۔

''راضی! تم سچ کہتے تھے کہ یہ محبت بہت درد دیتی ہے، ہم جیسے لوگ محبت کی ان اذیتوں کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن دیکھ لو یار! ہمیں محبت کرنا بھی آ گیا اور اس درد کو برداشت کرنا بھی۔۔۔'' وہ مسلسل روتے ہوئے بول رہی تھی۔

''ایسگارڈ! تم ٹھیک تو ہونا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟'' میں اس سے پوچھنے لگا۔

''نہیں یار! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔۔۔صرف یہ لوگ مجھے میرا پاسپورٹ نہیں دے رہے ہیں لیکن کب تک یہ مجھے روکیں گے؟ محبت کا راستہ روکنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں ہے۔ ہمارا یہ عظیم ملک امریکہ بھی ہماری اس محبت کو نہیں روک سکتا۔ ایسگارڈ ایک دن تمہارے پاس پہنچ کر رہے گی۔'' وہ مسلسل بولے چلی جا رہی تھی۔ مجھے کال سننے کی رومنگ بھی پڑ رہی تھی اور میرے موبائل کی بیٹری بھی ختم ہو رہی تھی اس لئے اسے میں نے اپنی مجبوری بتائی اور فون بند کر دیا۔ فون بند کرتے ہی میں نے سبرینہ کے میسج دیکھے، اس نے بیس بیس یورو والے دس کارڈ بھیجے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے نمبر لکھے اور وقاص کے فون میں فیڈ کرنے لگا۔

ڈنکر شام کو پانچ بجے کے قریب ایک بہت بڑی ڈنکی لے کر پہنچے۔ ان کے ساتھ تقریباً 200 کے قریب لڑکے تھے۔ 60 لڑکے تو ہم ہی تھے باقی 150 لڑکے وہ پیچھے سے لے کر آ رہا تھا۔ یہاں اس ڈنکی میں سارے ہی نوجوان لڑکے تھے۔ فیملی اور بچے صرف بارڈر کراس کرتے تھے اور سیدھی ٹرین پکڑ کر کمانوہ پہنچ جاتے تھے۔ پولیس صرف پرائیویٹ گاڑیوں کو ہی پکڑتی تھی۔ بس یا ٹرین اسٹیشن پر پولیس والے کھڑے ہوتے تھے اور ہم وہاں سے سوار نہیں ہو سکتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو یہاں کی پولیس بھی کچھ نہیں کہتی تھی اور وہ آسانی سے ٹرین کی ٹکٹ لے لیتے تھے۔ مسئلہ صرف ہمارے لئے تھا۔ ہماری عمر بیس سے زیادہ تھی اور ہم پاکستانی تھے اس لئے دنیا کے کسی بھی کونے میں قابلِ قبول نہیں تھے۔ گاڑی کا بندوبست ایک بار ایجنٹوں نے کر دیا تھا لیکن ہماری بدقسمتی سے وہ پکڑی گئی۔ یہاں ڈرائیوروں کو ساری ادائیگی پہلے ہی دی جاتی ہے۔ ان کو ایک بار نقصان ہو چکا تھا اور اب وہ دوسری گاڑی کا بندوبست کرنے کی بجائے پیدل ہی کمانوہ لے جا رہے تھے۔

ہم دوسو سے زیادہ لڑکے تھے اور ہمارے چار ڈنکر تھے۔ یہ ڈنکر جوجیلیا(Gevgelija) سے لے کر کمانوہ تک پیدل لے کر جاتے تھے۔ یہ ٹوٹل سات دن کا سفر تھا۔ ڈنکر اس پورے سفر کا ایجنٹوں سے 200 یورو فی آدمی وصول کرتے تھے۔ ہم دوسو کے قریب لڑکے تھے جن کی ٹوٹل پیمنٹ 40,000 یورو بنتی تھی۔ یہ چار ڈنکر ایک ہفتے کی ڈنکی کا 10 ہزار یورو(پاکستانی تقریباً 12 لاکھ روپے) سے زیادہ کمارہے تھے۔ وہ کمانوہ پہنچا کر واپسی ٹرین پر آجاتے تھے۔ یہاں صرف اوپر سربیا کی طرف جانے والوں کے لئے ہی سختی ہے۔ نیچے کی طرف آپ ڈائریکٹ یونانی شہر سلونیکی کی بھی ٹکٹ لے لیں تو تب بھی کوئی آپ کونہیں پوچھے گا۔ آپ آسانی سے سلونیکی ٹرین کے ذریعے آسکتے ہو۔ وہ ڈنکی کو کمانوہ پہنچا کر واپس ٹرین پکڑتے اور دو گھنٹے میں جوجیلیا پہنچ جاتے اور پھر نئی ڈنکی لے کر دوبارہ اوپر کی طرف سفر شروع کر دیتے۔

ٹرین کا صرف دو گھنٹے کا سفر پیدل طے کرنے میں سات دن لگ جاتے تھے۔ پیدل ڈنکی کو پولیس بالکل نہیں پوچھتی تھی۔ اگر کوئی پولیس کار دیکھ بھی لیتی تو وہ نظر انداز کر دیتے تھے۔ یہ ڈنکر صرف دن کو ہی سفر کرواتے تھے جبکہ رات کو ہم لوگ سوتے تھے۔ ابھی کچھ ٹائم باقی تھا، ڈنکر ہمیں بھی اپنے ساتھ لے کر چلنے لگے۔ تقریباً آٹھ بجے تک ہم مسلسل سفر کرتے رہے۔ رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ اترنا شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک کھلی جگہ کا انتخاب کیا اور رات ہمیں ادھر ہی سونے کا کہہ کر خود بھی لیٹ گئے۔ کھانا یہ لوگ صرف ایک وقت کا دوپہر کو ہی دیتے تھے۔ وہ لوگ دوپہر کو کسی گاؤں کے قریب سے گزرتے تھے تو ہمیں دریا کے کنارے پر ہی بٹھا کر تین چار لڑکوں کو ساتھ لیتے اور گاؤں کی سپر مارکیٹ سے بریڈ، جام اور دوسری کھانے والی اشیاء لے آتے تھے۔ کھانے کا سامان وہ ایک بار دیتے تھے لیکن کافی کھلا اور وافر مقدار میں ہوتا تھا۔ رات کو ہم ادھر ہی سو گئے۔ دوسرے دن صبح آٹھ بجے کے قریب انہوں نے ہمیں اٹھا لیا۔ ہم لڑکوں نے دریا کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ وقاص نے بسکٹ کا ایک پیکٹ مجھے دیا اور ہم دونوں نے پانی کے ساتھ بسکٹ کھائے اور پھر چلنا شروع کر دیا۔

دوسو لڑکوں کی ڈنکی تھی اور ہم کچی سڑک پر دو قطاروں میں سفر کر رہے تھے۔ 12 بجے کے قریب ہم نے سٹوبی(Stobi) کو کراس کیا۔ سٹوبی قبل از مسیح میں رومن ایمپائر کا مقدونیا کا دارالخلافہ رہا ہے۔ یہاں پر رومن دور کے آثارِ قدیمہ موجود ہیں۔ قبل از مسیح میں رومن ایمپائر تقریباً پورے یورپ، ترکی اور کچھ افریقی حصے پر مشتمل تھی اور مقدونیا آج کے پورے مقدونیا، بلغاریہ کا تھوڑا سا حصہ اور شمال مشرقی یونانی حصہ پر

مشتمل تھی۔ یہ وہی مقدونیا ہے جس کے حکمران سکندرِاعظم نے آدھی دنیا فتح کی تھی۔ سکندر اعظم یونانی مقدونیا کے علاقے پیلا (Pella) میں پیدا ہوا تھا اور یہیں سے اس نے ایرانی سلطنت کے خلاف پیش قدمی شروع کی تھی۔ اس دور میں ایرانی سلطنت پورے ترکی تک پھیلی ہوئی تھی۔ ترکی ایرانی سلطنت کا حصہ تھا۔ سٹوبی کلیپا کی پہاڑیوں کے سرے پر ہے۔ جو ماربل کے حوالے سے کافی مشہور ہے۔ 518ء میں آئے ایک زلزلے سے یہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا اور آج یہاں پر صرف کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے سیاحوں کے لئے یہ کافی کشش رکھتا ہے۔

ڈنکر ہمیں سٹوبی کو کراس کر کے تقریباً 2 کلومیٹر آگے لے گئے۔ یہاں پر کچی سڑک اور دریا کے درمیان تھوڑا فاصلہ تھا۔ ڈنکروں نے ہمیں ادھر ہی بٹھا دیا۔ انہوں نے ہم میں سے اپنے ساتھ تین اور لڑکے لئے اور نزدیکی گاؤں کی طرف کھانا لینے کیلئے چل دیئے۔ نزدیکی گاؤں کا نام گراسکو (Grasko) تھا۔ 30 ہزار کی آبادی والا یہ گاؤں تقریباً ایک کلومیٹر دور تھا۔ ڈنکر ایک گھنٹے تک کھانے پینے کا سامان لے کر آ گئے۔ ان کے پاس بریڈ اور جام کی بوتلیں تھیں۔ مرغی کا ابلا ہوا گوشت بھی وہ لے کر آئے تھے۔ مقدونیا یونان کے مقابلے میں انتہائی سستا تھا۔ یونان کا ایک یورو مقدونیا کے 61 درہم کے برابر تھا۔ یونان کے 30 یورو کے مقابلے میں یہاں کی مزدوری 5 یورو کے برابر تھی اور اسی لحاظ سے کھانے پینے کا سامان بھی سستا تھا۔ دوسو آدمیوں کا کھانا وہ 100 یورو میں لے کر آ گئے تھے۔

کسی بھی قسم کا گوشت صرف پاکستان یا انڈیا میں ہی مہنگا ہے جبکہ اس کے برعکس باقی پورے یورپ میں یہ سبزی سے بھی سستا ہے۔ بریڈ کے تین بڑے بڑے تھیلے وہ بھر کر لائے تھے۔ میں نے اور وقاص نے ایک ایک بریڈ، جام کی ایک بوتل اور گوشت پکڑا اور ایک کونے میں بیٹھ کر کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم مزید آدھے گھنٹے تک ادھر ہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد اٹھ گئے اور دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔ شام کو پانچ بجے کے قریب ہم نے پھر آدھے گھنٹے کے لئے آرام کیا اور ایک بار پھر سفر شروع ہو گیا جو رات کو 9 بجے تک مسلسل جاری رہا۔ ڈنکر آرام سے چلتے تھے اور زیادہ تیز سفر نہیں کرتے تھے۔ دریا کا کنارہ ہونے کی وجہ سے یہ سفر اونچا نیچا نہیں تھا بلکہ بالکل سیدھا راستہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہمیں تھکاوٹ بھی نہیں ہوتی تھی۔ رات کو آٹھ بجے انہوں نے ایک جنگل میں پڑاؤ ڈالا اور ہمیں رات وہیں گزارنے کا کہہ کر خود آگے بڑھ گئے۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر جا کر رات گزارنے کا انتظام کرتے، ادھر ہی سو جاتے اور صبح صبح پھر ہمارے پاس آ جاتے۔

''آ جاؤ وقاص! رات گزارنے کے لئے کسی اچھی جگہ کا انتظام کرتے ہیں۔'' میں نے وقاص کو اپنے ساتھ لیا اور کسی اچھی اور قدرے صاف جگہ کی تلاش کرنے لگا۔

ہمارے دائیں بائیں چاروں طرف لڑکے پھیلے ہوتے تھے۔ دو سو سے زیادہ لڑکے۔۔۔ یہاں ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آ رہے تھے۔ میں اور وقاص ان سے ہٹ کر ایک الگ تھلگ جھنڈ کے پاس آ گئے۔ میں نے ایک جھاڑی کی مدد سے جگہ صاف کی اور ادھر ہی لیٹ گئے۔

''راضی بھائی! ٹھیک ہی ہے۔۔۔ آرام سے ہی ڈنکی لگ رہی ہے اور اتنی مشکل بھی نہیں ہے۔''

میں نے اور وقاص نے ایران اور ترکی کی پہاڑی علاقوں والی لمبی لمبی ڈنکیاں لگائی تھیں۔ کردے، پولیس اور ڈاکوؤں کا ڈر اس ڈنکی کو انتہائی خوفناک بنا دیتا ہے جبکہ یہ یورپین ڈنکی تھی اور اس کی نسبت آسان تھی۔ میں نے وقاص کی ہاں میں ہاں ملائی اور لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کو دو بجے کے قریب میری آنکھ بارش کے پانی کے قطروں سے کھلی۔ ہم جنگل میں درختوں کے نیچے سوئے ہوتے تھے۔ بارش کافی دیر سے ہو رہی تھی اور اب پتوں سے چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی۔ وقاص ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا تو وہ نیند سے بیدار ہو گیا۔

''اٹھ جاؤ یار! تم ہی بول رہے تھے کہ ڈنکی بہت آسان ہے۔۔۔ ابھی مشکل ڈنکی بھی دیکھ لو!'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور کسی موٹے تنے والے گھنے درخت کو تلاش کرنے لگا۔

ہمیں ہر حالت میں اپنے کپڑے اور بیگ بچانے تھے۔ اگر ایک بار کپڑے گیلے ہو جاتے تو پھر بہت مصیبت ہو جاتی۔ یہاں سردی بھی یکدم بہت بڑھ گئی تھی۔ یورپ میں موسم ایسا ہی رہتا ہے۔۔۔ سردی اور بارش کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ یہاں جون جولائی میں بھی فل جیکٹوں والی سردی ہوتی ہے۔ مجھے ایک موٹے تنے والا درخت مل گیا۔ میں اور وقاص جلدی سے اس درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یورپ میں سارے دریا اور نالے وغیرہ عام زمین سے قدرے نشیب میں بہتے ہیں۔ پاکستان میں تو نہریں اور ان کے بند اونچے ہوتے ہیں اور کھیت نشیب میں۔۔۔ نہروں سے ڈائریکٹ پانی کھیتوں کو لگایا جا سکتا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں یہی دریا اور نالے سیلاب کے باعث بنتے ہیں۔

یہاں یورپ میں دریا نشیب میں ہوتے ہیں اور کھیتوں کو پانی لگانے کے لئے بجلی کی بڑی موٹریں استعمال ہوتی ہیں جو پانی کو اوپر کھینچ کر پائپوں کی مدد سے کھیتوں تک پہنچاتی ہیں۔ بارش ہونے کی صورت

میں پہاڑوں یا کھیتوں کا سارا پانی نیچے دریا کی طرف آتا ہے اور یہ دریا آگے سمندر میں جا گرتا ہے۔ یہاں بارشوں کی زیادتی کبھی بھی سیلاب کا باعث نہیں بنتی اور کسی وزیر کو لمبے بوٹ پہن کر تصویریں کھنچوانے کا موقع بھی نہیں ملتا۔

ہم سب اس وقت دریا کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جنگل میں جتنی بھی بارش ہو رہی تھی سارا کا سارا پانی دریا کی طرف آ رہا تھا۔ ہمارے نیچے ساری زمین گیلی ہوگئی تھی اور لیٹنے کی گنجائش ختم ہوگئی تھی۔ اس لئے ہم دونوں درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ باقی لڑکے بھی اب محفوظ جگہ تلاش کر رہے تھے۔ بارش ایک گھنٹہ مزید برسنے کے بعد تھم گئی لیکن اس بارش کے سائیڈ ایفیکٹ صبح تک رہے۔ پانی کی وجہ سے جگہ گیلی ہوگئی تھی اور ساری رات ہمیں بیٹھ کر گزارنی پڑی۔ بارش کی وجہ سے سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں اور وقاص دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بیٹھے ہوئے تھے لیکن پھر بھی ٹھنڈ سے جان نکلتی رہی اور ایسے ہی سردی لڑتے لڑتے صبح ہوگئی۔ پہلے ڈنکر ہمیں صبح آ کر اٹھاتے تھے جبکہ آج ہم ڈنکروں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈنکروں کو بھی پتہ تھا کہ بارش کی وجہ سے کوئی بھی سویا نہیں ہوگا۔۔۔ اس لئے وہ سات بجے ہی آ گئے اور آتے ہی ہمیں اکٹھا کیا اور چلنا شروع کر دیا۔

اس بار ہماری رفتار کل کے مقابلے میں زیادہ تیز تھی۔ ہمارے ذہن میں ایک امید سی تھی کہ جلد سے جلد اس سفر کو مکمل کرنا ہے لیکن یہ سفر اتنی جلدی تو ختم نہیں ہونا تھا، یہ تو اپنے وقت پر ہی ختم ہوتا۔ 200 کلومیٹر کا یہ سفر اتنی جلدی کہاں ختم ہوتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم نے پہلا 50 کلومیٹر کا سفر ٹریلر میں طے کر لیا تھا اور ہمارے دو دن بچ گئے تھے۔ ہمیں صرف 5 دن کا سفر مزید کرنا تھا۔ دوپہر کو 12 بجے کے قریب ہم نوگاویسٹی (Nogaevtsi) گاؤں پہنچ گئے۔ ڈنکروں نے ہمیں گاؤں سے باہر ایک مکئی کے کھیت کے کنارے پر بٹھایا اور خود گاؤں سے کھانا لینے چلے گئے۔ گاؤں بالکل نزدیک ہی تھا، وہ بیس منٹ میں ہی کھانا لے کر واپس آ گئے۔ وہ کھیت کے کنارے پر کھانا لے کر کھڑے ہو گئے اور سبھی لڑکوں کو ایک ایک بریڈ، جام اور چیز کا ایک ایک پیکٹ پکڑاتے جاتے اور آگے روانہ کرتے جاتے۔ ایک ڈنکر سب سے آگے تھا۔ وہ ہمیں لے کر دوبارہ چلنا شروع ہو گیا۔

''یار! آج آرام کروانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟ مسلسل سفر کروا رہے ہو؟'' میں نے بریڈ پکڑتے ہوئے ڈنکر سے پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

''اصل میں آگے ویلز (Veles) شہر آ رہا ہے اور ہم زیادہ سے زیادہ شہر کے نزدیک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ہم شام کو چھ بجے کے قریب بابونا (Babuna) گاؤں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد رات کو 12 بجے کے بعد ویلز شہر کو کراس کریں گے۔ بڑا شہر ہے اور ادھر پولیس کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے دن کو سفر کرنے کی بجائے ہم رات کو چوری چھپے اس شہر کو کراس کریں گے۔'' ڈنکر نے مجھے بریڈ پکڑاتے ہوئے بتایا تو میں مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا۔

شام کو چھ بجے سے پہلے ہی ہم بابونا پہنچ گئے۔ یہ اصل میں گاؤں نہیں تھا بلکہ بیس پچیس کے قریب گھر تھے اور ایک بہت بڑی گوشت کی مارکیٹ تھی۔ یہاں سے موٹروے دریا کی دوسری طرف چلی جاتی تھی اور دریا سے کوئی پانچ کلومیٹر دور ہو جاتی تھی۔ دریا اور ریلوے لائین ویلز شہر کے کنارے سے گزرتی تھی جبکہ موٹروے مین شہر سے 10 کلومیٹر دور سے ہی گزر جاتی تھی جو آگے سکوپیا جاتی تھی۔ ہم سب کو بھی سکوپیا کی طرف ہی جانا تھا لیکن ہم موٹروے کی بجائے دریا کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ موٹروے دریا کی دوسری طرف ہم سے کافی فاصلے پر رہ گئی تھی۔

''ابھی آپ سب لوگ یہیں آرام کرو اور سو جاؤ! رات کو بارہ بجے ادھر سے نکلنا ہے۔ سات آٹھ گھنٹے کی رات کی ڈنکی ہو گی۔ صبح 5 بجے سے پہلے پہلے ہم آرام سے شہر کراس کر لیں گے۔ اس کے بعد مزید تین گھنٹے ملیں گے تو شہر سے کافی دور ہو جائیں گے اور اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔'' ایک ڈنکر نے انگلش میں سب کو مخاطب ہو کر کہا تو ہم سب لیٹنے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگے۔

''ادھر آ جاؤ راضی! یہ جگہ ٹھیک ہے۔'' وقاص نے ایک طرف کو اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں ادھر چلا گیا۔ یہ کافی کشادہ جگہ تھی، میرے اور وقاص دونوں کے لئے کافی تھی۔ ہم دونوں ادھر ہی لیٹ گئے۔

''میں ایک بار ڈیرے پر فون کر لیتا ہوں۔'' وقاص نے موبائل نکال کر آن کر لیا۔

اس نے ڈیرے پر فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔ صدام کافی پریشان ہو رہا تھا، وقاص نے اس سے بات کر کے کال بند کی اور ویسے ہی موبائل بند کئے بغیر ایک طرف رکھ دیا۔ اس کا ارادہ پاکستان فون کرنے کا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔ یورپ کے اندر تو کال چارجز مناسب تھے لیکن پاکستان کال کرنی بہت مہنگی تھی۔ موبائل رومنگ پر تھا اور کال سننے کے بھی پیسے لگتے تھے۔ یہ نارمل ریٹ تھا، دس سینٹ کی ایک منٹ کال سنی جاتی تھی۔ پیسوں سے زیادہ موبائل کی بیٹری کی فکر ہوتی تھی لیکن پاکستان بہت زیادہ کال ریٹ تھا۔

پاکستان کی گورنمنٹ نے اچانک کال ریٹ میں 350 فیصد سے زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ادھر سے صرف پانچ منٹ ہی بات ہوتی اور موبائل کا سارا بیلنس ختم ہو جاتا۔ وقاص کو میری بات کی سمجھ آ گئی تھی۔ ابھی بہت لمبا سفر تھا اور ہمیں زیادہ سے زیادہ موبائل کی بیٹری اور بیلنس بچانا تھا۔ وقاص موبائل آف کرنے لگا تو سبرینہ کی کال آ گئی۔ وقاص نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کوئی دو منٹ سبرینہ سے بات کی تو اس نے مجھے فون آن ہی رکھنے کا کہا۔ وہ ایسگارڈ سے میری بات کروانا چاہتی تھی۔ اس نے ایسگارڈ کو فون کر کے بتا بھی دیا تھا۔ میں نے ادھر سبرینہ کی کال کاٹی تو دوسری طرف ایسگارڈ کی کال آ گئی۔

''کیسی ہو ایسگارڈ!'' میں نے اس کی کال لیتے ہوئے کہا۔

''یار! ابھی تک درد میں افاقہ نہیں ہو رہا ہے۔۔۔تم اب بھی اتنی ہی شدت سے یاد آ رہے ہو۔'' اس کی گونجتی ہوئی آواز آئی تو میں ماضی میں چلا گیا۔

ایمان کی یاد بھی تو اتنی ہی شدت سے آتی تھی۔ وہ بھی ہر دن ایک نئی تازگی کے ساتھ میری یادوں میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ ایسگارڈ کتنی دیر تک بات کرتی رہی مجھے کوئی ہوش نہیں تھی۔ میں بس خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''راضی تم سن رہے ہو نا؟'' ایسگارڈ نے دو تین بار یہ فقرہ دہرایا تو مجھے ہوش آ گئی۔

''ہاں ہاں ایسگارڈ! میں سن رہا ہوں۔ یہاں ہمارے پاس موبائل چارجنگ کی سہولت نہیں ہے۔ موبائل کی بیٹری ختم ہو گئی تو پرابلم ہو جائے گی۔'' میں نے اسے بتایا تو اس نے مزید ایک دو باتیں کر کے فون بند کر دیا۔ اسے ابھی تک پاسپورٹ واپس نہیں ملا تھا۔ اس کا کیس ابھی تک امریکی عدالت میں چل رہا تھا اور وہ مونٹانا سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔

رات کو گیارہ بجے ہم نے سفر شروع کیا اور 5 بجے کے قریب ہم نے ویلز شہر کو کراس کر لیا۔ پچاس ہزار کی آبادی والا یہ شہر 1912ء تک عثمانی سلطنت کا حصہ رہا ہے۔ عثمانی سلطنت 1299ء سے لے کر 1922ء تک رہی تھی اور اس کی سرحدیں سعودی عرب سے شروع ہو کر اٹلی تک جاتی تھیں۔ دوسری طرف سے یہ سرحدیں اوس سے شروع ہوتی تھیں اور آدھے آسٹریا تک چلی جاتی تھیں۔ 1912ء کے بعد یہ شہر یوگوسلاویہ کا حصہ بن گیا۔ اس کا نام بھی ٹیٹون یوگوسلاویہ کے ایک صدر کا نام ہے۔ یہ نام 1996ء تک رہا اور اس کے بعد اس کو ہٹا کر دوبارہ ویلز رکھ دیا گیا۔ صبح آٹھ بجے تک ہم شہر سے کافی دور آ گئے تو ڈنکروں نے ہمیں

ایک جگہ پر آرام کرنے کے لئے بٹھا دیا۔ 12 بجے تک ہم ادھر ہی پڑے سوتے رہے اور اس کے بعد ایک بار دوبارہ سفر شروع ہوا تو شام کو چھ بجے کے قریب ہم زلینکو و (Zelenkovo) پہنچ گئے۔ یہاں سے سکوپیا صرف 20 کلومیٹر دور رہ گیا تھا۔

''آپ سب لوگ آرام کرو، صرف دو گھنٹے بعد پھر سفر کرنا ہے۔ یہاں سے 10 کلومیٹر دور سکوپیا ایئرپورٹ ہے۔۔۔ہم آٹھ بجے ادھر سے نکلیں گے تو ٹھیک 12 بجے ایئرپورٹ اور پھر آگے کمانوہ کی طرف نکل جائیں گے۔مقدونیا بہت بڑا اور بین الاقوامی ایئرپورٹ ہے، وہاں کی سیکورٹی بھی اسی حساب سے سخت ہوگی۔ہم سڑک کی بجائے کھیتوں میں سے جائیں گے لیکن چونکہ 200 لوگوں کی ڈنکی ہے اس لئے ہمیں بہت احتیاط کرنی ہوگی۔'' ڈنکر ہمیں سمجھا رہا تھا۔

ہم نے دو گھنٹے ادھر ہی آرام کیا اور پھر ایئرپورٹ کی طرف چل پڑے۔ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم ایئرپورٹ پر پہنچ گئے تھے۔یہ ایئرپورٹ سکوپیا شہر سے باہر سکوپیا سے کمانوہ جانے والی موٹروے کے اوپر تھا۔موٹروے کے ساتھ ساتھ چھ فٹ کے قریب اونچی تار لگی ہوئی تھی۔ہم سب موٹروے سے کوئی 100 میٹر دور کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ہمیں ایئرپورٹ کراس کرتے ہوئے پورے دو گھنٹے لگ گئے۔ اس حصے میں جہاز نیچے اترتے تھے۔یہ مقدونیا کا سب سے مصروف ترین ایئرپورٹ تھا اور ہر پندرہ منٹ بعد کوئی نہ کوئی جہاز لینڈ کرتا تھا۔ہم سے صرف 100 میٹر دور ہی ایئرپورٹ تھا۔ڈنکروں نے ہمیں سختی سے بتایا ہوا تھا کہ جب بھی کوئی جہاز آئے تو فوراً زمین پر لیٹ جائیں۔چھپنے کے لئے کوئی جھاڑی یا درخت تلاش نہ کریں بلکہ جدھر بھی ہوں ادھر ہی زمین پر لیٹ جائیں۔

یہاں پر جہاز اتنا نزدیک آجاتا تھا کہ اس کی ہوا کی شدت ہمیں ہلا دیتی تھی۔ جہاز کی تیز سرچ لائٹس ایک لمحے میں ہر طرف دن بنا دیتی تھیں اور اس کے انجن کی آواز کانوں میں گھس جاتی تھی۔ وہ ہمیں ہوا کے پریشر اور پائلٹ کی نظروں سے بچانا چاہتے تھے۔ہوا کا پریشر تو ٹھیک تھا۔۔۔واقعی! بہت زیادہ پریشر ہوتا تھا۔زمین پر لیٹنے کی وجہ سے ہم محفوظ رہتے تھے لیکن پائلٹ والی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔پائلٹ کی نظر ہمیشہ آگے ایئرپورٹ پر ہوتی ہے اور وہ کھیتوں میں نہیں دیکھتا ہے۔میں نے ان ڈنکروں کو کہا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ پہلے ایک ڈنکی یہاں سے پکڑی گئی تھی۔وہ 100 کے قریب لڑکے تھے اور انہیں سپیشل آرمی نے پکڑا تھا۔انہیں تین دن سکوپیا کیمپ میں رکھنے کے بعد یونان ڈی پورٹ کر دیا تھا۔

صبح تک ہم برزک (Barzak) پہنچ گئے۔ ایئرپورٹ کو کراس کرتے ہی ہم نے ریل کی پٹری پکڑی تھی اور ابھی ریل کی پٹری پر ہی سفر کر رہے تھے۔ ریل کی پٹری پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔ ڈنکروں نے ہمیں پٹری کے ساتھ نیچے گھاس پر لیٹنے اور آرام کرنے کا کہا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور ریل کی پٹری کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں سے نزدیک ترین سڑک بھی ایک کلومیٹر دور تھی جو کہ گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ ہم 12 بجے تک ادھر ہی رہے اور اس کے بعد پھر ریل کی پٹری پر چلنے لگے۔ ایک ڈنکر ہمارے آگے چل رہا تھا، دوسرا ڈنکر ہمارے پیچھے جبکہ تیسرا ڈنکر درمیان میں تھا۔

یہاں پر پانچ کلومیٹر کے بعد ''خبردار'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ بورڈ انگلش کے علاوہ عربی، اردو اور فارسی میں بھی تھا۔ ہم مقدونیا میں اردو بورڈ لگے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ یہ بورڈ ٹرین سے بچاؤ کے لئے تھے۔ اس پہاڑی علاقے میں بہت سی چھوٹی بڑی سرنگیں تھیں۔ بورڈ پر سرنگوں کے اندر سے گزرنے کی بجائے اوپر پہاڑی سے جانے کا کہا گیا تھا۔ زیادہ تر حادثات سرنگوں کے اندر ہی ہوتے تھے۔ دوسولڑ کے اگر ایک سرنگ میں داخل ہوں اور اچانک ٹرین آجائے تو بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا ہے۔ سرنگ میں دیوار کے ساتھ دونوں طرف ایک ایک آدمی کے لیٹنے کی جگہ ہوتی ہے لیکن اتنے رش کی وجہ سے ٹرین بالکل سر پر آجائے تبھی پتہ چلتا ہے اور تب تک بہت لیٹ ہو چکی ہوتی ہے۔ سڑکوں کے اطراف پر ہوتے ہوتے بھی دس بارہ لوگ ٹرین کی زد میں آجاتے ہیں۔

شروع شروع میں بہت زیادہ حادثات ہوتے تھے لیکن اب ڈنکر احتیاط کرنے لگے تھے۔ وہ سرنگ کی بجائے پہاڑی کے اوپر سے لڑکوں کو لے کر جاتے تھے۔ اگر کسی سرنگ کی پہاڑی بہت اونچی یا ناقابلِ عبور ہوتی تو وہ سرنگ کے باہر پہلے کسی ٹرین کے گزرنے کا انتظار کرتے تھے۔ جب ٹرین گزر جاتی تو اس ٹرین کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے کراس کرتے تھے۔ ایک ٹرین سے دوسری ٹرین کے درمیان کم از کم بھی آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت ہوتا تھا اور وہ اسی وقت میں سرنگ عبور کر لیتے تھے۔

''راضی بھائی! یہ لڑکے ہمارے پاس امانت ہوتے ہیں، انکے ماں باپ، بہن بھائی پیچھے ان کے لئے دعائیں کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم کسی کو بھی مرنے نہیں دیتے ہیں۔'' وہ اکثر میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہتے تھے۔ میرے اندر کا لکھاری ان سے بات کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ میں ان سے راستے میں آنے والی ایک ایک چیز کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا۔

دو دن کے لگاتار اور تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم کمانوہ پہنچ گئے تھے۔ کمانوہ سے شمال مغرب کی طرف ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ گئے۔ یہ چھوٹا سا البانوی نژاد باشندوں کا گاؤں تھا اور سارا گاؤں ہی انسانی سمگلنگ کا کام کرتا تھا۔ یہ مقدونیا کا علاقہ غیر تھا۔ گاؤں کی 100 فیصد آبادی البانوی نژاد مسلمانوں پر مشتمل تھی اور پورے بدمعاش لوگ تھے۔ یہاں میں نے پہلی بار یورپ میں اسلحہ دیکھا تھا۔ اس گاؤں میں کم ازکم 10 مختلف سیف ہاؤس تھے اور کوئی 100 کے قریب ایجنٹ یا ڈنکر یہاں مقیم تھے جو کہ پورے گاؤں میں آزادانہ گھومتے پھرتے تھے۔ یہاں بالکل پاکستانی ماحول تھا۔ گاؤں میں پہنچتے ہی باہر کچھ پاکستانی لڑکے کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے ایجنٹوں کا نام لیا اور ہمیں اپنے اپنے گھر لے گئے۔ میں اور وقاص بھی ایک لڑکے کے ساتھ آ گئے۔ ہمارے ساتھ 50 اور لڑکے بھی تھے۔ سب سے بڑا ایجنٹ ہمارا ہی تھا۔

جس مکان میں یہ ہمیں لے کر آئے تھے یہ بہت بڑا دو منزلہ مکان تھا۔ اس میں تقریباً 10 کمرے تھے اور سبھی کمرے فل تھے۔ شامی اور عراقی فیملیاں بھی ادھر موجود تھیں۔ عورتوں اور بچوں کے لئے تین الگ کمرے تھے جبکہ باقی ہم سب کے لئے 6 کمرے تھے۔ ایک کمرہ ہاؤس انچارج اور ڈنکروں کے لئے تھا۔ ڈنکر دو تین گھنٹے ادھر لیٹ کر آرام کرتے، کھانا کھاتے اور پھر واپس چلے جاتے تھے۔ یہاں کمروں میں بہت سے تھری شوز لگے ہوئے تھے۔ ہمیں موبائل چارجنگ کی سہولت مل گئی تھی۔ ہم دونوں نے جلدی سے موبائل چارجنگ پر لگائے۔ میرے موبائل میں کافی پروگرام تھے، ہم دونوں مل کر وہ پروگرام دیکھنے لگے۔

یہاں پر پہلا مرحلہ ختم ہو جاتا تھا اور دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں کا ہاؤس انچارج اپنے اور پچھلے دونوں ڈنکروں کے پیسے ہمارے مین ایجنٹ سے یہیں وصول کرتا تھا اور پھر آگے سربیا والے ڈنکروں کے حوالے کر دیتا تھا۔ یہاں سے پیمنٹ کلیئر ہونے میں دو تین دن لگ جاتے تھے۔ ہم اس گھر میں تین دن تک رکے رہے۔ چوتھے دن شام کو ہاؤس انچارج نے ہمیں سربیا جانے والے قافلے میں شامل کر لیا۔ ہم 100 کے قریب تھے جبکہ 4 ڈنکر ہمارے ساتھ تھے۔ وہ ہمیں لے کر گاؤں سے باہر نکلنے لگے۔ ابھی رات کا اندھیرا نہیں ہوا تھا، شام کے 5 بج رہے تھے۔ اندھیرا ہونے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے۔ ڈنکر ہمیں پیدل چلاتے ہوئے گاؤں سے باہر آ گئے۔ گاؤں سے باہر ایک پہاڑی کی اوٹ میں انہوں نے ہمیں کھڑا کر دیا اور خود ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔

تقریباً 10 منٹ بعد ہمیں گاؤں سے دو ٹریکٹر ٹرالی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ دوونوں ٹریکٹر ہمارے پاس آ کر رکے تو ڈنکروں نے ہمیں ٹرالی میں سوار ہونے کو کہا۔ انہوں نے پچاس پچاس لڑکے ایک ایک ٹرالی میں سوار کروا دیئے۔ ٹریکٹر ہمیں لے کر اوپر پہاڑیوں کی طرف جانے لگے۔ دو گھنٹے کی مسلسل ڈرائیو نے ہمیں پہاڑیوں کے اوپر بالکل زیرو لائین سے محض ایک کلومیٹر پیچھے تک چھوڑ دیا۔

میں نے پاکستان میں مانسہرہ سے مظفرآباد اور مردان سے مینگورہ تک کا سفر کیا ہے۔ میں ان دونوں راستوں پر کوچز چلانے والے ڈرائیوروں کو دنیا کے خطرناک ترین ڈرائیور مانتا تھا لیکن یہاں ان ٹریکٹر ٹرالی والوں کو دیکھ کر میں واقعی ششدر رہ گیا تھا۔ میں نے ان سے بہتر ڈرائیور اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔ یہ دونوں واقعی کمال ڈرائیور تھے۔ بالکل کچہ راستہ تھا اور ساری ہی چڑھائی تھی۔ کچھ مقامات پر تو پتھر ٹوٹ کر راستہ بند کیئے ہوئے تھے۔ وہ ٹریکٹر کھڑا کرتے، راستہ صاف کر کے پھر آگے بڑھ جاتے۔ ٹریکٹر والوں نے ہمیں ایک پہاڑی کے دامن میں اتارا اور خود واپس چلے گئے۔ ابھی رات کا اندھیرا ہونا باقی تھا، ڈنکر ادھر ہی انتظار کرنے لگا۔

رات کو ٹھیک 9 بجے انہوں نے ہمیں اٹھایا اور آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے سامنے کوئی 200 میٹر اونچی پہاڑی تھی، ہم اس پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ دوسری طرف بارڈر تھا۔ 200 میٹر کی اس پہاڑی نے ہمیں توڑ کر رکھ دیا۔ 100 میٹر تک تو ہم جیسے تیسے کر کے اوپر چڑھ گئے لیکن اس سے مزید اوپر جانا ناممکن لگنے لگا۔ ڈنکروں نے سبھی بچوں کو کسی نہ کسی لڑکے کے کندھے پر سوار کرا دیا تھا۔ میرے اور وقاص دونوں کے کندھوں پر دو دو سال کا ایک ایک بچہ تھا۔ ہمارے ساتھ اس بچے کا والد، والدہ اور باقی ساری فیملی بھی ہوتی تھی۔ میں، لڑکے کا والد اور والدہ ہم تینوں باری باری بچے کو اٹھاتے تھے۔ ہمارے چاروں ڈنکر ایسا لگتا تھا جیسے کسی تبلیغی جماعت سے آئے ہوئے ہوں۔ اگر کوئی لڑکا مدد نہیں کرتا تھا تو وہ آگے سے اتنی باتیں سناتے تھے اور ڈراتے تھے کہ بندہ خود ہی مدد کرنے لگتا تھا۔

ہماری اس ڈنکی میں ساٹھ سال سے زیادہ کی بوڑھی عورتیں بھی سفر کر رہی تھیں۔ دو دو لڑکے ان عورتوں کے ساتھ اوپر چڑھتے تھے۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اوپر لے جاتے تھے۔ ڈنکر ہر 20 منٹ اوپر چڑھنے کے بعد آرام کرنے لگتے تھے۔ دو گھنٹے تک ہم پہاڑی کے اوپر چڑھ گئے۔ پہاڑی کے اوپر ہمیں دو آدمی نظر آئے جو سربیا سے آئے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ اس ایریے میں بارڈر کے دونوں طرف

البانوی مسلمان ہی رہتے تھے اور پورے جنگجو تھے۔ یہ انتہائی دشوار گزار پہاڑی علاقہ تھا اور یہاں پولیس یا بارڈر سیکورٹی فورسز کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ڈنکی کو روک کر لوٹنے والے البتہ یہاں ضرور تھے۔ شروع شروع میں بہت سی ڈنکیاں ادھر لوٹ لی گئی تھیں۔ ان سب سے بچنے کے لئے ڈنکروں نے ان دونوں کو ہائر کیا ہوا تھا۔ اگر کوئی ڈنکی کو روک کر لوٹنے کی کوشش کرتا تو یہ بلا دریغ گولی مار دیتے تھے۔ ڈنکر ان کو ایک ڈنکی کا سو سو یورو ادا کرتے تھے۔

ہم پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ یہاں سے پریسیو (Presevo) 6 کلومیٹر دور تھا اور ابھی ٹوٹل جنگل اور اترائی تھی۔ ہم جنگل میں داخل ہوئے تو مکمل اندھیرا ہو گیا تھا۔ یہاں اتنا اندھیرا اور گھنا جنگل تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈنکروں نے ہمیں ایک دوسرے کے بیگوں کی تنیاں پکڑنے کو کہا۔ بیگ ہم نے پیچھے پشت پر پہنے ہوئے تھے۔ ہمارے پیچھے والا لڑکا اس بیگ کی ایک رسی یا پھر ہمارے کپڑے کا کوئی کونا پکڑ لیتا تھا۔ سب سے آگے والے ڈنکر کے پاس چھوٹی پنسل ٹارچ تھی۔ وہ روزانہ بارڈر کراس کرتے تھے اور انہیں یہ راستہ زبانی یاد تھا۔ ٹارچ وہ راستے میں آنے والی جھاڑیوں وغیرہ کو دیکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ہماری ڈنکی نے چلنا شروع کیا اور ہم اندھوں کی طرح ایک دوسرے کو پکڑ کر چل رہے تھے۔ اتنا گپ اندھیرا تھا کہ ہمیں اگلا بندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تین گھنٹے تک مسلسل جنگل میں سفر کرتے کرتے آخر ہم باہر نکل آئے۔

یہاں چاند کی روشنی تھی اور سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک ہم صرف 30 لڑکے ہی پہنچ سکے تھے جبکہ باقی جنگل میں گم ہو گئے تھے۔ ہمارے ساتھ سب سے آگے والا ایک ڈنکر ہی پہنچا تھا۔ باقی ڈنکر لائین کے درمیان میں اور ایک پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جنگل میں اگر ایک بار ہاتھ چھوٹ جاتا ہے تو پھر دوبارہ آپ تلاش نہیں کر سکتے۔ اگلی ڈنکی جنگل میں آگے نکل جاتی ہے اور پیچھے والا لڑکا راستہ بھٹک کر دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ پھر اس لڑکے کے پیچھے ساری ڈنکی راستہ بھٹک جاتی ہے۔ پانچ دس منٹ تک تلاش کرنے کے بعد وہ لڑکا کھڑا ہو جاتا ہے تو پیچھے سب کو پتہ چل جاتا ہے کہ آگے والے راستہ بھول گئے ہیں اور پھر دوسرا ڈنکر آگے آ کر دوسری ڈنکی کو دوبارہ لے جانا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے ہی تیسرا اور پھر آخری ڈنکر لڑکوں کو جنگل سے باہر لے کر آتا ہے۔

ہم سربیا کے اندر پہنچ چکے تھے اور اب ایک کھیت کے کنارے پر کھڑے باقیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

ایک گھنٹے تک سبھی راستہ بھولنے والے آ گئے تو ایک ڈنکر نے ہماری گنتی کرنا شروع کر دی۔ہم 100 لوگ گھر سے نکلے تھے جبکہ یہاں 97 پہنچے تھے۔3 راستے میں کہیں گم ہو گئے تھے۔ابھی وہ ساری رات جنگل میں ہی بھٹکتے رہتے۔۔۔صبح بھیڑیں چرانے والے چرواہوں سے ہی ان کا سامنا ہوتا اور وہ ان سے پوچھ کر نیچے آ جاتے۔اس علاقے میں بھیڑوں کی بہتات تھی اور بھیڑیں اور ان کے پیچھے چرواہے پورے جنگل میں گھومتے رہتے تھے۔وہ صبح سربین پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے اور واپس مقدونیا ڈی پورٹ ہو جاتے۔

بارڈر کے اوپر پکڑے جانے کی صورت میں 100 فیصد ڈی پورٹ ہونے کا چانس ہوتا ہے۔یورپ کا کوئی بھی ملک بارڈر کے اوپر سیاسی پناہ نہیں دیتا ہے بلکہ واپس ڈی پورٹ کر دیتا ہے۔سربیا بھی تین دن کا سٹے دیتا تھا لیکن یہ سٹے بارڈر سے 10 کلومیٹر دور پریسیو شہر سے شروع ہوتا تھا۔پری سیو شہر سے پہلے اگر کوئی ڈنکی پکڑی جائے تو وہ مقدونیا ڈی پورٹ ہو جاتی ہے۔صبح پانچ بجے کے قریب ہم سب پری سیو شہر پہنچ گئے۔تین ڈنکر تو وہیں سے واپس چلے گئے جبکہ ایک ڈنکر ہمیں لے کر مین بس سٹاپ پر پہنچ گیا۔

''یار یہ تو سیدھا ہی شہر اور بس سٹینڈ پر لے کر آ گیا ہے۔۔۔اب تو پکا پکڑے جائیں گے۔'' وقاص نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ڈنکر نزدیک ہی کھڑا تھا، وہ سن کر مسکرانے لگا۔

''کچھ بھی نہیں ہو گا یار! یہاں پولیس نہیں آتی ہے۔ویسے بھی اگر پکڑے گئے تو تین دن کا سٹے مل جائے گا۔فکر مت کرو! اگر جرمنی تک کے پیسے لئے ہیں تو جرمنی پہنچا کر ہی دم لیں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

پہلی بس پانچ بجے والی نکل گئی تھی۔اب ہر ایک گھنٹے بعد ایک بس بلغراڈ (Belgrade) کے لئے نکلتی تھی۔ڈنکر کاؤنٹر پر گیا اور وہاں سے بلغراڈ کی ٹکٹیں لینے لگا۔اس کے پاس سربین کرنسی موجود تھی۔ٹکٹ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے ٹکٹ کے علاوہ 100 یورو لئے اور ہمیں دو بسوں کی ٹکٹیں دے دیں۔ڈنکر نے ہم سب کو ٹکٹیں تقسیم کر دیں۔وہ ہمیں ٹکٹ کے ساتھ ایک ایک ہزار سربین دینار بھی دے رہا تھا۔یہ بلغراڈ سے آگے سبوتیچا (Subtica) کی ٹکٹ کے پیسے تھے۔بلغراڈ سربیا کا دارالحکومت ہے اور یہاں پولیس کا خطرہ تھا۔وہ اکیلا اتنے آدمیوں کی ٹکٹ نہیں لے سکتا تھا کیونکہ ایسا کرتا تو انسانی سمگلنگ کے جرم میں پکڑا جاتا۔یہاں کا ٹکٹ کاؤنٹر پر بیٹھنے والا آدمی ان کا اپنا تھا۔وہ 100 یورو اضافی اسی چیز کا لیتا تھا جبکہ بلغراڈ میں یہ سب کچھ نہیں چلتا تھا۔اسی لئے اس نے ہم سب کو ایک ایک ہزار سربین دینار دے دیئے تھے تا کہ ہم خود ہی

ٹکٹ خرید کر سوتیچا پہنچ جائیں۔

ٹکٹیں چھ اور سات بجے کی تھیں۔ مجھے اور وقاص دونوں کو چھ بجے والی بس کی ٹکٹ ملی۔ پونے چھ بجے بس آئی تو اس نے ہم سب کو بس میں بٹھا دیا۔ بس چلنے سے پہلے وہ ایک ایک لڑکے کے پاس آیا۔ اس نے ہمیں تین مختلف نمبر لکھوائے اور انہیں سوتیچا کے نام پر سیو کرنے کا کہا۔ ہم نے بلغراڈ سے سوتیچا کی ٹکٹ لینی تھی اور سوتیچا پہنچ کر ان نمبروں میں سے کسی ایک نمبر پر فون کر کے اپنے آنے کی اطلاع دینی تھی۔

''یاد رکھنا! بس سٹینڈ سے باہر نکلتے ہی آپ نے بائیں ہاتھ پر جانا ہے۔ کوئی 500 میٹر کے بعد ایک پارک آئے گا، آپ اس پارک میں جا کر فون کرو گے تو وہ آپ کو آ کر لے لے گا۔ گھبرانا نہیں ہے! سربین پولیس اگر پکڑے گی بھی تو تین دن کا سٹے مل جائے گا۔ یہاں سے اب آپ واپس ڈی پورٹ نہیں ہو سکتے۔''

ڈنکر نے انگلش میں ہم سب کو سمجھایا اور باہر نکل گیا۔

ڈرائیور نے بس سٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ بس ٹرمینل سے باہر نکلنے لگا۔ پری سیو سے بلغراڈ تقریباً 340 کلومیٹر کا سفر ہے۔ بس نے چار گھنٹوں میں ہمیں بلغراڈ پہنچا دیا۔ بلغراڈ سرب زبان کا لفظ ہے جس کے معنی سفید شہر کے ہیں۔ یہ سابق یوگوسلاویہ اور ابھی سربیا کا دارالحکومت بھی۔ یہ شہر ترکی عثمانی خلافت میں بھی رہا ہے۔۔۔ بعد میں اس پر آسٹریا، یوگوسلاویہ اور پھر سربیا کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں کی مسلم آبادی بھی سپین کی طرح ہجرت کر کے بوسنیا چلی گئی اور آج یہ مکمل طور پر عیسائی شہر ہے۔ آدھے سے زیادہ یورپ پر ہم مسلمان حکومت کرتے رہے ہیں۔

ہماری کتابیں صرف سپین پر ہی مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت کی داستانیں سناتی ہیں جبکہ سپین سے بڑی عثمانی سلطنت تھی جس میں یونان، مقدونیا، البانیہ، رومانیہ، بلغاریہ، بوسنیا، کروشیہ، ہنگری، مالاووہ یوکرین کا کچھ حصہ اور آسٹریا کا کچھ حصہ شامل ہے۔ یہ صرف یورپین علاقے کی بات کر رہا ہوں جبکہ عثمانی سلطنت سعودی عرب سے شروع ہوتی تھی اور افریقہ تک جاتی تھی۔ افسوس! ہم ان عثمانیوں کو بھول گئے جنہوں نے آدھے یورپ کے اندر اسلام کے جھنڈے گاڑے تھے۔ ترکی آج بھی اسلام کی خدمت کر رہا ہے۔ یہ لوگ شیعہ اور سنی کا جھگڑا نہیں کرتے اور نہ ہی پیری فقیری کا کام کرتے ہیں۔ آج مسلم ممالک کا سب سے طاقت ور ترین ملک ترکی ہی ہے جو کسی بھی دوسرے اسلامی ملک کے خلاف کبھی کچھ نہیں بولتا۔۔۔ جبکہ باقی سبھی ممالک ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پاکستان بھی ترکی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مسلمان ممالک کے آپس کے جھگڑوں میں نہیں پڑتا لیکن پاکستان کو افغانستان ہی سانس نہیں لینے دے رہا ہے۔ انڈیا کی حد سے بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری ایک دن پاکستان کو افغانستان سے لڑوا دے گی اور ساری دنیا ہی جنگ کی لپیٹ میں آجائے گی۔ پاکستان انڈیا کے علاوہ اور کسی بھی ملک کو اپنا دشمن نہیں مانتا لیکن افغانستان فالتو میں ہی ایک نئی دشمنی کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ نفرت ان افغانیوں کے دماغ میں ٹھونس ٹھونس کر ڈالی جا رہی ہے۔ اگر پاکستان کا پشتون علاقہ افغانستان کا ہے تو پھر افغانستان کا فارسی علاقہ ایران کا اور تاجک بولنے والا علاقہ تاجکستان کا ہے۔ افغانستان پہلے اپنے فارسی، تاجک اور ازبک علاقے ان کے اصل ملکوں کو واپس کرے اور پھر ہم سے پشتون علاقہ واپس لے لے۔ پچھلے پچاس سال سے کوئی ایک بھی ملک ایسا نہیں ہے جس نے جنگ یا دہشت گردی سے کسی دوسرے ملک کی ایک انچ بھی زمین حاصل کی ہو۔

پاکستان اور انڈیا دونوں ایٹمی ملک ہیں اور پچھلے ستر سال سے لڑ رہے ہیں لیکن لائین آف کنٹرول کا ایک انچ حصہ بھی دائیں سے بائیں نہیں ہوا۔ افغانستان اگلے 100 سال بھی لڑتا رہے تو پھر بھی کچھ نہیں ہو گا۔ صرف دونوں ملکوں کے مسلمان فوجی ہی مرتے رہیں گے۔ ہماری انڈیا سے دشمنی ان افغانوں کی اہمیت بڑھا رہی ہے۔ جس دن ہماری انڈیا سے دوستی ہو گئی اس دن ان افغانوں کو کوئی منہ بھی نہیں لگائے گا۔ جس دن انڈیا اور پاکستان ایک دوسرے کے بھائی بن گئے ہمیں کسی تیسرے ملک کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ پچھلے 70 سال سے لڑ لڑ کر دونوں ملک تباہ ہو گئے ہیں۔ صرف ایک بار محبت سے چل کر بھی دیکھ لیں۔ محبت سے کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا۔ میں واپس بلغراڈ کی طرف چلا جاتا ہوں۔

بلغراڈ دریائے ساوا اور دریائے ڈینوب کے سنگم پر واقع ہے۔ اس شہر کی آبادی 15 لاکھ سے زیادہ ہے۔ دریائے ڈینوب یورپ کا دوسرا سب سے لمبا دریا ہے۔ یہ جرمنی کے کالے جنگلات سے نکلتا ہے اور دس ملکوں سے ہوتا ہوا بحیرہ اسود میں جا گرتا ہے۔ اس دریا کی لمبائی 2860 کلومیٹر ہے۔ بلغراڈ بہت خوبصورت شہر تھا۔ یہاں کا بس سٹیشن دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا اور چاروں طرف سے مکمل بند تھا۔ اس کے اندر تقریباً 8 کے قریب دروازے تھے۔ آپ باہر مطلوبہ شہر کے کاؤنٹر سے جا کر ٹکٹ خریدتے ہو اور پھر ٹکٹ دکھا کر ہی سٹیشن کے اندر جا سکتے ہو۔ بالکل ایئرپورٹ کی طرح پورے اسٹیشن کے اردگرد مختلف چھوٹی چھوٹی دکانیں اور ریسٹورنٹ تھے۔ مین اسٹیشن کے اندر صرف ٹکٹ والے لوگ ہی جا سکتے تھے، جنہوں نے سفر

کرنا ہوتا ہے۔ مہمانوں کو رسیو کرنے والے میزبان بھی اسٹیشن سے باہر ہی انتظار کرتے ہیں۔ میں نے اور وقاص نے سوتیچا کی ٹکٹ لی اور اندر چلے گئے۔ ہمارے ساتھ دوسرے بھی لڑکے تھے۔ یہاں سے ہر آدھے گھنٹے بعد بس سوتیچا جاتی تھی۔ بلغراڈ سے سوتیچا 180 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم دو گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔

ڈیڑھ لاکھ کی آبادی والا یہ شہر سربیا کا آخری سرحدی شہر تھا۔ یہاں سے ہنگری کا بارڈر صرف 10 کلومیٹر دور تھا۔ ہنگری یورپی یونین کا پہلا ملک ہے۔ یہاں سیاسی پناہ مل جاتی ہے۔ اس ملک کا مزاج بھی یورپ کے موسم کی طرح بدلتا رہتا تھا۔ یہ چھ مہینے سیاسی پناہ دیتا تھا تو چھ مہینے ڈی پورٹ کرنا شروع کر دیتا تھا۔ سیاسی پناہ مل رہی ہو تو ایجنٹ جرمنی کا 2 ہزار لیتے تھے لیکن اگر ہنگری ڈی پورٹ کر رہا ہو تو ریٹ 2 ہزار سے بڑھ کر ڈبل یعنی 4 ہزار یورو ہو جاتا تھا۔ ہنگری کی سیکورٹی بہت سخت تھی۔ ایجنٹ ٹیکسیوں کے ذریعے پورے ہنگری کو کراس کرواتے تھے۔ سو میں سے ستر فیصد گیمیں کامیاب ہوتی تھیں اور تیس فیصد پکڑی جاتی تھیں۔ جو سیدھی یونان ڈی پورٹ ہوتی تھیں اور وہاں سے پھر نئے سرے سے دوبارہ ڈنکی شروع ہو جاتی تھی۔ ابھی ہنگری سیاسی پناہ دے رہا تھا۔ ڈنکی بارڈر سے 10 میٹر اندر سے بھی پکڑی جاتی تو تب بھی ہنگری سٹے دے دیتا تھا۔

میں اور وقاص سوتیچے کے بس اڈے سے باہر نکل کر پارک میں آ گئے۔ میں نے موبائل سے ڈنکر کے دیئے ہوئے نمبر پر کال کی، دوسری طرف پاکستانی لڑکا ہی تھا۔ اس نے ہمیں ادھر ہی بیٹھنے کا کہا اور وہ آدھے گھنٹے تک ادھر پہنچ گیا۔ اس نے ہم سب لڑکوں کو لیا اور شہر سے باہر جنگل کی طرف لے گیا۔ یہ جنگل بارڈر کے دونوں طرف تھا۔ وہ ہمیں جنگل میں کوئی ایک کلومیٹر اندر تک لے گیا۔ یہاں پورا جنگل ہی مہاجرین سے آباد تھا۔ یہاں کم از کم بھی تقریباً ایک ہزار کے قریب مہاجرین تھے۔ یہاں پر بلغاریہ کی طرف سے بھی ڈنکیاں آتی تھیں۔ کچھ لوگ ترکی سے یونان جانے کی بجائے سیدھا بلغاریہ جاتے تھے اور پھر بلغاریہ سے سربیا کا بارڈر کراس کر کے ادھر پہنچ جاتے تھے۔

اس جنگل میں ہر رنگ اور ہر نسل کا باشندہ موجود تھا۔ پولیس نے ایک دو بار یہ علاقہ خالی کرانے کی کوشش کی تھی لیکن یہ لوگ جنگل میں مزید اندر کی طرف بھاگ جاتے اور حالات ٹھیک ہونے کے بعد پھر واپس آ جاتے تھے۔ پولیس پکا پکا ادھر ڈیرہ لگاتی تو وہ دوسری جگہ پر چلے جاتے اور ادھر سے جنگل گندہ اور خراب کرنا شروع کر دیتے، پولیس تنگ آ کر واپس چلی جاتی۔ یہاں سے روزانہ چار پانچ سو لوگ بارڈر کراس

کر کے ہنگری پہنچتے تھے۔ ابھی رات ہونے کو کافی وقت تھا اس لئے ہمارے ساتھ آنے والے ڈنکر نے ہمیں ادھر ہی لیٹنے کا کہا اور خود واپس چلا گیا۔

رات کو دس بجے انہوں نے ہمیں اکٹھا کیا اور جنگل میں آگے ہنگری کی طرف لے جانے لگے۔ ہم 100 کے قریب لوگ تھے اور ہمارے ساتھ تین ڈنکر تھے۔ وہ ہمیں تین گھنٹے تک مسلسل آگے بڑھاتے رہے اور آخر کار ایک جگہ پر جا کر رک گئے۔

''یہاں سے بالکل سیدھے اگر چلے جاؤ گے تو آگے 200 میٹر کے قریب بارڈر ہے۔۔۔ یہاں پورے بارڈر کے ساتھ ساتھ نالہ بہتا ہے۔ بالکل سیدھے جاؤ گے تو نالے کے اوپر بنا ہوا پل نظر آجائے گا، پل کراس کرو گے تو آگے ہنگری شروع ہو جاتا ہے۔ آپ سیدھے ہی آگے بڑھتے جاؤ گے تو ہنگری پولیس آپ کو پکڑ کر لے جائے گی اور ہنگری کا سٹے مل جائے گا۔'' ڈنکر نے ہمیں سمجھاتے ہوئے کہا اور وہ تینوں ہمیں ادھر ہی چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

ڈنکر اس سے آگے نہیں جاتے تھے کیونکہ ان سب کے ہنگری میں فنگر پرنٹس تھے۔ اگر وہ ادھر بارڈر پر پکڑے جاتے تو انسانی سمگلنگ کا کیس بن جاتا۔ اس لئے وہ لڑکوں کو 200 میٹر بارڈر سے دوری پر چھوڑ کر واپس چلے جاتے تھے۔ ہنگری پولیس بارڈر سے بھی پکڑ لیتی تو تب بھی لے جاتی تھی۔۔۔ سربین پولیس ادھر آتی ہی نہیں تھی۔ ابھی تو ہنگری نے تار لگا کر پورا بارڈر ہی سیل کر دیا ہے اور کوئی بھی ڈنکی ہنگری سے نہیں گزر رہی ہے ورنہ اس وقت تو سارا علاقہ اوپن ہی تھا۔ ہم سب لڑکے جنگل میں سیدھا آگے بڑھنے لگے۔

یہاں فاصلہ کافی زیادہ تھا، ہم لوگ راستے سے بھٹک گئے اور سیدھا جانے کی بجائے تھوڑا سا بائیں طرف کو کٹ لگ گیا۔ جو آگے بارڈر پر جاتے جاتے بہت زیادہ ہو گیا۔ ہم پل کو تلاش کرتے کرتے مزید بھٹک گئے اور پھر ایک دوسرے کی مانتے ہوئے مزید بھٹکتے ہی چلے گئے۔ یہاں جنگل میں بارڈر بالکل سیدھا ہونے کی بجائے ٹیڑھا میڑھا تھا۔ ہم کبھی ہنگری چلے جاتے اور کبھی واپس سربیا آجاتے۔ لڑکے گروپوں کی صورت میں اپنی اپنی مرضی سے راستہ تلاش کرنے لگے۔ میں اور وقاص بھی ایک گروپ میں شامل ہو گئے۔ ہم تقریباً 30 کے قریب لوگ تھے۔۔۔ سات پاکستانی اور باقی ساری شامی فیملیاں تھیں۔ باقی سبھی نوجوان لڑکے ان سے الگ ہو گئے تھے۔ عورتیں اور بچے چونکہ نالہ کراس نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ سب بھی ہمارے ساتھ کسی پل کی تلاش کر رہے تھے جبکہ باقی نوجوان نالہ کراس کر کے ہنگری میں داخل ہو گئے تھے۔

میں نے موبائل آن کیا اور اس کی مدد سے بارڈر پر موجود نالہ دیکھنے لگا۔۔۔لیکن یہ سارا نقشہ ہی غلط تھا۔اس پورے علاقے میں تین چار نالے تھے اور وہ سبھی ہنگری کے اندر ہی بہتے تھے۔ بارڈر کے اوپر والے نالے کا کوئی بھی پل نقشے پر نہیں تھا۔ ہم صبح 5 بجے تک مسلسل تلاش کرتے رہے لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ دن کی روشنی میں سربین پولیس لازمی پکڑ لیتی اور واپس ڈی پورٹ کر دیتی۔ مجھے بھی اب ڈر لگنے لگا تھا۔

''راضی بھائی! نالہ کراس کرتے ہیں اور ہنگری چلے جاتے ہیں۔ یہ سارے شامی ہیں، انہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔۔۔ادھر بھی پکڑے گئے تو تب بھی سربیا والے انہیں سٹے دے دیں گے لیکن ہم ساتوں کو واپس یونان ڈی پورٹ کر دیں گے۔'' وقاص نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یار! بات تو تمہاری ٹھیک ہے، ان کے ساتھ پکڑے گئے تو آ یجنٹی کا کیس بھی بن جائے گا۔'' آخر میں ایک جگہ پر رک گیا۔

میں نے ان سب کو اکٹھا کیا اور بتایا کہ میں پہلے نالہ کراس کر کے دوسری طرف جاتا ہوں اور پھر واپس آ کر بتاؤں گا کہ نالے کی کتنی گہرائی ہے۔ پل ہمیں ساری رات نہیں ملے گا اور اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں نے ان کو بتایا اور خود نالے میں اتر گیا۔ یہاں نالہ صرف نچلے دھڑ تک ہی گہرا تھا اور کوئی 20 فٹ کے قریب چوڑا تھا۔ میں آسانی سے نالہ کراس کر کے دوسرے طرف اتر گیا۔ یہاں پر ایک اور نالہ تھا جو تقریباً 60 فٹ کے قریب چوڑا تھا۔ میں اس نالہ میں اترا اور دوسری طرف چلا گیا، یہاں کا پانی گلے تک آ رہا تھا۔ یہاں نالے کے دوسری طرف ایک کچا روڈ جا رہا تھا۔

میں دوبارہ واپس آ گیا اور ان کو آ کر پانی کا بتایا اور پھر وہ سبھی نالے میں جانے کے لئے مان گئے۔ میں نے ایک بچے کو کندھے پر بٹھایا اور آہستہ آہستہ دوسری طرف جانے لگا۔ میرے پیچھے پیچھے باقی دوسرے بھی آنے لگے اور آہستہ آہستہ ہم سب نالے کو کراس کر کے دوسری طرف آ گئے۔ دوسرا نالہ زیادہ گہرا تھا لیکن پھر بھی ہم احتیاط سے اسے بھی کراس کر گئے۔ دوسری طرف کچی سڑک تھی، ہم اس سڑک پر چلتے ہوئے بارڈر سے مزید اندر کی طرف دور ہونے لگے۔ چلتے چلتے ہم جنگل سے باہر پکی سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑک آگے جا کر بڑی سڑک سے مل جاتی تھی جو سیگڈ کی طرف جاتی تھی۔ سیگڈ ہنگری کا پہلا سرحدی شہر تھا اور یہاں کی پولیس ہی پکڑتی تھی اور پھر سیاسی پناہ مل جاتی تھی۔ ہم کو ابھی صرف پولیس کا انتظار تھا۔ دن کی روشنی پھیل گئی تھی اور ہم پکی سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے پولیس کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ ہمیں پکڑ کر امیگریشن کیمپ

میں لے جائیں۔

دن کو دس بجے کے قریب ایک پولیس کی کار کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ سیدھے ہمارے پاس آئے اور ہمیں سڑک کی ایک طرف بٹھا دیا اور وائرلیس پر پیچھے ہیڈ کوارٹر بات کرنے لگے۔ تا کہ کوئی بڑی وین آئے اور ہمیں امیگریشن کیمپ میں منتقل کیا جائے۔ ہم سب آرام سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ پولیس والے ہماری طرف سے مطمئن تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ ہم کہیں بھی نہیں بھاگیں گے۔ ہم تو خود ان کا انتظار کر رہے تھے تا کہ سیاسی پناہ حاصل کر سکیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی پولیس کی ایک بڑی وین آ گئی اور وہ ہمیں لے کر امیگریشن کیمپ آ گئی۔ یہاں ہمیں تین دن رکھا گیا۔۔۔ ہمارے فنگر پرنٹس، تصویریں، نام اور پتہ سب کچھ لکھا گیا۔

ہم تین دن تک مسلسل کیمپ میں قید رہے۔ پھر سب کو ہنگری کا پولیٹیکل سٹے، بڑاپسٹ کی ٹرین کی ٹکٹ اور مہاجرین کے ایک کیمپ کا ایڈریس دیا گیا تا کہ ہم وہاں رہ سکیں۔ یہاں سے سب کو اکٹھا نہیں چھوڑا جاتا تھا بلکہ ہر گھنٹے بعد دس پندرہ لڑکوں کو چھوڑا جاتا تھا۔ ہنگری میں اس وقت مہاجرین کے دو بڑے کیمپ تھے۔ ان میں ایک بڈاپسٹ کے قریب تھا اور دوسرا ڈیبرین میں تھا۔ بڈاپسٹ سلووکیہ کے قریب تھا اور ڈیبرین رومانیہ کے نزدیک تھا۔ ہم دونوں کو بڈاپسٹ کا کیمپ ملا تھا۔ سیگڈ سے بڈاپسٹ تقریباً 180 کلومیٹر دور ہے۔ ہم ٹرین کے ذریعے شام 4 بجے کے قریب بڈاپسٹ پہنچ گئے۔ یہاں سے ہمیں 35 کلومیٹر دور بسکے کیمپ جانا تھا۔ ہم ریلوے سٹیشن سے باہر نکلے اور ایک میٹرو پکڑ کر بسکے پہنچ گئے۔

یہ آرمی کا کوئی پرانا ٹریننگ کیمپ تھا جسے اب مہاجرین کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس کیمپ میں تقریباً پانچ ہزار کے قریب لوگ رہ رہے تھے۔ کیمپ کے سبھی گراؤنڈز میں کپڑے کے ٹینٹ لگے ہوئے تھے۔ سارے کمرے فل تھے اور ٹینٹ بھی بھرے ہوئے تھے۔ ہمارا نمبر ایک باسکٹ بال گراؤنڈ کے اندر عمارت میں لگا۔ یہاں ہمیں دو دو چادریں اور ایک ایک تکیہ دے دیا گیا۔ ایک چادر نیچے بچھانے کے لئے اور ایک اوپر اوڑھنے کے لئے۔۔۔ عمارت کے اندر پلاسٹک کے میٹ پڑے ہوئے تھے۔ ہنگری کی گورنمنٹ ہمیں تین وقت کا کھانا دیتی تھی جبکہ ہماری سیاسی پناہ کی درخواست ہنگری کے امیگریشن ڈیپارٹمنٹ میں چلی گئی تھی۔ اس درخواست پر فیصلہ آنے میں ایک سال لگ جاتا تھا۔ یہاں روزانہ ہزاروں لڑکے پہنچ رہے تھے اور ان سب کے کیس کو سننے کے لئے بہت ٹائم درکار ہوتا تھا۔ یہاں پہنچنے والے سبھی مہاجرین آگے جرمنی یا اٹلی کے لئے آتے تھے۔ کوئی بھی یہاں رہ کر اپنا فیصلہ نہیں سننا چاہتا تھا۔

ہنگری یورپی یونین کے غریب ترین ملکوں میں سے ایک ہے اور یہاں مہاجرین کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔اس لئے سبھی مہاجرین صرف یہاں کچھ دن قیام کرتے تھےاور پھرآگے نکل جاتے تھے۔ویسے بھی ہنگری کی امیگریشن پالیسی کافی سخت تھی۔یہ ملک زیادہ تر مہاجرین کے کیس مسترد کردیتے تھے۔ہم نے ایک کونے میں چادریں بچھائیں اور پھر ایجنٹ کو فون کیا۔اس نے ہمیں رات ادھر ہی گزارنے کا کہا اور دوسرے دن شام کو سات بجے بڈاپسٹ کے مین ٹرین اسٹیشن پہنچے کا کہا۔رات کو کھانا ان لوگوں نے آٹھ بجے کے قریب دیا۔ہمیں کیمپ والوں نے ایک کارڈ دیا ہوا تھا، یہ الیکٹرونک کارڈ تھا۔اسی کارڈ کی مدد سے ہم کیمپ سے باہر اور اندر آجا سکتے تھے۔کھانا بھی اسی کارڈ پر ملتا تھا۔کچن میں ایک آدمی کمپیوٹر کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ہم اسے اپنا کارڈ دیتے تو وہ کارڈ کو مشین میں پنچ کرتا اور پھر آگے کھانا لینے والوں کی لائین میں بھیج دیتا۔

ہم نے رات وہیں گزاری اور دوسرے دن چھ بجے کے قریب ہی بڈاپسٹ پہنچ گئے۔اس شہر کے بیچوں بیچ دریائے ڈینوب گزرتا ہے۔یہ وہی دریا ہے جو بلغراڈ سے بھی گزر کر آگے بلغاریہ اور رومانیہ کے بارڈر پر چلتا ہوا یوکرین اور پھر بلیک سی میں جا گرتا ہے۔بڈاپسٹ یورپ کے چند مین ترین شہروں میں سے ایک ہے۔یہ شہر بہت خوبصورت ہے، یہاں پر آپ کو ہر طرف چرچ ہی چرچ نظر آئیں گے۔یہ تاریخی اور بہت پرانے چرچ ہیں لیکن رات کو جب ان کو روشن کیا جاتا ہے اور دریا کے کنارے پر کھڑے ہو کر ان کو دیکھنے کا جو نظارہ ہے وہ شاید آپ کو پوری دنیا میں کہیں بھی نہیں ملے گا۔دریا کے اوپر سے یہ روشنیاں اتنی پیاری لگتی ہیں۔۔۔شاید اس خوبصورتی کے لئے میرے پاس کوئی الفاظ نہیں ہیں۔جو سیاح بھی ایک بار بڈاپسٹ آجاتا ہے وہ ساری زندگی اسی شہر کی خوبصورتی کے سحر میں گرفتار رہتا ہے۔

ہم چھ بجے کے قریب ہی اسٹیشن کے پاس آکر بیٹھ گئے اور ایجنٹ کا انتظار کرنے لگے۔ایجنٹ کا فون ہمیں رات کو گیارہ بجے کے قریب آیا، ہم انتظار کر کر کے تھک گئے تھے۔میں نے بے خبری میں فون اٹھایا تو اس نے آگے سے بتایا کہ آج کی گیم کینسل ہوگئی ہے۔پولیس کو شک ہو گیا تھا اور وہ ایجنٹ کی گاڑی کے پیچھے لگ گئی تھی۔اس لئے اس نے آج کی گیم کینسل کردی تھی۔کیمپ ہم سے 35 کلومیٹر دور تھا اور ٹرین کی ٹکٹ بہت مہنگی تھی۔ویسے بھی ایک دن کی ہی تو بات تھی۔۔۔ہم نے رات ادھر ہی گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔میرے اور وقاص کے علاوہ مزید تین لڑکے اور تھے۔ہم سب رات گزارنے کے لئے اچھی سی جگہ دیکھنے لگے۔

یہاں سے دریا 3 کلومیٹر دور تھا۔اسٹیشن سے ہر 5 منٹ کے بعد ٹرام دریا کی طرف جاتی تھی۔ہمیں

ادھر دریا کے کنارے پر سونے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش تھی، اس لئے ہم سب دریا کی طرف جانے کے لئے ٹرام میں بیٹھ گئے۔ ٹرام کے اندر کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں پر بھی وہی یونان والا ماہانہ پاس یا پھر ڈیڑھ گھنٹے والا ٹکٹ کا سسٹم تھا۔ ٹکٹ چیک کرنے والے اگر بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے ہوئے پکڑ لیتے تو جرمانہ کرتے تھے۔ چونکہ ہم مہاجرین کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ صرف ٹرام روک کر نیچے اتار دیتے تھے، اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ مہاجرین پیدل چلتے ہوئے اگلے سٹاپ پر پہنچتے اور پیچھے سے دوسری آنے والی ٹرام میں بیٹھ جاتے۔ مجھے دو بار ٹکٹ نہ ہونے کی وجہ سے ٹرام سے نیچے اتارا گیا۔ ہم سب لڑکے دریا کے کنارے پر پہنچ گئے تھے۔

یہاں پر دریائے ڈینوب کے اندر ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ مرگارٹ (Margaret) جزیرہ 2.8 کلومیٹر لمبا اور 530 میٹر چوڑا تھا۔ اس جزیرے کا ایک بڑا حصہ پارک پر مشتمل تھا جس میں بڑے بڑے درخت لگے ہوئے تھے۔ ہم سب اس پارک کے ایک چھوٹے سے گراؤنڈ میں آ کر لیٹ گئے۔ رات 2 بجے تک تو موسم ٹھیک رہا لیکن اس کے بعد سردی شروع ہوگئی۔ یہاں ہر طرف دریا کا یخ ٹھنڈا پانی تھا۔ ہوا جب اس کے اوپر سے ہو کر آتی تو ہڈیوں کے اندر بھی سردی لگنے لگتی۔ میں اور وقاص ساری رات ایک دوسرے کے ساتھ لیٹے ٹھٹھرتے رہے۔

صبح 6 بجے شہری بلدیہ والے آ گئے اور انہوں نے ہمیں ادھر سے اٹھا دیا۔ دن کو ہم ادھر نہیں لیٹ سکتے تھے۔ ہم سب دوبارہ اسٹیشن پر آ گئے۔ بھوک سبھی کو لگی ہوئی تھی لیکن پیسے کوئی بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔ یہ لوگ جرمنی کی حدود تک ہی پہنچاتے تھے۔ آگے ہم نے خود ہی کرایہ لگا کر جانا تھا اور پیسے جرمنی کے لئے بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔ وقاص اٹلی جاتا اور اٹلی سے آگے پیرس جانا تھا۔ اس کو بہت زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی۔ جبکہ مجھے ہیل براؤن (Heilbrown) خلیل کے پاس جانا تھا اس لئے ہم سب پیسے بچا رہے تھے۔ میں ایجنٹ کو فون کرنے لگا لیکن اس کا فون آف جا رہا تھا۔ ہم ایک بار پھر ایجنٹ کا انتظار کرنے لگے۔

رات کو بھی تقریباً ساری رات جاگتے ہی گزری تھی اور اب بھی بہت نیند آ رہی تھی لیکن سو نہیں سکتے تھے۔ نیند اور بھوک دونوں تنگ کر رہی تھیں لیکن ہمارے پاس دونوں چیزوں کا کوئی حل نہیں تھا۔ شام کو سات بجے ایجنٹ کا فون آیا اور اس نے ہمیں ٹرام پکڑ کر بدائی (Budai) پہنچنے کا کہا۔ یہ بڈاپسٹ کے ایک سٹاپ کا نام تھا۔ جزیرہ اسٹیشن سے شمال کی طرف تھا جبکہ یہ سٹاپ جنوب کی طرف دریا کو کراس کر کے دوسری طرف

تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ایک پارک تھا جو بالکل ویران سا تھا۔ پارک کے بیرونی کنارے پر درختوں کے چھوٹے چھوٹے کافی گراؤنڈ تھے۔ ہم ٹرام میں بیٹھ کر ادھر آئے تو یہاں پر پہلے سے ہی کافی لڑکے لیٹے ہوئے تھے۔ یہاں کم از کم 50 کے قریب لڑکے تھے اور سبھی آگے جانے کے لئے ایجنٹوں کا انتظار کر رہے تھے۔

رات کو ایک بجے کے قریب ایک بڑی وین آئی جو اٹلی کے لئے تھی۔ لڑکوں کو جنگل کے اندر کی طرف لے جایا گیا اور ایک اندھیرے گوشے سے وین میں بٹھا دیا گیا۔ یہ سب اٹلی جانے والے تھے۔ اس وقت اٹلی چھ مہینے کے اندر اندر ویزہ دے دیتا تھا جبکہ جرمنی 350 یورو اور رہائش تو دیتا تھا لیکن کیس کا فیصلہ آنے میں تین تین سال لگ جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر لڑکے اٹلی جانے کی کوشش کرتے تھے۔ جرمنی دوسرے نمبر پر آتا تھا۔ بعد میں جرمنی نے سہولتیں زیادہ کر دیں تو مہاجرین اٹلی کو چھوڑ کر جرمنی جانے لگے۔ وقاص مجھے چھوڑ کر اٹلی چلا گیا تھا جہاں سے وہ اپنے دوست کے پاس جاتا اور پھر فرانس نکل جاتا۔ ہمارے لئے گاڑی کا انتظام نہ ہوسکا اور ہم 5 لڑکے واپس پارک میں آ گئے۔

اس رات ہم اس پارک میں ہی سوئے رہے۔ دن کو بلدیہ کا کوئی بھی ملازم اس طرف نہیں آیا تھا اس لئے ہم آرام سے بارہ بجے تک سوتے رہے۔ وین میں زیادہ جگہ نہیں ہوتی ہے اس لئے وہ لڑکوں کے بیگ اور فالتو چیز ساتھ نہیں لے کر جاتے۔ لڑکوں کو سارا سامان ادھر ہی پھینکنا پڑا تھا۔ ہم نے وہاں سے گرم پکڑے اٹھا لیے تھے اور رات کو چار پانچ کپڑے پہن کر سوتے تھے۔ اس سے ہم سردی کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو گئے، بھوک البتہ ابھی بھی لگی ہوئی تھی۔ ہم میں سے ایک لڑکا کافی تیز طرار اور غصے والا تھا۔ اس نے یونان میں ایجنٹ کو فون کر کے کافی گالیاں نکالیں۔ وہ مین ایجنٹ کو پیچھے پاکستان سے بھی جانتا تھا۔ اس کی گالیوں اور دھمکیوں کا اثر ہوا اور 4 بجے کے قریب ایک آدمی ہمیں کھانا کھلانے کے لئے آ گیا۔ اس نے ہم پانچوں کو لیا اور ایک ترکی ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ یہاں بہت اچھا شوارما ملتا تھا۔ اس نے ہمیں دو دو شوارمے لے کر دیئے جنہیں ہم نے ادھر ہی بیٹھ کر کھا لیا۔ یہاں شوارمے کو افکا (Ufka) بولا جاتا ہے۔ شاید یہ ترکی لفظ ہے کیونکہ جرمنی میں بھی اسے افکا ہی بولا جاتا ہے۔

اس رات ہمیں لینے کے لئے ایک جرمن کار آ گئی۔ وہ کالے رنگ کی ولکس ویگن کار تھی۔ یہ جرمنی کی کمپنی ہے اور جرمنی میں زیادہ تر یہی کار استعمال کی جاتی ہے۔ ہم ابھی کار میں بیٹھنے ہی لگے تھے کہ اچانک

پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔ ایک پولیس کار انتہائی سپیڈ سے ہمارے پاس آ کر رکی۔ ڈرائیور نے ہمیں چیخ کر بھاگنے کا کہا اور ہم سب جنگل کی طرف بھاگ گئے۔ اس پولیس کار کے پیچھے ایک اور پولیس کار پہنچ گئی تھی۔ پولیس والے ہمارے پیچھے بھاگے لیکن اس سے پہلے ہی ہم جنگل میں غائب ہو چکے تھے۔ ڈرائیور البتہ پکڑا گیا لیکن چونکہ ڈرائیور پاکستانی نژاد جرمن تھا، اس کے پاس جرمن پاسپورٹ تھا اور ہنگری کی پولیس کے پاس اس کے خلاف کوئی بھی ثبوت نہیں تھا اس لئے وہ آسانی سے چھوٹ گیا۔ پولیس کی اس کاروائی سے ڈرائیور ڈر گیا اور وہ لڑکے لئے بغیر ہی واپس جرمنی چلا گیا۔

ہم اس کے بعد مزید چار دن تک ادھر ہی پڑے رہے لیکن کوئی بھی ڈرائیور نہ مل سکا۔ ایک بار ایجنٹ نے ٹرین کے ذریعے جرمنی بھجوانا چاہا لیکن ہم آسٹریا کے بارڈر پر چیک ہو گئے۔ انہوں نے ہمیں ٹرین سے نیچے اتارا اور دوسری ٹرین سے واپس بڈاپسٹ بھیج دیا۔ پورے ایک ہفتے تک ہم بڈاپسٹ میں ہی گھومتے رہے۔ ہر روز شام کو 4 بجے کے قریب ایجنٹ کا ایک آدمی دو دو شوارمے آ کر دے جاتا جنہیں ہم کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھا لیتے تھے۔ ان سات دنوں میں ہم نے پورے بڈاپسٹ کا ایک ایک کونا بھی دیکھ لیا۔ ہم روزانہ بارہ بجے اٹھتے اور پھر کوئی بھی ٹرام پکڑ کر شہر میں گھومنا شروع کر دیتے۔ اگر کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا اوپر چڑھتا تو ہم نیچے اتر جاتے۔

یہاں بڈاپسٹ میں پولیس نے انتہائی سختی کر دی تھی اس لئے ادھر سے کوئی بھی گاڑی نہیں نکل رہی تھی۔ ہم بھی ایک ہفتے تک مسلسل انتظار کرتے کرتے آخر تنگ آ گئے تھے اور روزانہ ہی ایجنٹ کو گالیاں دیتے تھے۔ آخر ایجنٹ نے ہمیں ایک لمبی گیم کروانے کا فیصلہ کر لیا اور ہمارے اٹھنے سے پہلے ہی کھانا دینے والا آدمی آ گیا۔ اس نے ہمیں ہنگری کے ایک اور شہر گیور (Gyor) کی ٹکٹیں دی اور ہم سب ٹرین پر بیٹھ کر گیور آ گئے۔ ہنگری کا یہ شہر آسٹریا کے بارڈر پر واقع ہے۔ اسٹیشن پر ہی ایک آدمی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہمیں لیکر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں آ گیا۔ اس نے ہوٹل کا ایک کمرہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔ وہ رات ہم نے اس ہوٹل کے کمرے میں ہی گزاری۔

صبح 4 بجے کے قریب ڈرائیور کا فون آیا۔ اس نے ہمیں باہر آنے کو کہا۔ باہر وہی آدمی کھڑا تھا جو ہمیں اسٹیشن سے لے کر آیا تھا۔ وہ ہم سب کو لے کر چلنے لگا۔ تقریباً دس منٹ پیدل چلنے کے بعد ہم ایک چھوٹی سی گلی میں آ گئے جہاں ایک کار کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے ہمیں دیکھتے ہی ڈگی کھولی اور دو لڑکوں کو ڈگی میں لٹا دیا

جبکہ باقی تین کار کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ اگلی سیٹ پر پہلے ہی ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کی اور ہمیں لے کر آسٹریا کے بارڈر کی طرف بڑھنے لگا۔

گیور سے سلواکیہ کا بارڈر 10 کلومیٹر جبکہ آسٹریا کا بارڈر 50 کلومیٹر دور ہے۔ آدھے گھنٹے میں ہی ہم آسٹریا کے بارڈر پر پہنچ گئے۔ یہاں کوئی پولیس کی سرحدی چیک پوسٹ نہیں تھی۔ بارڈر بالکل اوپن تھا اور پولیس کا کہیں بھی کوئی نام ونشان نہ تھا۔ یہاں سے ویانہ مزید 70 کلومیٹر آگے تھا۔ ڈرائیور ڈیڑھ گھنٹے میں ہمیں گیور سے ویانہ (Vienna) لے گیا۔ ویانہ آسٹریا کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر کی آبادی 30 لاکھ کے قریب ہے اور یہ شہر دریائے دینوب کے کنارے پر واقع ہے۔ ویانہ شہر میں دریا دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، دونوں حصے شہر کے بیچوں بیچ سے گزرتے ہیں اور آگے جا کر پھر ایک ہو جاتے ہیں۔ دریائے دینوب کا ذکر میں پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوں۔ اب تو آپ کو اس دریا کا نام زبانی یاد ہو گیا ہوگا۔ یہ دریا جرمنی تک چلتا ہے اور میرے مطلوبہ شہر ہیل براؤن سے محض 50 کلومیٹر دور سے ہو کر گزرتا ہے۔

ڈرائیور نے ہمیں ویانہ شہر میں لے جانے کی بجائے باہر باہر سے ہی شہر کو کراس کیا اور کار کو ایک چھوٹے روڈ پر ڈال کر مین روڈ سے نیچے اتر گیا۔ یہ سڑک کسی گاؤں کی طرف نکلتی تھی۔ ہمارے دونوں طرف کھیتوں کا لاتعداد سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ ہمیں لے کر ایک ڈیرے پر آ گیا۔ اس نے ہمیں ڈیرے پر موجود ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھایا اور خود گاڑی لے کر آگے چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ہم نے وہاں انتظار کیا تو ایک اور کار والا آ گیا۔ اس کار والے نے بھی دو لڑکوں کو ڈگی میں ڈالا اور باقیوں کو کار میں بٹھا کر چل پڑا۔ میں اس بار گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی ویانہ سے نکلی اور سالزبرگ (Salzburg) کی طرف چلنے لگی۔

یہ 300 کلومیٹر کا سفر تھا اور مکمل پہاڑی علاقہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف سرسبز و شاداب اونچے اونچے پہاڑ بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ سڑک کے ایک طرف دریائے دینوب بھی کبھی کبھی نظر آ جاتا تھا جو سڑک کے ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا۔ ہم لنز (Lins) تک دریا کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے، اس کے بعد دریا تو پاساؤ (Passav) شہر کی طرف سے جرمن میں داخل ہو گیا تھا لیکن ہمارا سفر ابھی جاری تھا، ہم ادھر سے نہیں جا سکتے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی کو ویلز کی طرف موڑا اور اس شہر کو باہر سے کراس کرتے ہوئے سالزبرگ پہنچ گئے۔

سالزبرگ شہر جرمن بارڈر سے 5 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور یہ آسٹریا کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ یہ شہر دریائے سالزش (Salzach) کے کنارے پر واقع ہے جو آگے جا کر دریائے اِن (Inn) اور پھر یہ دونوں دریا پاساؤ شہر کے پاس جا کر دریائے ڈینوب سے مل جاتے ہیں۔ سالزبرگ سے ہر آدھے گھنٹے بعد لوکل ٹرین نکلتی تھی جو آگے 130 کلومیٹر دور میونخ (Munich) تک جاتی تھی۔ میونخ برلن اور ہمبرگ کے بعد جرمنی کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ ڈرائیور ہمیں لے کر سالزبرگ آ گیا۔ اس نے ایک پارک کے کنارے پر گاڑی کھڑی کی اور جلدی سے ہمیں باہر نکال دیا۔ اس نے ہمیں ادھر ہی انتظار کرنے کا کہا اور خود گاڑی لے کر چلا گیا۔ ہم پارک کے اندر بنی ہوئی بنچوں پر بیٹھ گئے۔

ڈرائیور ایک گھنٹے بعد آیا تو اس کے پاس ہمارے لئے میونخ شہر کی لوکل ٹرین کی ٹکٹیں تھیں۔ ان ٹکٹوں کے اوپر ٹرین کا ٹائم نہیں ہوتا۔۔۔ ہر آدھے گھنٹے کے بعد ادھر سے میونخ کی ٹرین نکلتی تھی، آپ اس ٹکٹ پر کوئی بھی ٹرین پکڑ سکتے تھے۔ ڈرائیور نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ صرف سالزبرگ تک ہی جائے گا، وہ ہمیں وہاں سے میونخ کی ٹکٹ لے کر دے گا اور ٹرین میں صرف ایک سٹاپ آگے فری لیزنگ (Freilassing) تک لے کر جائے گا۔ فری لیزنگ سالزبرگ سے ایک سٹاپ آگے جرمنی کا پہلا شہر تھا۔ یہ ٹرین سے صرف 5 منٹ کا فاصلہ تھا۔ ڈرائیور نے اپنی گاڑی جرمنی میں ہی کھڑی کی ہوئی تھی۔ وہ ہمارے ساتھ فری لیزنگ تک جاتا اور پھر اپنی کار لے کر واپس ویانہ چلا جاتا۔ اس نے سب کو باری باری فاصلہ رکھ کر اپنے پیچھے پیچھے آنے کا کہا اور ٹرین سٹیشن کی طرف جانے لگا۔ ہم سب باری باری اس کے پیچھے چلنے لگے۔ وہ اسٹیشن کے اندر چلا گیا تو ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلے گئے۔

یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا اور یہاں بہت زیادہ رش تھا۔ پورے یورپ سے ٹرینیں ادھر آتی تھیں اور جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کا رش بھی بہت زیادہ تھا۔ پاکستان میں اتنا بڑا ایئر پورٹ بھی نہیں ہوگا جتنا بڑا یہ ریلوے اسٹیشن تھا۔ ہم ڈرائیور کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچے اور میونخ جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ لوکل ٹرینوں میں سیٹ نمبر نہیں ہوتا، جس کو جدھر سیٹ ملتی ہے وہ ادھر ہی بیٹھ جاتا ہے۔ ہر آدھے گھنٹے بعد ٹرین نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ انٹرنیشنل AC ٹرینیں بھی ادھر سے میونخ جاتی ہیں لیکن ان میں بہت رش ہوتا ہے۔ ٹرین میں لوگ کھڑے ہو کر سفر کرتے ہیں۔ ہم چونکہ تھوڑا جلدی آ گئے تھے اور ٹرین کو ابھی چلنے میں دس منٹ رہتے تھے، اس لئے ہم سب کو ٹرین کے اندر سیٹیں مل گئیں تھیں اور ہم سب بکھر کر ایک دوسرے

سے دور دور جا کر ٹرین میں بیٹھ گئے۔ٹرین کا ٹائم ہوگیا تو ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے باہر نکلنے لگی۔

میں کھڑکی والی طرف بیٹھا ہوا تھا۔ٹرین باہر نکل کر تیز ہوگئی اور انتہائی تیز رفتاری سے جرمنی کی طرف جانے لگی۔ٹرین کو ابھی اسٹیشن سے نکلے ہوئے صرف 4 منٹ ہی ہوئے تھے جب مجھے پٹری کے ساتھ جرمنی کا بورڈ نظر آ گیا۔بورڈ کے اوپر جلی حروف میں ویلکم تو ڈچ لینڈ لکھا ہوا تھا۔جرمنی انگلش زبان کا لفظ ہے، جرمن میں اسے ڈچ لینڈ (ڈچ لوگوں کا ملک) کہتے ہیں۔جیسے انگلینڈ انگلش لوگوں کا ملک ہے بالکل ویسے ڈچ لینڈ ڈچ لوگوں کا ملک ہے۔یہاں کی زبان ڈش ہے جو جرمنی، آسٹریا، بیلجیئم اور سوئزرلینڈ میں بولی جاتی ہے۔اسے ہم انگلش میں جرمن زبان کہتے ہیں جبکہ جرمنی کے مقامی لوگ اسے ڈچ زبان کہتے ہیں اور جرمنی کو بھی ڈچ لینڈ کہتے ہیں۔

یاد رہے یہ زبان ڈچ نہیں ہے، ڈچ نیدرلینڈ کی زبان ہے جسے ہم اردو میں ہالینڈ بولتے ہیں۔ڈچ اور ڈوئچ دونوں زبانوں میں بہت فرق ہے۔جرمنی اور انگلش دونوں زبانیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ان دونوں زبانوں کی گرائمر اور فقرہ لکھنے کی ترتیب ایک جیسی ہے۔انگلش کے سب سے نزدیک ترین یہی جرمن زبان ہے۔جیسے اردو اور پنجابی میں جتنا فرق ہے اتنا ہی فرق انگلش اور جرمن میں بھی ہے۔تقریباً 80 فیصد جرمن لوگ انگلش بولتے اور سمجھتے ہیں۔اگر آپ کو انگلش زبان آتی ہے تو صرف تین ماہ میں آپ جرمن زبان سیکھ سکتے ہیں۔

میری نظریں بورڈ پر جمی ہوئی تھیں اور میں بورڈ کو قریب آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ایک لمحے میں ہی بورڈ میرے سامنے تھا اور ٹرین آسٹریا سے جرمنی میں داخل ہوگئی۔ہم سب جرمنی پہنچ گئے تھے۔امریکہ کے بعد دنیا کا دوسرا طاقت ور ترین ملک جرمنی انتہائی ترقی یافتہ اور امیر ترین ملک ہے۔جرمنی اپنی حدود میں داخل ہونے والے ہر مہاجر پر ماہانہ 750 یورو خرچ کرتا ہے۔جس میں سے 370 یورو مہاجر کو نقد ملتے ہیں جبکہ باقی مکان کا کرایہ، بجلی اور پانی کا بل، ٹرین کا ماہانہ پاس، کپڑے اور کھانے کا خرچ، اس کے علاوہ مہاجرین کو سپیشل ڈاکٹر اور ٹیچر مہیا کئے جاتے ہیں جن کی تنخواہ گورنمنٹ ادا کرتی ہے۔

جرمنی کی مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں کو ہر مہاجر کا 750 یورو ماہانہ ادا کرتی ہے اور صوبائی حکومتیں مہاجرین کو نقد پیسے اور رہائش کے لئے مکانات فراہم کرتی ہیں۔جرمنی میں اس وقت مہاجرین کی کل تعداد تقریباً 15 لاکھ سے زیادہ ہے اور جرمن گورنمنٹ سالانہ 20 ارب ڈالر مہاجرین کے اوپر خرچ کر رہی ہے۔

جرمنی اتنا ہی پیسہ اٹلی، یونان اور ترکی میں بھی لگا رہا ہے۔ میرے خیال میں ابھی آپ کو جرمنی کی معیشت کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ پاکستان کے اوپر ٹوٹل قرضہ 170 ارب ڈالر ہے جو پاکستان نے پچھلے پینتیس چالیس سالوں میں لیا ہے۔ جبکہ جرمنی ایک سال میں 40 ارب ڈالر ان مہاجرین پر خرچ کر رہا ہے۔ سالزبرگ سے ٹرین کا پہلا سٹاپ جرمنی کا شہر فری لیزنگ کا ہے جو 6 منٹ بعد آتا ہے۔ ٹرین سالزبرگ سے فری لیزنگ چھ منٹ میں پہنچ گئی۔ ہمارا ڈرائیور ادھر اتر گیا اور واپس آسٹریا چلا گیا جبکہ ہم ٹرین میں ہی بیٹھے رہے۔۔۔ ہمیں آگے میونخ تک جانا تھا۔ میں نے جرمنی کے پہلے شہر فری لیزنگ کا بورڈ پلیٹ فارم پر لگا ہوا دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ آخر میں جرمنی پہنچ ہی گیا تھا۔

مجھے بے اختیار احمد کی یاد آ گئی۔۔۔ ایران کا وہ خوبصورت لڑکا اسی جرمنی کا خواب آنکھوں میں لئے سمندر کی لہروں کی نظر ہو گیا تھا۔ اسے جرمنی سے جنون کی حد تک محبت تھی لیکن وہ جرمنی نہ پہنچ سکا۔ اس نے میرے ہاتھوں میں جان دے دی تھی کیونکہ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ سمندر میں جب کشتی الٹی تو میں اس کا سہارا بنا تھا۔ میں نے اپنے اس چھوٹے بھائی کو بڑی دیر تک ڈوبنے نہیں دیا تھا۔ ہم دونوں سمندر کی لہروں سے لڑتے لڑتے آخر ہار گئے اور سمندر میں ڈوبتے چلے گئے۔ میری شاید قسمت اچھی تھی جو سمندر نے مجھے قبول نہ کیا لیکن احمد کو نگل گیا۔ وہ اس رات جرمنی کا خواب آنکھوں میں لئے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چلا گیا تھا۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے جرمنی کے اندر دوڑ رہی تھی اور اسی رفتار سے میرے آنسو بھی نکل رہے تھے۔ مجھے احمد بہت شدت سے یاد آنے لگا۔ میں ٹرین سے باہر جرمنی کے تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے جنگلات دیکھنے لگا۔ مجھے ان جنگلات میں احمد کی جھلک نظر آنے لگی۔ جنگلات میں احمد کا چہرہ دیکھتے دیکھتے آخر میرا ضبط ٹوٹ گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''اے لڑکے کیا ہوا؟ کیوں رو رہے ہو؟'' میرے ساتھ ایک چالیس سال کے قریب جرمن عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے اچانک روتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے میرے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے پوچھنے لگی۔ میری وضع قطع اور انتہائی گندے کپڑوں سے ہی اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں مہاجر ہوں اور کسی ایشیائی ملک سے آیا ہوں، اس لئے وہ انگلش زبان میں پوچھ رہی تھی۔ مجھے اس کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''ارے یار! ایسے روتے نہیں ہیں، بچے! صبر کرو، اب تم محفوظ ہو۔'' اس نے مجھے اپنے کندھے سے

لگا یا تو میں سسک سسک کر رونے لگا۔ میں نے پچھلے 7 سال سے احمد کی یادوں کو بھلایا ہوا تھا، آج جب جرمنی میں داخل ہوا تو اس کی یادیں اچانک مجھے ہر طرف سے گھیرنے لگیں۔

''راضی! میں نے اپنی زندگی میں جرمنی کے علاوہ اور کسی بھی چیز کو نہیں چاہا ہے۔ جرمنی کی چاہت اور تڑپ ہمیشہ میں نے اپنے دل میں محسوس کی ہے۔'' مجھے احمد کے کہے ہوئے سبھی الفاظ یاد آرہے تھے۔

''راضی بھائی! میں نے جرمنی سے بہت محبت کی ہے۔ خدا نے مجھے اتنا موقع نہیں دیا جو میں جرمنی دیکھ سکتا اور آج اس جرمنی کی حسرت اپنے دل میں لئے اس ٹھنڈے سمندر میں جان دے رہا ہوں۔۔۔ لیکن میری اور ایمان کی یہ دعا ہے کہ خدا تجھے جرمنی بھی دکھائے گا اور امریکہ بھی۔'' مجھے ڈوبتے ہوئے احمد کے آخری الفاظ یاد آرہے تھے۔

''خدا تجھے جرمنی بھی دکھائے گا اور امریکہ بھی۔۔۔'' میں جرمنی پہنچ چکا تھا۔

احمد کا جرمنی آج میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ مجھے سہارے کے لئے اس جرمن خاتون کا کندھا ملا تو میں بے اختیار اس کے کندے پر سر رکھے روتا رہا۔ وہ آہستہ سے میرا کندھا تھپتھپا کر مجھے حوصلہ دیتی رہی۔ کچھ دیر تک مسلسل رونے سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو میں نے اس خاتون کے کندھے سے اپنا سر اٹھا لیا۔

''سوری میڈم! میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی ہے۔'' میں نے شرمسار نظروں سے اس خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

''کوئی بات نہیں، تمہیں سہارے کے لئے کسی کندھے کی ضرورت تھی۔۔۔ اگر میرا کندھا تمہیں مل گیا تو یہ میرے لئے خوش قسمتی کی بات ہے۔ تم لوگوں نے اپنے ملکوں میں بہت دکھ سہے ہیں، ہمارا ملک آپ کے زخموں پر مرہم ضرور رکھے گا۔'' وہ ایک بار پھر مسکرانے لگی۔

جرمن لوگ واقعی بہت مخلص اور مددگار ہیں۔ یہاں پر غیر ملکیوں کے لئے کام، پیسہ، گھر اور عورت سب کچھ ہی تھا۔ یہ پورے یورپ کا واحد ملک تھا جہاں کی عورتیں مہاجرین کو پسند کرتی تھیں۔ چالیس سال سے زیادہ کی اکیلی عورتیں بیس سے تیس سال کے نوجوان لڑکوں کو اپنے ساتھ گھر میں رکھ لیتی تھیں اور انہیں کسی اچھی جاب پر بھی لگوا دیتی تھیں۔ نوکریاں ویسے بھی جرمنی میں بہت زیادہ تھیں۔ ان سب چیزوں کے علاوہ عورتیں شادی کے بعد مسلمان بھی ہو جاتی تھیں۔

''آپ کون سے ملک سے ہو؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی! میں پاکستان سے ہوں، آپ پاکستان کو جانتی ہیں؟'' میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں، اِدھر میچن مین ایک بہت اچھا پاکستانی ریسٹورنٹ ہے۔ مجھے پاکستانی اور انڈین کھانے بہت مزیدار لگتے ہیں۔ چکن تکہ اور چکن بریانی بہت لزیز اور سپائسی ہوتی ہے۔ مجھے تندوری نان بھی بہت پسند ہیں۔'' وہ مجھے مختلف انڈین اور پاکستانی کھانے بتانے لگی۔

یہاں جرمنی میں چائینز اور اٹالین کھانوں کے بعد تیسرا نمبر انڈین کھانوں کا ہے۔ انڈین اور پاکستانی کھانے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں ریسٹورنٹ چلتا انڈین فوڈ کے نام پر ہے اور یہاں تقریباً سبھی پاکستانی انڈین فوڈ کے نام پر ہی ریسٹورنٹ کھولتے ہیں۔ شاید میرے پاکستانی قارئین میری اس بات پر ناراض ہوں لیکن یہ حقیقت ہے۔ انڈین کلچر اور انڈین فوڈ کی پوری دنیا میں مارکیٹ ہے۔ یہاں پاکستانی ڈیزائنر کپڑے بھی انڈین ڈریس کے نام پر فروخت ہوتے ہیں۔ 100 فیصد نہیں تقریباً 80 فیصد یہ کام ہوتا ہے۔ آپ کو مارکیٹ کے اندر اصل کرنل باسمتی چاول کے پیکٹ پر بھی انڈیا کی مہر نظر آئے گی۔

وہ بھی سالزبرگ سے میونخ جا رہی تھی، ہم دو گھنٹے تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ وہ میونخ میں ہی رہتی تھی اور ادھر ہی ایک سپر مارکیٹ میں کام کرتی تھی۔ اس کا ایک آٹھ سال کا بیٹا بھی ہیل براؤن جاتا تھا۔ میونخ پہنچ کر اس نے مجھے ہیل براؤن کا ٹکٹ نکال کر دیا اور میونخ اسٹیشن سے باہر نکل گئی جبکہ میں ہیل براؤن جانے والی ٹرین کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے ڈائریکٹ ہیل براؤن کے لئے ٹرین نہیں نکلتی تھی بلکہ پہلے ایک ٹرین پکڑ کر سٹوٹ گارٹ (Stuttgart) جانا پڑنا تھا اور پھر سٹوٹ گارٹ سے آگے ہیل براؤن کی ٹرین ملتی تھی۔ پورے ملک میں ٹرینوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ملک کے تقریباً سبھی چھوٹے بڑے دیہات کو بھی ریل سے ملایا گیا ہے۔

یہاں چھوٹے سے چھوٹے دیہات میں بھی دورویہ پٹری بچھی ہوئی ہے۔ ٹرین کا ماہانہ پاس ہوتا ہے اور ایک شہر کی بجائے پورے ڈویژن کے لئے ہوتا ہے، جس میں تین چار شہر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پورے جرمنی کی 44 یورو کی ٹکٹ ملتی ہے جو 24 گھنٹے کے لئے ہوتی ہے۔ آپ ایک دن کے لئے پورے جرمنی کی کسی بھی ٹرین میں بیٹھ کر کہیں بھی جا سکتے ہو۔ ابھی میرے پاس بھی 44 یورو والی ٹکٹ تھی اور میں اس ٹکٹ پر کہیں بھی سفر کر سکتا تھا۔ میونخ سے ہیل براؤن کا سفر 4 گھنٹے کا تھا۔ یہاں سے ہم سب لڑکے علیحدہ ہو گئے تھے اور سبھی اپنے اپنے جاننے والوں یا رشتہ داروں کے پاس جانے والے تھے۔ میں بھی خلیل بھائی کے

پاس جا رہا تھا، وہ مجھ سے دو سال پہلے جرمنی آ گئے تھے۔انہوں نے یہاں پر اپنا سیاسی پناہ کا کیس دائر کیا ہوا تھا لیکن ابھی تک ان کا فیصلہ نہیں آیا تھا۔ گورنمنٹ نے انہیں کام کی اجازت دے دی تھی اور وہ ایک پیزا شاپ پر کام کرتے تھے۔ کام اچھا اور صاف ستھرا تھا، صرف ٹائم بہت زیادہ تھا۔ بحر حال پیسے اچھے بن جاتے تھے۔ ہم لوگوں کو ادھر یورپ میں صرف پیسوں سے ہی غرض ہوتی ہے۔ کام تھوڑا ہو زیادہ ہو، آسان یا مشکل، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا بلکہ صرف پیسوں سے فرق پڑتا تھا۔ ہم یہاں صرف کمانے کے لئے آئے تھے اور ہمیں صرف اور صرف پیسوں سے ہی غرض ہوتی تھی۔

میری سٹوٹ گارٹ والی ٹرین آ گئی تو میں اس میں بیٹھ گیا۔ میونخ سے سٹوٹ گارٹ اڑھائی گھنٹے کا سفر ہے۔ جرمنی کے اندر پولیس کسی کو کچھ بھی نہیں کہتی ہے۔ جرمن کی پولیس بہت ہی انسان دوست ہے۔ میں آرام سے سٹوٹ گارٹ پہنچ گیا۔ یہ جرمنی کا چھٹا بڑا شہر اور جرمن صوبے بادن ورتن برگ (Baden Wurttenberg) کا دارالخلافہ ہے۔ یہ بلیک فارسٹ سے صرف ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ بلیک فارسٹ سے دریائے ڈینوب نکلتا ہے جو یوکرین تک جاتا ہے اور بلیک سی میں جا گرتا ہے، اس کے ایک کنارے پر ترکی ہے۔ میری دوسری ٹرین آدھے گھنٹے بعد تھی، میں اپنے مطلوبہ پلیٹ فارم پر جا کر بیٹھ گیا۔ ٹرین ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں اسٹیشن پر گزرنے والے لوگوں کو دیکھنے لگا، لوگ آ جا رہے تھے۔ سبھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔

مزید 15 منٹ تک انتظار کرنے کے بعد ٹرین آ گئی تو میں ٹرین کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے موبائل آن کر کے خلیل بھائی کو کال کی کہ میں ہیل براؤن پہنچ رہا ہوں۔ وہ ہیل براؤن میں ہی کام کرتے تھے۔ میں نے ان کو اپنی ٹرین کا نمبر اور وقت بتایا کہ وہ کتنے بجے ہیل براؤن پہنچے گی تو انہوں نے مجھے تسلی دی کہ وہ آ گے سے مجھے رسیو کر لیں گے اور پلیٹ فارم پر ہی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پندرہ منٹ تک ٹرین چلی اور وہ ٹھیک پچاس منٹ بعد ہیل براؤن پہنچ گئی۔ خلیل بھائی پلیٹ فارم کے اوپر ہی کھڑے تھے۔ میں ٹرین سے باہر نکل کر ان سے ملنے لگا۔

''جی تو راضی بھائی! آخر آپ جرمنی آ ہی گئے ہو۔ اچھا کیا یار! یہ یونان سے بہت بہتر ہے۔ یونان میں تو 500 یورو بھی نہیں بچتا تھا جبکہ یہاں میں 1400 یورو مہینے کا کما رہا ہوں۔'' وہ مجھ سے گلے ملنے لگے۔

''جی خلیل بھائی! واقعی یونان میں اب حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ سات سال ہو گئے لیکن وہ

لوگ کسی کی بھی نہیں سنتے، یہاں شاید حالات مختلف ہوں۔'' میں نے فکرمندری سے کہا۔

''یار! کیس تو یہاں بھی دو دو سال تک لٹک جاتے ہیں۔۔۔میری درخواست کا ابھی تک جواب نہیں آیا ہے، لیکن بحرحال ملک اچھا ہے اور سہولتیں بھی ادھر بہت زیادہ ہیں۔اب تم آ گئے ہو تو کوئی نہ کوئی راستہ بھی نکل آئے گا۔'' وہ مجھے لے کر سٹیشن سے باہر نکلنے لگے۔

وہ ہیل براؤن سے آدھا گھنٹہ دور ایک گاؤں ای پنگن (Eppingon) میں رہتے تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ای پنگن آ گئے۔ یہاں اس گاؤں میں وہ جرمن حکومت کی طرف سے دیئے گئے ایک مکان میں رہتے تھے۔ یہ دو کمروں کا مکان تھا جس کے ساتھ ایک کچن اور ایک باتھ روم تھا۔ان کا کچن بہت بڑا تھا جس کے ایک ساتھ مائکرو ویو اوون، دو چولہے اور ایک چھوٹا سا الیکٹرانک تندور رکھا ہوا تھا۔ چولہے بھی بجلی سے چلتے تھے۔ پورے جرمنی میں کھانا بجلی کے چولہے پر ہی پکایا جاتا ہے۔زیادہ تر اوون ہی استعمال کیا جاتا ہے اور اوون کے اوپر ہی چولہے بھی بنے ہوتے ہیں۔

یہاں گیس کا استعمال انتہائی کم ہے۔بجلی سستی ہے اور چوبیس گھنٹے رہتی ہے۔کہیں سال میں ایک بار کہیں مرمت وغیرہ کا کام کرنا ہو تو ایک ہفتہ پہلے ہی اس علاقے میں نوٹس بورڈ لگائے جاتے ہیں اور ان پوسٹروں پر تاریخ اور ٹائم لکھا ہوتا ہے، جتنے وقت کے لئے بجلی جائے گی۔اچانک کہیں بجلی چلی جائے تو اس کے لئے انکوائری ہوتی ہے،عوام سے معافی بھی مانگی جاتی ہے اور اس مہینے کے بل میں بھی ہرجانے کے طور پر کٹوتی کی جاتی ہے۔جرمنی میں بجلی تین طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔سب سے پہلا طریقہ کوئلے کو جلا کر، جرمنی 53 فیصد بجلی کوئلے سے پیدا کرتا ہے، 17 فیصد نیوکلیئر انرجی سے۔۔۔جرمنی 2020ء تک سبھی نیوکلیئر پلانٹ ختم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔دنیا کو نیوکلیئر پاور سے آزاد کرنے کے لئے جرمنی پہلا قدم اٹھا رہا ہے اور اپنے سبھی نیوکلیئر پلانٹ ختم کر کے اس کی جگہ دوسرے طریقوں سے بجلی پیدا کرے گا۔تیسرا طریقہ قدرتی طریقہ ہے، جس میں ہوا اور سورج کی روشنی سے بجلی پیدا کرنا ہے۔جرمنی اپنی کل پیداوار کا 30 فیصد حصہ ہوا اور سورج کی روشنی سے حاصل کرتا ہے۔

جرمنی کو خدا نے پاکستان جیسی زمین اور دریائے سندھ نہیں دیا ہے، اس لئے وہ دوسرے طریقوں سے بجلی پیدا کرتا ہے۔جبکہ پاکستان ان سب نعمتوں کے باوجود اندھیروں میں زندگی بسر کر رہا ہے۔یہاں لوگ چھ مہینے سیلاب کی نظر ہو جاتے ہیں اور چھ مہینے پانی کے لئے ترستے ہیں۔کوہ ہمالیہ پر جب برف پگھلتی ہے یا

بارش پڑتی ہے تو اس کا پانی پاکستان کے اندر 2 ہزار کلومیٹر سفر کرتا ہے اور پھر سمندر میں چلا جاتا ہے۔ یہ 9 ہزار فٹ کی بلندی سے بتدریج زیرو پر آتا ہے۔ 2 ہزار کلومیٹر۔۔۔ آپ ایک یا دو ڈیموں کو رو رہے ہو۔ آپ صرف دریائے سندھ کے اوپر ہی 100 ڈیم بھی بنالیں تو تب بھی اس دریا کی روانی میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ خدا نے واقعی پاکستان اور انڈیا کو بہت کچھ دیا ہے لیکن ہم دونوں ملک صرف آپس کی دشمنی میں اپنا سب کچھ تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کشمیر سے نکلنے والے 3 دریاؤں میں صرف چناب ہی جموں کشمیر سے نکلتا ہے۔ باقی جہلم آزاد کشمیر سے نکلتا ہے اور دریائے سندھ نیپال سے نکلتا ہے اور انڈیا سے ہوتا ہوا پاکستان آتا ہے۔ لیکن انڈیا کا دریائے سندھ ایک چھوٹی نہر کے برابر ہے، اس کو عظیم الشان دریا گلگت بلتستان کے پہاڑوں سے آنے والا پانی بناتا ہے۔

پاکستان کے پاس سب کچھ ہے۔ ہمارے میڈیا اور کچھ دانشوروں نے ہمیں ڈرا ڈرا کر پاگل بنا دیا ہے کہ انڈیا نے اگر ہمارا اپنا پانی بند کر دیا تو ہم پیاسے مر جائیں گے۔ انڈیا ڈیم بنا رہا ہے، انڈیا یہ کر رہا ہے، انڈیا وہ کر رہا ہے۔ ہاں! انڈیا دریائے چناب کے اوپر واقعی ڈیم بھی بنا رہا ہے اور اس دریا کا پانی بھی روکنے اور بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن یہ بھی غلط ہے کہ پاکستان پانی کی کمی کا شکار ہو جائے گا۔ ہاں! اگر خدانخواستہ آزاد کشمیر پاکستان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پاکستان واقعی پانی کی کمی کا شکار ہو جائے گا۔ دنیا کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے جس سے گلیشیئر کی برف پگھلے گی اور بارشیں زیادہ ہوں گی۔ ہمیں سیلاب کا سامنا کرنا پڑے گا، پانی کی کمی کا نہیں۔ پاکستان اور انڈیا کو صرف دوستی چاہیے۔۔۔ ایک دوسرے کی دشمنی ہم دونوں ختم کر دے گی۔

یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ سیالکوٹ اور گجرات میں ہر سال آنے والا سیلاب بہاولپور سے 700 کلومیٹر دور سے گزر کر پورے سندھ کو تباہ کرتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے اور ہم بہاولپور والے ساری زندگی پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے رہتے ہیں؟ یہ انگریزوں کی مہربانی تھی جو ہم پر صرف 100 سال حکومت کر کے گئے اور بدلے میں دنیا کا سب سے بہترین نہری نظام، آرمی، پولیس اور عدالتیں، کیا کچھ نہیں وہ دے کر گئے؟ ہم آج بھی انگریز کی بنائی ہوئی نہروں اور ریل کی پٹریوں کو استعمال کر رہے ہیں اور انہی انگریزوں کو گالیاں بھی دیتے ہیں۔

یہاں خلیل کے ساتھ پانچ اور لڑکے رہتے تھے۔ تین تین لڑکے ایک ایک کمرے میں رہ رہے تھے۔ یہ

تین منزلہ عمارت تھی جس میں 9 گھر تھے اور سبھی گھر مہاجرین کو دیئے ہوئے تھے۔ گھر میں اس وقت صرف دو لڑکے ہی تھے۔ یہ اسی گاؤں کی ایک فیکٹری میں لگے ہوئے تھے اور جلدی چھٹی کر لیتے تھے جبکہ باقی لڑکے رات کو ہی آتے تھے۔ میں نے ان دونوں لڑکوں سے ہاتھ ملایا، یہ دونوں پشاور سے تھے۔

''جی تو راضی صاحب! ادھر آ کر بیٹھ جاؤ اور سناؤ یونان کا کیا حال ہے؟'' خلیل بھائی نے مجھے ایک کمرے میں بٹھایا اور یونان کے حالات پوچھنے لگے۔

''سب ٹھیک ہیں۔۔۔وقاص کو میں نے بولا تھا جرمنی آنے کا لیکن وہ اٹلی چلا گیا۔'' میں خلیل کو بتانے لگا۔

''ہاں یار! میں نے بھی وقاص کو کہا تھا کہ ادھر آ جائے، فرانس میں کام بہت مشکل سے ملتا ہے لیکن وہ نہیں مانا، چلو کوئی بات نہیں۔ اس کے کافی رشتے دار ادھر ہیں، اسے کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے گا۔'' خلیل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں ایک لڑکا گلاس میں جوس ڈال کر لے آیا۔

''خلیل بھائی! نیا لڑکا آیا ہے پاکستان سے؟'' وہ خلیل سے میرے بارے میں پوچھنے لگا۔

''نہیں یار! لڑکا تو نیا ہی ہے لیکن یونان سے آیا ہے، ہم اکٹھے ہی یونان میں رہتے تھے۔'' وہ میرا تعارف کروانے لگے۔ میں نے جوس لیا تو انہوں نے مجھے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر دیا۔ میں نے نہا کر نئے کپڑے پہنے تو انہوں نے پرانے کپڑے ڈسٹ بن میں پھینک دیئے۔ ایک مہینے کی ڈنکی نے ان کپڑوں کا ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا۔

''کل صبح صبح میں تمہیں مہاجرین کے کیمپ میں چھوڑ کر آ جاؤں گا۔ تم سب سے پہلے ادھر جا کر سیاسی پناہ کی درخواست دو۔ ایک ڈیڑھ مہینے تک وہ تمہیں کیمپ میں رکھیں گے اور تمہارے فنگر پرنٹس اور تصویریں وغیرہ لیں گے۔ تمہارا میڈیکل وغیرہ ادھر ہی ہو جائے گا تو پھر تمہیں بھی ہماری طرح ایک گھر مل جائے گا۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔ جرمنی والے مہینے کا 350 یورو دیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ 50 یورو مہینے کا خرچہ آتا ہے، تم آسانی سے 300 یورو گھر بھی بھیج سکتے ہو۔'' خلیل بھائی مجھے سمجھانے لگے اور میں ان کی بات سن کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

دوسرے دن صبح صبح وہ مجھے لے کر کارل سروہے (Karlsruhe) آ گئے۔ کارل سروہے، بادن وتن برگ کا دوسرا بڑا شہر تھا اور اس صوبے کا سب سے بڑا مہاجرین کا کیمپ ادھر ہی تھا۔ اس کے علاوہ کارل

سروہے کی کمپیوٹرانجینئرنگ یونیورسٹی دنیا کی چند مشہورترین آئی ٹی یونیورسٹیوں میں سے تھی اور پوری دنیا سے نوجوان لڑکے اورلڑکیاں ادھر پڑھنے کے لئے آتے تھے۔جن میں ایک بڑی تعدادانڈین سٹوڈنٹس کی بھی تھی۔ پاکستانی سٹوڈنٹس البتہ جرمنی میں اتنا انٹرسٹ نہیں لیتے تھے۔ان کی دلچسپی برطانیہ اور امریکہ کی یونیورسٹیاں تھیں۔کارل سروہے میں مہاجرین کا کیمپ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔آپ کسی بھی وقت یہاں آ کر سیاسی پناہ کی درخواست دے سکتے تھے۔خلیل نے چونکہ آج کام پر جانا تھااس لئے وہ مجھے صبح صبح ہی ادھر لے کرآ گئے تھے۔

’’ٹھیک ہے یار! وہ سامنے کیمپ کا گیٹ ہےاوراس کے ساتھ ہی ایک چیک پوسٹ بنی ہوئی ہے۔ ادھرایک سیکورٹی گارڈ بیٹھا ہوگا،تم اس کے پاس جا کرسیاسی پناہ کا بولو گےتو وہ تم کوایک فارم دے گا۔تم اس پر اپنااصل نام تاریخ پیدائش اورملک لکھو گےتو وہ تم سے فارم لے کرتمہیں ایک چھوٹا سا کارڈ دے کراندرویٹنگ روم میں لے جائے گا۔ وہاں اوربھی مہاجرین بیٹھے ہوں گے جورات کوادھرکیمپ میں سیاسی پناہ کے لئے آئے ہوں گے۔تم بھی ان کے ساتھ ہی ادھر بیٹھ جانا۔۔۔9 بجے کیمپ کا دفتر کھلتے ہی تمہارا با قاعدہ اندارج اورآگے کی کاروائی شروع ہو گی۔‘‘ خلیل مجھے کیمپ سے تھوڑی دور ہی لے کررک گیا تھا کیونکہ اس سے آگے اسے جانے کی اجازت نہیں تھی۔وہ میرے ساتھ کیمپ میں نہیں جا سکتا تھا۔میں اس کی سبھی باتیں سمجھ گیاتو وہ مجھےادھرہی چھوڑکرواپس چلا گیا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کیمپ کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔یہاں لوہے کا ایک بہت بڑا گیٹ تھا جس کی ایک طرف چھوٹا دروازہ بھی تھا۔چیک پوسٹ کیمپ سے باہرتھی اوراس کا دروازہ دوسری طرف کیمپ کےاندرتھا۔جبکہ اس طرف صرف شیشے کی ایک کھڑکی لگی ہوئی تھی۔میں کھڑکی کے سامنے پہنچا تو دوسری طرف بیٹھا ہواسیکورٹی گارڈ میری طرف متوجہ ہوگیا۔

’’مجھے پناہ چاہیے، میں مہاجر ہوں اور پاکستان سے آیا ہوں۔‘‘ میں نے انگلش میں اس سے کہا تواس نےمسکراتے ہوئے مجھے گڈ مارننگ اورویلکم ٹو جرمنی کہااورایک فارم میری طرف بڑھا دیا۔

’’آپ اس کےاوپراپنا نام اور پتہ لکھ دیں۔‘‘ اس نے فارم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہااورایک پنسل بھی مجھے پکڑادی۔

میں نے ادھرہی کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے اپنا نام اور پتہ لکھ کر اسے واپس کیا تو وہ کمپیوٹر پر اندراج

کرنے لگا۔اس عمل میں صرف دو منٹ ہی لگے ہوں گے کہ اس نے ایک کارڈ نکالا،اس پر میرا نام لکھا اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔اس پر ایک سیریل نمبر اور میرا نام لکھا ہوا تھا جبکہ دوسری طرف کارل سرو ہے کے امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کی مہر لگی ہوئی تھی۔تھوڑی دیر بعد ہی ایک پولیس والا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

''آپ کے پاس لوہے کی کوئی بھی چیز ہو تو وہ نکال کر ادھر رکھ دیں۔۔۔اس کے علاوہ پیسے،موبائل اور جو کچھ بھی آپ کی جیب میں ہو وہ بھی ادھر نکال دیں۔'' اس نے ایک چھوٹی سی باسکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اس چھوٹی باسکٹ کو کمرے کی کھڑکی کے آگے بنی ہوئی پٹی پر رکھا اور اپنی جیب سے تمام چیزیں نکال کر اس کے اندر رکھنے لگا۔

''کوئی اور چیز تو نہیں ہے آپ کے پاس؟'' سیکورٹی گارڈ انتہائی شائستگی سے مجھ سے پوچھنے لگا۔ میں نے انکار میں سر ہلایا تو وہ آگے بڑھ کر میری تلاشی لینے لگا۔ مجھے بے اختیار اپنی پاکستانی پولیس یاد آ گئی۔وہاں کوئی پولیس والا اتنی تمیز سے کسی سے پیش آتا تو یقین کریں اگلا آدمی حیرت سے ہی مر جاتا۔

''ٹھیک ہے،آپ اب آ جائیں اندر،اس طرف!'' اس نے میری تلاشی لے لی تو آگے بڑھ کر چھوٹا دروازہ کھول دیا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کرنے لگا۔

میں نے سامان والی چھوٹی باسکٹ ادھر ہی چھوڑی اور اندر چلا گیا۔وہ بھی میرے پیچھے پیچھے باسکٹ لے کر آ گیا۔اس نے باسکٹ میں موجود میرا موبائل اور دوسری چیزیں دیکھیں اور سبھی چیزیں مجھے واپس کر دیں۔اس کے بعد وہ مجھے لے کر ایک کمرے میں آ گیا، یہاں پہلے بھی قریباً 10 کے قریب مہاجرین بیٹھے ہوئے تھے۔

''9 بجے تک آپ ادھر ہی انتظار کریں،اس کے بعد آپ کی رجسٹریشن شروع ہو جائے گی۔'' اس نے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کمبل بھی ادھر پڑے ہوتے ہیں،اگر سردی لگے تو آپ لے سکتے ہیں۔'' وہ مجھے بتا کر باہر نکل گیا اور میں کمرے کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

دن کو 9 بجے کے قریب ہماری تعداد 30 کے قریب ہو گئی۔سوا نو بجے کے قریب ایک سادہ کپڑوں والا آدمی ہمارے پاس آیا اور ہمیں اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ہم سب نے اپنے اپنے بیگ پکڑے اور اس کے ساتھ

چلنے لگے۔ میرے پاس تو کوئی بھی بیگ نہیں تھا لیکن باقی سبھی کے پاس کوئی نہ کوئی بیگ وغیرہ ضرور تھا۔ وہ ہمیں لے کر ایک بڑے ہال نما کمرے میں لے گیا۔ یہاں پورے ہال میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے ہمیں کرسیوں پر بٹھایا اور ہمارے ٹوکن نمبر اکٹھے کر کے اندر لے گیا اور پھر ایک ایک لڑکے کو اندر بلا کر اس کی رجسٹریشن کرنے لگا۔ اسی دوران ناشتہ بھی آ گیا، یہ ایک چھوٹا بند، دودھ کا آدھا لیٹر کا پیک، دو چھوٹی چھوٹی پڑیاں جام اور مکھن کی تھیں۔

تقریباً دو گھنٹے کے اندر اس آدمی نے ہم سب کی رجسٹریشن مکمل کر لی تھی اور ہمیں ایک ایک فارم دے دیا تھا۔ رجسٹریشن مکمل ہوئی تو وہ ہمیں باہر کھڑی ایک بس کے قریب لایا اور ہمیں بس میں سوار ہونے کا کہنے لگا۔ کارل سروہے کے اس کیمپ میں جگہ پُر ہو گئی تھی۔ اب یہاں مزید مہاجرین کو رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اس لئے وہ ہمیں یہاں سے کہیں اور لے کر جا رہے تھے۔ ان دو گھنٹوں میں مزید 10 مہاجر بھی آ گئے تھے۔ ان کی بھی ہمارے ساتھ ہی رجسٹریشن ہو گئی اور اب وہ بھی ہمارے ساتھ ہی جا رہے تھے۔ اس کے بعد جو مزید آتے وہ شام کو پھر آ جاتے۔ یہاں سے ایک دن میں دو بار گاڑی مہاجرین کو لے کر نکلتی تھی۔ بس ہمیں لے کر ہائیڈل برگ (Heidelberg) آ گئی۔

دو لاکھ کی آبادی والا یہ خوبصورت سا پہاڑی شہر دریائے نیکر کے کنارے پر واقع ہے۔ اسی شہر کی یونیورسٹی میں علامہ اقبال پڑھتے رہے ہیں اور علامہ اقبال کی ایک نظم ''ایک شام دریائے نیکر کے کنارے'' اسی دریا پر لکھی گئی ہے۔ ہائیڈل برگ کی ایک سڑک کا نام بھی علامہ اقبال کے نام پر ''اقبال روڈ'' رکھا گیا ہے اور وہ روڈ آج بھی اقبال روڈ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ہمیں ہائیڈل برگ شہر سے باہر ایک سابق امریکی کیمپ میں جگہ ملی۔ یہاں سے پہلے امریکی فوجیوں کا کیمپ ہوا کرتا تھا جو اب خالی ہو گیا تھا۔ جرمن حکومت نے اسے مہاجرین کے کیمپ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں امریکہ تو ابھی نہیں پہنچا تھا لیکن امریکی فوجیوں کے کیمپ تک آ گیا تھا، آگے بھی خدا مددگار تھا۔

ایسگارڈ کا کیس ابھی تک چل رہا تھا اور اسے پاسپورٹ واپس نہیں کیا گیا تھا۔ وہ امریکہ سے باہر جا سکتی تھی۔ خدا کی بنائی ہوئی دنیا اور اس کے اصول بھی کتنے عجیب ہیں کہ میں امریکہ کے اندر نہیں جا سکتا تھا اور وہ امریکہ سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ ہائیڈل برگ کا یہ آرمی کیمپ کم از کم 100 ایکڑ پر مشتمل ہو گا۔ جس کے اندر چھوٹے چھوٹے پارک اور 480 کے قریب کمرے تھے۔ یہاں دو منزلہ کمرے بلاکوں کی صورت میں

تھے۔12 نیچے اور بارہ کمرے اوپر۔۔۔درمیان میں گیلری اور اس کی دونوں اطراف پر کمرے تھے۔ایک بلاک میں 24 کمرے تھے اور یہاں پر ٹوٹل بیس رہائشی بلاک تھے۔اس کے علاوہ باسکٹ بال گراؤنڈ، ڈائننگ ہال، ٹی وی لاؤنج، کینٹین اور کانفرنس ہال کی بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ایک پورا بلاک دفتر کے کمروں کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔یہاں ایک چھوٹا سا ہسپتال اور چرچ بھی تھا۔انتظامیہ نے ایک عمارت دے دی تھی جسے مہاجرین مسجد کے طور پر استعمال کرنے لگے تھے۔

یہاں پر انہوں نے ہم سے کارل سروہے والا فارم لے لیا اور یہاں کا ایک کارڈ دے دیا۔اس پر ہمارا نام اور سیریل نمبر لکھا ہوا تھا۔ایک سیکورٹی اہلکار نے مجھے ساتھ لیا اور ایک کمرے میں لے گیا۔کمرے میں بستر، تکیہ اور کمبل سبھی کچھ بیڈ پر لگا ہوا تھا۔یہاں پر پہلے بھی 5 پاکستانی رہ رہے تھے جبکہ 4 ڈبل بیڈ لگے ہوئے تھے۔یہاں ایک کمرے میں 8 لڑکوں کے رہنے کی گنجائش تھی۔یہاں ٹوٹل چار ہزار مہاجرین کے رہنے کی گنجائش تھی اور ابھی یہاں پر 3 ہزار کے قریب مہاجرین آئے تھے۔تقریباً 100 کے قریب روزانہ مہاجرین یہاں آتے تھے اور اتنے ہی مہاجرین رجسٹریشن مکمل کروا کر صوبے کے مختلف چھوٹے بڑے دیہات اور شہروں میں ٹرانسفر ہو جاتے تھے۔رجسٹریشن مکمل ہونے کے بعد مہاجرین کو پکی رہائش ملتی تھی اور ایک کمرے میں صرف تین ہی لڑکے رہتے تھے۔وہ رہائش ساری زندگی کے لئے ہوتی تھی۔صرف کیس رجسٹرڈ ہونے کی صورت میں یا پھر بندہ خود ہی رہائش تبدیل کرنا چاہے تب ہوتی تھی۔

دوسرے دن صبح صبح سب سے پہلے یہاں ہمارا میڈیکل ہوا۔ایک ڈاکٹر نے ہمارا مکمل چیک اپ کیا اور پرانی بیماریوں یا آپریشن وغیرہ کا پوچھ کر ہمارا اندراج کرتا رہا۔ڈاکٹر نے مکمل چیک اپ کرنے کے بعد مجھے ایک پاکٹ سائز بک دی، یہ میڈیکل بک تھی۔پورے جرمنی کے کسی بھی ہسپتال میں اس میڈیکل بک پر میں اپنا علاج فری کروا سکتا تھا۔اس کتاب پر میرا نام، پتہ اور پرانی سبھی بیماریوں کی تفصیل موجود تھی۔میڈیکل کروانے کے بعد ہم آزاد تھے اس لئے میں کیمپ میں گھومنے لگا۔دوپہر کو کھانے کے بعد مجھے پہننے کے لئے کپڑوں کا ایک بنڈل اور باتھ روم کا سامان (صابن، ٹوتھ پیسٹ، کریم، سیفٹی اور تولیہ) دیا گیا۔

شام کو چار بجے سبھی نوجوان اپنی اپنی گیم کھیلنے لگے۔یہاں کرکٹ، فٹ بال، باسکٹ بال، والی بال اور بیڈمنٹن کی گیمیں کھیلی جاتی تھیں۔کیمپ والے صرف فٹ بال اور باسکٹ بال ہی کھیلنے کے لئے دیتے تھے، باقی سامان اپنی مدد آپ کے تحت اکٹھا کرنا پڑتا تھا۔یہاں گیند بیڈ تو تھا لیکن ٹیپ نہیں تھی، اس لئے بغیر ٹیپ

کے ہی خالی ٹینس بال سے کھیلا جاتا تھا۔ٹیپ مہنگی تھی اور اسے خریدنا کسی کے بھی بس میں نہیں تھا۔میں یہاں پر ایک مہینہ رہا۔۔۔اس دوران میرے کمپیوٹر فنگر پرنٹ،تصویریں اور مختصر انٹرویو سب ہو گیا اور مجھے پکی رہائش کارل سروہے سے تقریباً 35 کلومیٹر دور ایک گاؤں بادشورن بورن (Badschorn Born) کے ایک کنٹینرز میں ملی۔

بادشورن بورن اور کرونو دو گاؤں تھے۔جن کے درمیان سے ٹرین گزرتی تھی جو کارل سروہے جاتی تھی۔دونوں گاؤں ریل کی پٹری کے دونوں طرف تھے۔ہمارے کنٹینزٹرین کے سٹاپ سے صرف 500 میٹر کے فاصلے پر ایک گراؤنڈ میں لگے ہوتے تھے۔یہ ٹوٹل 60 کے قریب کنٹینز تھے جن میں 180 مہاجرین رہ رہے تھے۔ایک کنٹینز میں 3 لڑکے یا ایک پوری فیملی رہتی تھی۔ ہر روز مہاجرین کی تعداد بڑھ رہی تھی اور ان کی رہائشوں کے لئے جگہ کم ہونے لگی تو گورنمنٹ کنٹینز بنانے لگی۔ یہ کنٹینز بالکل گھر کی طرح لگتے تھے۔ کارل سروہے ہم سے صرف آدھا گھنٹہ دور تھا اور ہر 15 منٹ کے بعد ادھر سے ٹرین گزرتی تھی جو کارل سروہے اور ہائیڈل برگ لے کر جاتی تھی۔ہمیں 350 یورو کے علاوہ ٹرین کا ماہانہ پاس بھی ملتا تھا جس پر ہم کارل سروہے آ جا سکتے تھے۔ابھی مجھے یہاں آئے صرف تیسرا دن ہی ہوا تھا جب خلیل بھائی نے کارل سروہے میں میرے لئے ایک دن کا کام نکالا۔گرمیاں شروع ہو گئی تھیں اور گھروں سے باہر بنے ہوئے لان پر گھاس بڑھنی شروع ہو گئی تھی۔ یہ گھاس کاٹنے کا کام تھا۔ایک دن کا کام تھا جس کے مجھے چالیس سے پچاس یورو مل جاتے۔میں نے کام کی حامی بھر لی۔میں دوسرے دن صبح صبح کارل سروہے چلا گیا اور اسٹیشن سے باہر کھڑا ہو کر اس آدمی کا انتظار کرنے لگا جس نے مجھے کام پر لے جانا تھا۔ٹھیک ساڑھے سات بجے ایک کار میرے نزدیک آ کر رکی۔اس میں سے ایک 45 سالہ پاکستانی آدمی کار سے اترا اور سیدھا میری طرف آ گیا۔

’’السلام وعلیکم ! کیا آپ کو خلیل نے بھیجا ہے۔۔۔کام کے لئے؟‘‘ اس آدمی نے مجھے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

’’جی ! مجھے خلیل نے ہی بھیجا ہے کام کے لئے۔‘‘ میں نے جلدی سے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے، آپ آ جائیں میرے ساتھ!‘‘ اس نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں

ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''میرا نام مبشر رزاق ہے لیکن مجھے ظفر کہتے ہیں۔'' اس نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا کیا نام ہے؟'' وہ مجھے پوچھنے لگے۔

''مجھے راضی کہتے ہیں، بہاولپور سے ہوں۔'' میں نے مختصراً اپنا تعارف کروایا۔

''اوہ بہاولپور؟ میرا ایک دوست بھی بہاولپور سے ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ظفر بھائی یہاں کارل سروہے میں ایک کمپیوٹر ٹیسٹنگ کمپنی میں کام کرتے تھے۔ان کی کمپنی پوری دنیا میں بڑی بڑی نیشنل اور ملٹی نیشنل فرموں کے لئے سپر کمپیوٹر بناتی تھی اور اس کے علاوہ الیکٹرانک سرکٹ ٹیسٹنگ مشین بھی بناتی تھی۔جتنی بھی الیکٹرونکس کی اشیاء ہوتی ہیں ان میں ایک مرکزی سرکٹ لگا ہوتا ہے اور یہی سرکٹ اس مشین کا دل ہوتا ہے۔ایک سادہ سی پلیٹ جس کے اوپر سینکڑوں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے باریک ٹانکے اور لائٹس لگی ہوتی ہیں۔ظفر بھائی کی کمپنی اس کی ٹیسٹنگ مشین اور کمپیوٹر بناتی تھی۔ایک سپر کمپیوٹر کی قیمت لاکھوں یورو ہوتی ہے جو پاکستانی کروڑوں میں بنتی ہے۔

ابھی حال ہی میں پاکستان نیوی نے انہی کی کمپنی سے ایک کمپیوٹر 4 لاکھ یورو میں خریدا تھا۔ وہ لاہور کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے لاہور سے ہی انجینئر نگ کی تھی اور پھر 1990ء کے قریب وہ جرمنی آ گئے۔ یہاں پر مزید دو سال انہوں نے انجینئر نگ کا ایک کورس کیا اور پھر اس فرم سے منسلک ہو گئے۔ان کی فرم کارل سروہے سے باہر درلخ (Durlach) کی طرف تھی۔ یہ اسٹیشن سے 10 منٹ کا سفر تھا۔ وہ مجھے فرم میں لے آئے۔ یہ بہت بڑی دو منزلہ بلڈنگ تھی، بلکہ اس کا تہہ خانہ ملا کر تین منزلہ بن جاتی تھی۔ نیچے تہہ خانے میں فیکٹری تھی جہاں مشین تیار کی جاتی تھی۔

گراؤنڈ فلور شوروم تھا اور اوپر والی منزل دفتر کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ یہ بلڈنگ لمبائی میں تھی جس کے درمیان میں گیلری اور دونوں اطراف پر کمرے تھے۔تہہ خانہ پورا ہال تھا جس میں مختلف مشینری لگی ہوئی تھی۔ یہاں صرف پیکنگ اور چھوٹا موٹا کام ہوتا تھا۔اصل فیکٹری شہر سے بالکل باہر وائن گارٹن میں تھی۔ظفر بھائی یہاں کے سپروائزر تھے۔ یہ ایک طرح سے فرم کے کیئر ٹیکر تھے۔انہیں باغیچے کی صفائی سے لے کر مستریوں کے کام تک بھی آتے تھے اور ہر چھوٹے بڑے کام میں ہاتھ ڈال دیتے تھے۔فرم کے سامنے اور بیک سائیڈ پر گھاس اور چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں پھول لگے ہوئے تھے۔گھاس بڑھی ہوئی تھی اور پھولوں کی

بھی کانٹ چھانٹ ہونی تھی۔ مجھے اسی صفائی کے لئے بلایا گیا تھا۔انہوں نے مجھے سارا کام سمجھایا اور اوزار لا کر دے دیئے۔ میں نے سب سے پہلے گھاس کاٹنے والی مشین سٹارٹ کی اور گھاس کاٹنے لگا۔ 12 بجے تک میں نے گھاس مکمل کر دی اور اب پھولوں کی باری تھی۔ظفر بھائی پانی کی ایک بوتل لے کر آ گئے۔ میں نے ان سے بوتل لے کر پانی پیا اور دوبارہ کام پر لگ گیا۔تین بجے تک میں نے باہر کا سارا کام مکمل کر دیا اور اندر جا کر ظفر بھائی کو باہر لے کر آیا۔

''دیکھ لو ظفر بھائی! کوئی اور کام رہتا ہو تو بتا دو؟'' میں ان سے مزید کام پوچھنے لگا۔انہوں نے ایک چکر دونوں اطراف پر لگایا اور مطمئن ہو گئے۔

''بہترین ہو گیا یار! تم تو بڑے تیز ہو،ابھی پورا ایک گھنٹہ پڑا ہوا ہے چھٹی ہونے میں۔۔۔آ جاؤ اندر! کپڑے تبدیل کر لو اور میرے ساتھ ذرا پیکنگ کا کام کروا دو۔'' وہ مجھے لے کر اندر آ گئے۔نیچے تہہ خانے میں چار چھوٹے چھوٹے کمپیوٹر پیک کرنے تھے۔میں ان کے ساتھ پیکنگ میں مدد کروانے لگا۔

''یار تم کرکٹ بھی کھیلتے ہو؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔

''جی بھائی! بس نارمل سا کھیل لیتا ہوں۔کرکٹ کا کبھی بہت شوق ہوتا تھا،کھیلتا بھی اچھا تھا لیکن یورپ کی مزدوری نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔'' میں نے کی بورڈ کو ڈبے میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ادھر کارل سروہے میں ہر ہفتے اور اتوار کو کلب کرکٹ کھیلی جاتی ہے،تم بھی آ جانا! میں کارل سروہے کرکٹ کلب کا چیئر مین ہوں۔اگر فارغ ٹائم ملے تو ضرور آنا۔'' انہوں نے ادھر جرمن میں شادی کی تھی اور ان کے دو بچے بھی تھے۔ان کی جرمن بیوی نے اسلام قبول کر کے ان سے شادی کی تھی اور اب ان کے پاس جرمن شہریت تھی۔وہ جرمن شہری تھے اور جرمن صوبے بادن وتن برگ کی ٹیم کے چیئر مین بھی تھے۔

شاید آپ کو یہ سن کر حیرانگی ہو کہ جرمنی کی انٹرنیشنل کرکٹ ٹیم بھی ہے۔جس میں پاکستانی، انڈین اور بنگالی لڑکے شامل ہیں۔اس ٹیم نے 2001ء میں ICC چیمپیئن ٹرافی میں کوالی فائی کر کے میچ بھی کھیلا تھا۔ 4 بجے تک میں نے سارا کام مکمل کر لیا تھا۔انہوں نے ایک کاغذ پر میرا نام لکھا، مجھ سے دستخط کروائے اور اوپر مین آفس سے 50 یورو لا کر مجھے دے دیئے۔یہ میری جرمنی میں پہلی کمائی تھی۔انہوں نے واپس مجھے کارل سروہے کے اسٹیشن پر اتارا اور میرا موبائل نمبر لے لیا۔

''یار! کوشش کرنا ہفتہ یا اتوار کو کرکٹ کے لئے آنے کی۔۔۔اصل میں بات کرکٹ کی نہیں ہوتی ہے،

یہاں آؤ گے تو نئے لڑکوں سے ملو گے۔ واقفیت ہو گی تو کہیں کام بھی مل جائے گا۔ تم بہت اچھے لڑکے ہو اور محنتی بھی ہو، لیکن کام گھر بیٹھے نہیں ملتا۔۔۔ اس کے لئے باہر نکلنا پڑتا ہے، نئے دوست نئی پہچان بنانی پڑتی ہے۔ مجھے جرمنی میں رہتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں اور یہ میرا یورپ کا تجربہ ہے۔'' انہوں نے مجھے سلام کیا اور چلے گئے۔

میں بھی واپس گھر آ گیا تھا۔ مجھے ان کی بات بہت اچھی لگی تھی کہ یورپ میں کام تلاش کرنے کے لئے واقفیت بہت کام آتی ہے۔ دو دن بعد ہی ہفتہ تھا، میں کارل سروہے چلا گیا۔ یہاں گراؤنڈ میں کم از کم 50 کے قریب لڑکے تھے۔ پورے گراؤنڈ میں پانچ مختلف جگہوں پر پچ بنی ہوئی تھی اور سبھی پر لڑکے کھیل رہے تھے۔ گراؤنڈ کے ایک کنارے پر نیٹ لگا ہوا تھا اور یہاں لڑکے ہارڈ بال سے نیٹ پریکٹس کر رہے تھے جبکہ باقی پورا گراؤنڈ ٹیپ بال استعمال کر رہا تھا۔ میں سیدھا ظفر بھائی کے پاس گیا اور انہیں جا کر سلام کیا۔ وہ مجھ سے مل کر کافی خوش ہوئے۔

''واہ راضی صاحب! آ گئے؟ اچھا ہوا، کیا کرتے ہو۔۔۔ بالنگ یا بیٹنگ؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔

''پا جی! بالنگ کرتا ہوں۔'' میں نے ان سے گیند لی اور باؤلنگ کروانے لگا۔ تقریباً 10 گیندوں میں اوور مکمل کروایا جس میں سے 3 وائیٹ اور 1 نو بال تھی۔

''کوئی بات نہیں یار! تھوڑی محنت کرو گے تو تمہاری گیم اچھی ہو جائے گی۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں ان ہائی کلاس لڑکوں کے برابر کچھ بھی نہیں تھا۔ کرکٹ میرے بس سے باہر ہو گئی تھی۔

وہ مجھے لے کر ٹیپ بال کھیلنے والی ایک ٹیم کے پاس لے گئے اور انہیں مجھے اپنے ساتھ کھلانے کا کہا۔ لڑکوں نے مجھے ایک کونے میں فیلڈنگ کرنے کا کہا تو میں ادھر فیلڈنگ کرنے لگا۔ یہاں چھ کھلاڑی اور دس دس اوور کی گیم ہو رہی تھی۔ ابھی صرف دوسرا ہی اوور چل رہا تھا۔ دو گیموں تک میں ان لڑکوں میں گھل مل گیا تھا۔ یہ سارے میری طرح مہاجرین ہی تھے جو مجھ سے دو سال پہلے آئے تھے اور تقریباً سبھی لڑکے ہی کسی نہ کسی فیکٹری میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں جرمنی میں ہفتے میں 5 دن کام ہوتا تھا اور ہفتہ اتوار دو دن چھٹی ہوتی تھی۔ ابھی تیسری گیم چل رہی تھی۔ میں باؤنڈری پر فیلڈنگ کر رہا تھا جب ایک ٹیکسی آ کر کھڑی ہوئی اور مجھے اس میں سے چیمہ صاحب نکلتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے ان کو کوس جزیرے پر دیکھا تھا۔ میں ایک دن ان

کے ساتھ رہا تھا اور انہوں نے ہی مجھے خلیل سے ملوایا تھا۔ وہ اسی سال جرمنی آ گئے تھے اور اب ان کے پاس جرمنی کا لائف ٹائم ویزہ تھا۔ خلیل بھائی بھی جرمنی انہی کے پاس آئے تھے اور انہوں نے خلیل کو بھی کارل سروہے کے مہاجر کیمپ میں بھیجا تھا۔ میں ان کو اور سرفراز کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ ابھی ان کو اچانک ادھر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے گیم ادھر ہی چھوڑی اور ان کے پاس چلا گیا۔ وہ ظفر بھائی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے تھے اور ان سے باتیں کر رہے تھے۔

''السلام وعلیکم چیمہ صاحب! کیا حال ہے؟'' میں ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ غور سے میری طرف دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔

''سوری یار! میں نے آپ کو پہچانا نہیں ہے؟'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں کوس جزیرے پر آپ کے پاس آیا تھا اور آپ نے ہی مجھے خلیل بھائی کے پاس بھیجا تھا۔ ترکی سے سپیڈ بوٹ سے میں کوس جزیرے پر ہی پہنچا تھا اور آپ مجھے ڈیرے پر ملے تھے، پالک کاٹتے ہوئے۔۔۔'' میں نے ان کو یاد دلایا تو اچانک ان کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اور انہوں نے جلدی سے مجھے گلے لگا لیا۔

''اوہ یار! تم راضی ہو؟ میری ادھر بھی خلیل سے بات ہوتی رہتی تھی تو میں اکثر تمہارا پوچھتا تھا۔۔۔ کیسے ہو؟ کب آئے ہو جرمنی؟'' انہوں نے گلے مل کر ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

''پا جی! میں بہت کمزور اور سنگل پسلی ہوں، میری کوئی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔'' میں نے انہیں یاد دلایا تو انہوں نے جلدی سے مجھے چھوڑ دیا۔

''او یار! کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں دیکھے ہوئے۔۔۔ کب جرمنی آئے ہو؟'' وہ دوبارہ مجھ سے پوچھنے لگے۔

''ابھی ایک مہینہ ہی ہوا ہے اور ایک دیہاڑی بھی لگا لی ہے جرمنی میں۔۔۔ ظفر بھائی کی فرم میں کام کیا تھا۔'' میں نے ظفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''او اچھا! ظفر بھائی کو جانتے ہو؟ بہت اچھے انسان ہیں۔۔۔ کہیں کام وغیرہ ملا ہے یا ابھی تک فارغ ہی ہو؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔

''نہیں پا جی! ابھی تک تو کہیں کام نہیں ملا ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ کچھ دیر تک سوچتے

رہے۔

''چلو میں دو چار دوستوں سے بات کرتا ہوں، امید ہے ہفتے تک کہیں نہ کہیں کام مل ہی جائے گا۔ پریشان مت ہونا! اب تم ہمارے پاس ہو۔ کام بھی ملے گا اور پیسے بھی اچھے ملیں گے۔ میں کوئی نہ کوئی بندوبست کردوں گا۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی تو میں مطمئن ہوگیا۔

''ہر منگل کی رات کو میں کام سے چھٹی کرتا ہوں اور میں، ظفر بھائی اور سرفراز ہم تینوں رات کو اکٹھے ہوتے ہیں۔۔۔کھانا بناتے ہیں اور اکٹھے ہی کھاتے ہیں۔تھوڑی دیر گپ شپ بھی ہوجاتی ہے، تم بھی آجانا منگل کو؟'' انہوں نے مجھے منگل کو گھر آنے کی دعوت دی تو میں نے ہاں کردی۔

چیمہ صاحب رات کو ٹیکسی چلاتے تھے۔ ہفتے میں 6 دن کام کرتے تھے اور ایک دن چھٹی کرتے تھے۔ اس دن وہ کھانا بناتے تھے اور کچھ نزدیکی دوست اکٹھے ہوکر رات کو اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔انہوں نے شہر کے اندر ایک گھر کرائے پر لیا ہوا تھا۔ دو کمروں کا مکان تھا اور وہ اکیلے ہی رہتے تھے۔ ہفتے میں ایک دن یار دوست اکٹھے ہوجاتے تھے تو ان کا دل لگ جاتا تھا۔سرفراز (بِلا) نے بھی ادھر ہی شادی کرلی تھی اور وہ جرمنی کے ویزے کے لئے ٹرائی کررہا تھا۔ دو دن میں ادھر کرکٹ کھیلنے ہی آتا رہا اور پھر منگل کو چیمہ صاحب کے گھر چلا گیا۔سرفراز بھی ادھر آیا ہوا تھا۔داڑھی مونچھ اس کی بھی نکل آئی تھی اور جوان ہوکر کافی ہینڈسم ہوگیا تھا۔

''جی تو راضی صاحب! آپ کے لئے کام کا میں نے بندوبست کرلیا ہے۔'' ظفر بھائی گھر میں داخل ہوئے تو ان کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے فوراً ہی مجھے خوشخبری سنادی۔

''واقعی! بڑی جلدی کام کا بندوبست ہوگیا۔کدھر کام نکالا ہے اس کے لئے؟'' چیمہ صاحب بھی کچن سے باہر آگئے۔

''بھائی صاحب کے پاس، ان کے ریسٹورنٹ میں ویٹر کی ضرورت ہے۔ میں نے ان سے بات کی تو وہ مان گئے ہیں۔'' وہ تفصیل بتانے لگے۔

''ویٹر؟ لیکن اس کو تو جرمن زبان بھی نہیں آتی ہے، یہ ویٹری کیسے کرے گا؟'' چیمہ صاحب نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں! میں نے ان کو بتایا ہے کہ اسے ابھی صرف ایک مہینہ ہوا ہے۔ وقتی طور پر یہ صرف بار پر کام کرلے گا اور آہستہ آہستہ پھر باہر ویٹری پر آجائے گا۔محنتی لڑکا ہے، امید ہے کام جلدی سیکھ جائے گا۔''

ظفر بھائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کل شام کو 4 بجے تم ادھر اسٹیشن پر آجانا، میں کام سے چھٹی کر کے سیدھا ادھر ہی آجاؤں گا اور تمہیں لے کر ریسٹورنٹ چلا جاؤں گا۔ امید ہے تم بھائی صاحب کو پسند آجاؤ گے۔'' انہوں نے مجھے اگلے دن 4 بجے آنے کا کہا اور پھر دوسری باتوں میں مشغول ہو گئے۔

دوسرے دن وہ مجھے لے کر ریسٹورنٹ میں آگئے۔ یہ وہی انڈین ریسٹورنٹ ہے جہاں بیٹھ کر میں نے اپنی پہلی کتاب ''دوسرا خدا''، لکھی تھی۔ ریسٹورنٹ کے مالک کا نام گلشن کمار بھائیہ تھا۔ یہ 1970ء کے قریب جرمنی آئے تھے۔ انہوں نے انڈیا میں شادی کی تھی اور اپنی بیوی کو لے کر جرمنی آگئے تھے۔ ان کی دونوں بیٹیاں ادھر ہی پیدا ہوئی تھیں۔ ریسٹورنٹ کا عملی نظام ان کی بیوی سنبھالتی تھی جنہیں ہم سب ملازم میڈم کہتے تھے۔ ان کے کارل سروہے کے اندر تین اور سٹوٹ گارٹ میں دو ریسٹورنٹ تھے۔ اس کے علاوہ سٹوٹ گارٹ میں ہی ایک ہوٹل بھی تھا۔

کارل سروہے میں ٹوٹل صرف سات بڑے انڈین اور پاکستانی ریسٹورنٹ تھے جن میں سے تین ان کے ذاتی تھے۔ انہوں نے زیرو سے کام شروع کیا تھا اور آج یہاں کی امیر ترین ہستیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ایک کروڑ کی BMW ان کے پاس تھی جبکہ میڈم کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ وہ سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ ہندو، سکھ اور مسلم تینوں مذہبوں کے بارے میں نہ صرف بہت علم رکھتے تھے بلکہ ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ ان کی ساری زندگی پاکستانیوں میں گزری تھی اور اسلام سے بہت متاثر تھے لیکن مسلمان نہیں تھے۔ یہاں کچن میں تین لڑکے کام کرتے تھے۔۔۔ تندور والے کا نام لکھویندر تھا جسے ٹارزن کہا جاتا تھا اور باورچی کا نام سکھویندر تھا۔ یہ انڈین شہر موگا سے تھا جبکہ تندور والا امرتسر سے تھا۔ اس کا گاؤں راوی کے کنارے پر بارڈر سے صرف 2 کلومیٹر دور تھا۔ کچن میں برتن دھونے والا لڑکا ہریانہ سے تھا جبکہ ہمارا مالک چندی گڑھ سے تھا۔ باہر ویٹری پر تیونس کا لڑکا تھا۔ یہ مسلمان لڑکا تھا اور اس کے بال اور رنگ بالکل یورپی لوگوں کی طرح تھا۔

میں نے بھائیہ صاحب کو سلام کیا تو انہوں نے ہمیں اپنے سامنے بٹھا لیا۔ دو تین باتیں سمجھانے کے بعد انہوں نے مجھے میڈم کے حوالے کیا اور میڈم مجھے لے کر بار میں آگئی۔ انہوں نے چند موٹی موٹی باتیں سمجھائی اور مجھے ادھر ہی کھڑا کر دیا۔ پانچ بجے ریسٹورنٹ کھلتا تھا۔ ابھی چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے

زیادہ رش وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ پہلے گاہک شام کو سات بجے کے قریب آئے۔ تیونسی لڑکے نے ان سے جا کر آرڈر لیا اور مشین سے چٹ نکال کر مجھے پکڑا دی۔

''جرمن آتی ہے؟'' اس نے مجھے جرمن میں پوچھا۔

''مجھے تھوڑی تھوڑی جرمن زبان آتی ہے۔'' میں نے بھی جرمن زبان میں جواب دیا تو اس نے سر ہلا دیا۔

میڈم مجھے چٹ پڑھ کر سنانے لگی، چٹ کے اوپر انگلش ہی لکھی ہوئی تھی۔ کولا، فانٹا، بیئر اور شرابوں کے نام تو جرمنی اور انگلش دونوں زبانوں میں ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ جرمن زبان لکھی بھی انگلش کی طرح ہی جاتی ہے۔ اس کے A سے لیکر Z تک سبھی حروف انگلش والے ہی تھے۔ وہ مجھے مختلف شرابوں اور دوسرے سافٹ ڈرنک وغیرہ کی پوزیشن بتانے لگی۔ اس کے علاوہ وسکی والے گلاس میں وائین ڈال کر نہیں دے سکتے تھے۔

ظفر بھائی مجھے ادھر ہی چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے جبکہ میں رات تک ادھر ہی کام کرتا رہا۔ دو تین دن تک مسلسل کام کرنے کے بعد میڈم نے مجھے پاس کر دیا اور میں مستقل ادھر کام کرنے لگا۔ یہیں مجھے گھر سے میرے والد کا فون آیا اور انہوں نے مجھے ایمان کے شوہر اسلم کی وفات کی خبر دی۔ ایمان کو وہی 10 ہزار یورو میں خرید کر ہمارے گاؤں لایا تھا۔ ایسگارڈ روزانہ مجھے فون کرتی تھی، اس کا کیس چل رہا تھا اور اسے ملک سے باہر جانے پر پابندی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ روزانہ رات کو فون کرتی اور کتنی دیر تک کچھ بھی کہے بغیر بس روتی ہی رہتی تھی۔

''راضی صاحب! لگتا ہے آپ نے ہمارے بغیر ہی جینا سیکھ لیا ہے؟'' وہ شکوہ کرتی رہتی لیکن میں بھی مجبور تھا، میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے محبت کا یہ روگ خود ہی لگایا تھا اور اب اس کی سزا بھگت رہی تھی۔ وقاص کو بھی فرانس میں کوئی کام نہ ملا تو وہ بھی ادھر جرمنی آ گیا۔ اس کا کیمپ بھی ہائیڈل برگ پڑا تھا لیکن اس کو رہائش سٹوٹ گارٹ میں ملی تھی۔ ایسگارڈ مسلسل کوشش کرتی رہی اور آخر کار وہ کامیاب ہو گئی۔ اس کا کیس ختم ہو گیا اور مونٹانا کی عدالت نے اسے ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے اپنا پاسپورٹ لیا اور دوسرے دن ہی جرمنی پہنچ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ میں کارل سروہے میں رہتا ہوں اور اسے میرے ریسٹورنٹ کا بھی پتہ تھا، اس لئے وہ مجھے بتائے بغیر ہی سیدھی میرے ریسٹورنٹ پر ہی پہنچ گئی۔

''کیسے ہو؟ آپ نے تو ہمارے بغیر جینا سیکھ لیا تھا لیکن یہ ایسگارڈ تو آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''
میڈم اسے دیکھ کر کھڑی ہوئی تھیں لیکن اس نے میڈم کو بالکل نظرانداز کر دیا اور سیدھی میرے پاس بار کے اوپر آ کر رکی۔

''کیسی ہو ایسگارڈ؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

''راضی! دو سال ہو گئے ہیں تیری محبت سے بھاگتے بھاگتے لیکن دیکھ لو یار! ابھی تک ٹوٹے نہیں ہیں۔ ان دو سالوں میں کوئی ایک بھی پل ایسا نہیں گزرا جس پل تجھے میں نے یاد نہ کیا ہو۔ میں بہت محبت کرتی ہوں تم سے، تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں نکال سکتی۔'' وہ مجھ سے لپٹی سسکیاں لے رہی تھی۔

اس کے رونے کی آواز سے کچن والے بھی باہر آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ میرا مالک بھی باہر آ گیا تھا۔ میں اسے چپ کروانے لگا لیکن اسے کسی بھی چیز کا ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں کھوئی ہوئی مسلسل رو رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے یار! اور یہ کون ہے؟'' میرا مالک بھی اسے یوں روتا ہوا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ابھی شام کے صرف پانچ ہی بجے تھے اور کوئی بھی گاہک نہیں آیا تھا۔

''ایسگارڈ پلیز! یار اب چپ کر جاؤ۔۔۔ مجھے پہلے ہی بڑے دکھ ہیں۔ ایک تمہارا بھی درد اس میں شامل ہو گیا تو جینا بہت مشکل ہو جائے گا، مجھ میں ابھی ہمت نہیں ہے۔'' میں اسے چپ کروانے لگا۔

''کوئی بات نہیں یار! تھوڑی دیر رونے دو، بیچاری کا دل ہلکا ہو جائے گا۔'' میرے مالک کو کسی بات کا پتہ تو نہیں تھا لیکن وہ ایسی سچوایشن دیکھ کر کچھ سمجھ گیا تھا۔ ایسگارڈ ایسے ہی کچھ دیر تک مسلسل روتی رہی اور آہستہ آہستہ نارمل ہونا شروع ہو گئی۔ میں نے اسے اپنے سے الگ کیا اور اسے لے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کا ابھی تک مجھ سے دل نہیں بھرا تھا اس لئے وہ میرا ہاتھ پکڑے ابھی تک رو رہی تھی۔ میں اس کے کندھے کو دوسرے ہاتھ سے مسلسل تھپتھپا رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کا سارا اسٹاف ہمارے ارد گرد کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

''ایسگارڈ! پلیز یار، اب بس بھی کر دو۔۔۔ اور کتنا روؤ گی؟ میں نے پہلے دن سے ہی تمہیں بولا ہوا ہے کہ میرے راستے میں مت آؤ، میں نے ان محبت کے چکروں میں پڑنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ مجھے کسی کے بھی آنسو متاثر نہیں کرتے۔۔۔ تم جان بوجھ کر ہی اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہو۔'' میں اس سے الگ ہو کر کھڑا

ہو گیا۔ میں ایمان کے علاوہ اور کسی لڑکی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن ایسگارڈ زبردستی میری زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ مجھے میرے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''راضی صاحب! محبت پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔۔۔تم ایمان سے محبت کرتے ہو اور میں تمہیں اس محبت سے نہیں روکتی تو پھر تمہیں بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ تم مجھے کسی سے محبت کرنے سے روکو۔ مجھے کوشش کرنے دو اور محبت کا اختیار خدا پر چھوڑ دو، وہ کس کی محبت کس کی جھولی میں ڈالتا ہے یہ اسی کا فیصلہ ہو گا۔ مجھے اپنی طرف سے تو کوشش کرنے دو۔۔۔'' وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی۔

''راضی صاحب! تمہیں امریکہ پہنچانے کی ذمہ داری لی ہے اور میں تمہیں امریکہ پہنچا کر رہوں گی۔ میں صرف اپنا کام کر رہی ہوں اور مجھے میرا کام کرنے دو۔ محبت کرنے والے اپنی خوشیاں نہیں ڈھونڈتے بلکہ اپنے محبوب کی خوشیوں پر جان دیتے ہیں۔ صرف محبوب کی خوشی ہی معنی رکھتی ہے، پھر چاہے وہ ہمارے ساتھ ہو یا کسی اور کے ساتھ، کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ تب تک میڈیم پانی کا ایک گلاس لے کر آ گئی تھی۔ میڈم نے گلاس اس کی طرف بڑھایا تو اس نے شکریہ کہہ کر گلاس میڈم کے ہاتھ سے پکڑ لیا اور خاموشی سے پانی پینے لگی۔

''چلو راضی! اتنی دور سے تم سے ملنے آئی ہوں، اپنا شہر تو دکھا ہی سکتے ہو؟ مجھے بھوک بھی بہت لگی ہوئی ہے۔۔۔کہیں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔'' وہ بالکل نارمل ہو گئی تھی۔

''یار! ابھی تو میں کام کر رہا ہوں، کھانا تم اسی ریسٹورنٹ میں ادھر ہی کھا لو۔ یہاں کا کھانا تمہیں بہت پسند آئے گا۔'' میں نے اسے ادھر ہی کھانا کھانے کا کہا۔

''اچھا! میں ادھر کھانا کھاؤں گی اور تم مجھے سروس دو گے، میرے آگے کھانا اور ڈرنک رکھو گے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''راضی صاحب! میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا چاہتی ہوں، کسی ویٹر کے ساتھ نہیں۔ کوئی بات نہیں راضی! تم آج کی چھٹی کر لو، کام ہم سنبھال لیں گے۔ تمہاری دوست آئی ہے اسے شہر گھما لاؤ۔'' میرے مالک نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پاجی! میں آج چھٹی کر لیتا ہوں، کل پھر کام پر آ جاؤں گا۔'' میں نے اپنے مالک سے کہا

تو ایسگارڈ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''راضی صاحب! کام کو بھول جاؤ، اب پکی پکی چھٹی ہے۔ ہم نے جلد سے جلد ادھر شادی کرنی ہے اور جرمنی کا ویزہ حاصل کرنا ہے۔۔۔ تاکہ اس پر امریکہ کا ویزہ اپلائی کیا جا سکے۔ پیسوں کی فکر مت کرو، تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی ساری ذمہ داری اب میری ہے۔ محبت کرو یا نہ کرو وہ تمہاری مرضی ہے لیکن ایک دوست ہونے کے ناطے مجھے تو مدد کرنے دو۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''سر جی! یہ اب کام پر نہیں آئے گا۔ معذرت کے ساتھ۔۔۔ آپ کسی اور لڑکے کا بندوبست کر لیں۔'' وہ میرے مالک سے مخاطب ہونے لگی۔

''لیکن ایسے اچانک کیا بات ہو گئی ہے؟'' مالک کو ابھی تک کسی بھی بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی بلکہ مالک کیا کسی کو بھی اس پوری بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ میں نے کبھی کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ بس خاموشی سے اپنا کام کرتا تھا اور کبھی بھی اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا تھا۔

''پا جی! اصل میں میں جرمنی آیا ہی اس لئے تھا تاکہ ایسگارڈ سے شادی کر سکوں۔ یونان میں شادی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے میں جرمنی آ گیا۔ یہ مجھے یونان سے جرمنی لے کر جا رہی تھی اور مقدونیا میں پکڑی گئی۔ امریکن گورنمنٹ اسے مقدونیا سے چھڑوا کر تو لے گئی تھی لیکن اس پر یورپ جانے کی پابندی لگ گئی تھی اور یہ یورپ نہیں آ سکتی تھی۔ اب چونکہ اس کا کیس ختم ہو گیا ہے اور یہ ادھر آ گئی ہے، میں اس سے شادی کر کے امریکہ جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے اپنے مالک کو پوری بات سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے یار! اگر میری کسی جگہ پر ضرورت ہو تو بلاتکلّف بتا دینا، میں آپ کی مدد کر کے خوشی محسوس کروں گا۔'' انہوں نے کھلے دل سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی جی پا جی! آپ بہت اچھے اور مہربان ہو۔'' میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا! تم بہت اچھے لڑکے ہو، اپنا کام بھی بہت ایمانداری سے کرتے رہے ہو۔ تم جیسے لڑکے کام کے لئے بہت مشکل سے ملتے ہیں۔ ادھر آؤ ایک منٹ میرے ساتھ۔۔۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کیش کاؤنٹر پر لے گئے اور انہوں نے اس میں سے 500 یورو نکال کر مجھے پکڑا دیئے۔

''رکھ لو بیٹا! لڑکی کو باہر کھانا وغیرہ کھلاؤ اور رات کو ادھر میرے گھر ہی آ جانا۔۔۔ میں تم دونوں کے لئے ایک کمرہ خالی کر دیتا ہوں۔ ہوٹل میں مت رہنا کیونکہ وہاں بہت خرچہ ہوتا ہے۔'' انہوں نے مجھے سمجھاتے

ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے پا جی! آپ فکر مت کریں، میرے ایک دوست ادھر ہی کارل سرو ہے میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس دو کمروں کا مکان ہے اور وہ اکیلے ہی رہتے ہیں۔ ایک کمرے میں ہم شفٹ ہو جائیں گے۔'' میں نے ان سے پیسے لیتے ہوئے کہا۔

''کون لڑکا ہے جس کے پاس دو کمروں کا مکان ہے؟'' انہوں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

جرمنی میں واقعی اکیلے آدمی کا دو کمروں والے مکان میں رہنا حیرانگی کی بات ہی تھی۔ جرمنی میں کرائے پر مکان بہت مہنگے تھے۔ یہاں زیادہ تر دو لڑکے مل کر ایک سنگل کمرے والا مکان لیتے ہیں جس کے اندر ہی کچن اور باتھ روم ہوتا ہے۔ یہاں تو ایک کمرے میں چار پانچ لڑکے رہنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں لیکن جرمن گورنمنٹ دو سے زیادہ لڑکوں کو ایک کمرے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہاں مکان کا باقاعدہ کرایہ نامہ بنتا ہے اور پھر تھانے میں اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ آپ کو مالک مکان ایک فارم دیتا ہے اور اسی فارم کے پر ہی آپ کو ملازمت بھی ملتی ہے۔ یعنی بغیر مکان کے آپ کو پورے جرمنی میں کہیں بھی ملازمت نہیں ملتی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی دوست کے گھر رہ رہے ہوں اور کام کر رہے ہوں۔ اگر آپ اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کے پاس رہ رہے ہوں تب بھی باقاعدہ اس کا اندراج ہوتا ہے۔

''پا جی! فیاض چیمہ کی بات کر رہا ہوں، وہی جو ٹیکسی چلاتے ہیں۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ اچھا! میں جانتا ہوں ان کو۔۔۔ بہت اچھے انسان ہیں۔'' مالک نے ان کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''وہ میرے علاقے بہاولپور سے ہیں پا جی! اور میری ان سے بہت دوستی ہے۔ ابھی پہلے میں انہی کے پاس ہی جاؤں گا۔ ظفر بھائی بھی ادھر ہی آ جائیں گے تو پھر آگے کا بھی ان سے مشورہ کر لیں گے۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ہاں! ظفر ان کاموں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ تین چار اچھے اچھے وکیلوں کو بھی جانتا ہے، تمہاری شادی والا کام ادھر آسانی سے ہو جائے گا۔''

''چلیں راضی! مجھے واقعی بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔ دفتر سے پاسپورٹ ملتے ہی سیدھی ایئر پورٹ گئی

تھی اور وہیں سے ہی پہلی دستیاب فلائٹ سے پہلے برلن آئی اور پھر برلن سے فرینکفرٹ آ گئی۔ ابھی فرینکفرٹ سے ٹیکسی لے کر کارل سروہے آئی ہوں۔'' فرینکفرٹ سے کارل سروہے 150 کلومیٹر کا سفر تھا اور وہ ٹرین کی بجائے ٹیکسی سے ہی آ گئی تھی۔ میں نے اپنے مالک اور میڈم سے اجازت لی اور اس کا بازو پکڑ کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔

باہر نکل کر سب سے پہلے میں اسے لے کر ایک ریسٹورنٹ پر گیا، جہاں بیٹھ کر ہم دونوں نے کھانا کھایا اور پھر ہم چیمہ صاحب کے گھر آ گئے۔ چیمہ صاحب رات کو آٹھ بجے ٹیکسی شروع کرتے تھے اور پوری رات چلاتے تھے۔ وہ ابھی تک گھر میں ہی تھے۔ ظفر بھائی کو بھی میں نے فون کر دیا تھا اس لئے وہ مجھ سے پہلے ہی ادھر پہنچ گئے تھے۔ میں نے جا کر ان سے ایسگارڈ کا تعارف کروایا اور پھر ان سے شادی کی تفصیل پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے جی ہمارے ہیرو کی! تم تو واقعی پورے ہیرو نکلے ہو۔۔۔ دو سال سے ہمارے ساتھ تھے لیکن ایک بار بھی کبھی ہم سے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی، اور اب اچانک ہی سب کچھ بتا رہے ہو؟'' میں نے اپنی بات مکمل کی تو چیمہ صاحب نے اٹھ کر میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا جبکہ ظفر بھائی اس دوران کسی سوچ میں گم تھے۔

''بھائی جان پلیز! آپ ہمارے لئے کچھ کر دو، میں جلد سے جلد اسے امریکہ لے کر جانا چاہتی ہوں۔'' اچانک ایسگارڈ نے اردو میں بولتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں تو شاید اتنے حیران نہ ہوئے ہوں گے لیکن میں اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ انتہائی روانی سے اردو بول رہی تھی۔

''یار! تم نے اردو کہاں سے سیکھی اور اتنی روانی سے کیسے بول رہی ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''راضی! جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر محبوب کی ہر چیز کو اپنانا پڑتا ہے۔ میں نے ان دو سالوں میں اردو سیکھ لی ہے۔۔۔ مجھے تو اردو لکھنی اور پڑھنی بھی آتی ہے۔'' اس نے ایک اور دھماکہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی! راضی کہہ رہا تھا کہ آپ کسی اچھے وکیل کو جانتے ہو؟ آپ ہمیں اس سے ملوا دیں تاکہ ہم جلد سے جلد شادی کر سکیں۔'' وہ دوبارہ ظفر بھائی سے پوچھنے لگی۔

''راضی یار! تمہیں جرمنی آنے سے پہلے کسی سے مشورہ لینا چاہیے تھا۔ یونان میں تم اس لئے شادی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ تمہیں وہاں سیاسی پناہ ملی ہوئی تھی۔ تمہارا یونان میں کیس چل رہا تھا اس لئے تم وہاں شادی

نہیں کر سکتے تھے۔ یہی کام تم نے ادھر جرمنی میں بھی آ کر کر دیا ہے۔ مہاجر تو تم ادھر بھی بن گئے اور تم نے پناہ کی درخواست بھی دی ہوئی ہے۔۔۔ یہاں بھی تو یونان والا حال ہی ہو گیا ہے۔ اگر تم نے ادھر شادی کرنی تھی تو پھر یہاں مہاجر کیوں بنے ہو؟ تم پچھلے دو سال سے مہاجر بن کر جرمنی میں پناہ لئے ہوئے ہو۔ یہاں بھی اب وہی مسئلہ ہو گیا ہے، تمہیں جرمنی کا ویزہ بہت مشکل ملے گا۔ سرفراز کی دو سال پہلے ادھر جرمنی میں ہی شادی ہوئی تھی اور وہ ابھی تک ویزے کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ ہاں! اگر تم شادی کر کے بچہ پیدا کر لیتے ہو تو اس بچے کو جرمن شہریت مل جائے گی اور ایک دو مہینے کے اندر اندر تمہیں بھی جرمنی کا پوری زندگی کا ویزہ مل جائے گا۔ تم پھر اس ویزے پر امریکہ جا سکتے ہو۔۔۔ چونکہ بچے کی ماں امریکن ہو گی اس لئے بچے کو امریکہ کی شہریت بھی مل جائے گی اور بچے کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی امریکن شہریت مل جائے گی۔ میرے خیال میں یہی سب سے بہترین طریقہ ہے؟'' انہوں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''نہیں ظفر بھائی! میں صرف شادی کروں گا۔۔۔ یہ صرف کاغذی شادی ہو گی اور ہم دونوں بچہ نہیں پیدا کر سکتے۔'' میں نے دوبارہ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

''یار! اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔۔۔ اگر تم میرے ساتھ کوئی جسمانی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تو کوئی بات نہیں، میں ڈاکٹر ہوں، مجھے اور بھی بہت سے طریقے آتے ہیں۔ میں کسی لیڈی ڈاکٹر کی مدد سے مصنوعی طریقے سے تمہارے بچے کی ماں بن جاؤں گی۔ جس دن تمہیں امریکن شہریت مل جائے تو بے شک مجھے چھوڑ کر چلے جانا! تم مجھ سے محبت کرو یا نہ کرو، میں تو کرتی ہوں نا؟ میں تمہارے بچے کو بھی تمہاری نشانی سمجھ کر اتنی ہی محبت کروں گی۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''یار! تم بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو۔ تم ابھی نوجوان ہو اور پروفیشنل ڈاکٹر بھی ہو، میں کیسے تمہاری ساری زندگی تباہ کر دوں؟ ایسگارڈ! میں محبت کرنے والا انسان ہوں اور تمہاری زندگی تباہ کر کے قیامت کے دن کسی مجرم کی طرح تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے اپنا ہاتھ اس سے چھڑوایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''یار! تم ایک منٹ ادھر آ کر میری بات سنو!'' ظفر بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوسرے کمرے میں لے آئے۔

''ہاں! اب بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟ اسے تو اردو آتی ہے، انگلش بھی آتی ہے اور جرمن زبان تو ویسے ہی انگلش سے ملتی جلتی ہے۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ اسے جرمن بھی آتی ہو۔'' انہوں نے مجھے ایک کرسی پر بٹھایا اور خود میرے سامنے بیٹھ گئے۔

''آپ کا اندازہ صحیح ہے پاجی! اسے جرمن زبان بھی آتی ہے۔''

''اوہ اچھا! لیکن اب مسئلہ کیا ہے؟ وہ امریکن ڈاکٹر ہے، اچھی خاصی امیر بھی لگ رہی ہے اور تم سے محبت بھی کرتی ہے تو اب تمہیں کیا تکلیف ہے؟ آرام سے شادی کرو، بچہ پیدا کرو اور امریکن شہریت لے لو۔ یار! دنیا امریکی پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرنے پر تیار ہو جاتی؟ اس امریکن پاسپورٹ کے لئے میں نے بیس بیس سال کے نوجوانوں کو اسّی اسّی سال کی بوڑھیوں سے شادی کرتے دیکھا ہے۔۔۔ تو پھر تمہیں کیا تکلیف ہے؟ یہ تو تم سے بھی چھوٹی ہے اور خوبصورت بھی۔۔۔ یقین کرو کہ میں نے اس سے زیادہ خوبصورت لڑکی ابھی تک یہاں پر نہیں دیکھی ہے۔'' انہوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''راضی یار! تم بہت اچھے لڑکے ہو، میری بہت عزت کرتے ہو اور میں بھی تمہیں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ یقین کرو یار! یہ لڑکی تمہاری زندگی بدل کر رکھ دے گی۔'' وہ مجھے سمجھا رہے تھے۔

''ظفر بھائی! ایسگارڈ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے اور مجھ سے محبت بھی بہت کرتی ہے۔ پتہ ہے پاجی! اس کے والد کی امریکہ میں کتنی زمین ہے؟ دو ہزار ایکڑ سے بھی زیادہ۔۔۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''2 ہزار ایکڑ۔۔۔ یہ کتنے مربع بنتی ہے؟'' وہ حساب لگانے لگے۔

''80 مربع زمین۔۔۔ ہمارے گاؤں کا جو سب سے امیر ترین آدمی ہے اس کی بھی ڈیڑھ مربع زمین ہے۔ فصل پر سپرے کرنے کے لئے ان کے پاس چھوٹا ہوائی جہاز ہے۔ اپنا ہوائی جہاز۔۔۔ جس سے یہ فصل پر سپرے کرتے ہیں۔'' میں نے مزید تفصیل بتائی تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔

''ظفر بھائی! سب کچھ ٹھیک ہے، صرف میں ہی کسی اور سے محبت کرتا ہوں اور یہ سب کچھ اسی محبت کے لئے کر رہا ہوں۔ ظفر بھائی! جب انسان کسی سے محبت کرنے لگتا ہے تو پھر تمام دنیاوی چیزوں کی وقعت اس کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتی، یہ تو پھر چند ایکڑ زمین ہے۔'' میں واپس دوسرے کمرے میں جا کر ایسگارڈ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ظفر بھائی بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئے۔

''راضی! پلیز مان جاؤ یار! اس کے علاوہ اور کوئی بھی راستہ ہمارے پاس نہیں ہے۔'' ایسگارڈ دوبارہ مجھے منانے لگی۔

''نہیں! میں کبھی بھی اس چیز پر نہیں مانوں گا۔ پچھلے دس سال سے کوشش کر رہا ہوں، اگلے دس سال بھی کوشش کروں گا لیکن تمہاری زندگی خراب کر کے اپنا خواب پورا نہیں کروں گا۔ امریکہ جانے والے انہی راستوں پر مر جاؤں گا لیکن کسی اور کو اس راستے پر قربان نہیں کروں گا۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''ظفر بھائی! کیا میں کسی طریقے یہاں سے میکسیکو نہیں جا سکتا؟ میکسیکو میں بہت ایجنٹ ہیں، کوئی نہ کوئی مجھے ادھر سے امریکہ کا بارڈر کراس کروا دے گا۔'' میں ظفر بھائی سے پوچھنے لگا۔

''یار! وہ راستہ بہت لمبا اور خطرناک ہے۔ پیسے بھی بہت زیادہ لگیں گے لیکن بحرحال تم قانونی طریقے سے میکسیکو پہنچ جاؤ گے۔ پھر وہاں سے آگے امریکہ تم کسی ایجنٹ کے ذریعے بارڈر کراس کر لینا!''

''جی! جی! آپ بتاؤ کونسا راستہ ہے؟ پیسے کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ یہ اگر قانونی طریقے سے میکسیکو تک آ جائے گا تو اس سے آگے بھی کوئی راستہ نکل آئے گا۔'' ایسگارڈ نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں بتا دیتا ہوں۔۔۔ یہ زیادہ سے زیادہ 4 مہینے کی گیم ہے۔ چار مہینے کے اندر اندر تمہیں میکسیکو کا ویزہ مل جائے گا۔ لیکن یاد رکھنا! میکسیکو سے امریکہ جانا بہت خطرناک ہے۔ میکسیکو امریکہ کا بارڈر دنیا کا خطرناک ترین بارڈر ہے۔ USBP(United States Border Petrol) والے بارڈر کراس کرنے والوں کو بغیر کسی وارننگ کے گولی بھی مار دیتے ہیں۔ ان کے سنائپر ڈائریکٹ گولی مارتے ہیں۔ تم نے پاکستان سے لے کر جرمنی تک قریباً 10 بارڈر غیر قانونی کراس کئے ہوں گے لیکن وہ بارڈر ان سب سے خطرناک ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ کراس ہونے والا اور سب سے زیادہ مہاجرین کا قاتل وہی بارڈر ہے۔ ایک بار سوچ لو، پھر فیصلہ کر لینا!'' امریکہ کی USBP والے کسی بھی مہاجر کو بارڈر کراس کرتے ہوئے گولی مار سکتے تھے اور ان کو کوئی بھی نہیں پوچھتا تھا۔

''نہیں بھائی! میں نے سوچ لیا ہے۔۔۔ آپ میکسیکو جانے کا راستہ بتائیں، آگے کا بھی کوئی راستہ نکل آئے گا۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا تو وہ میکسیکو کا ویزہ حاصل کرنے کا طریقہ بتانے لگے۔

''میکسیکو جانے کے لئے شادی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم یہاں سے اٹلی جاؤ گے اور اٹلی میں سیاسی پناہ کی درخواست دو گے۔ دو مہینے تم کو اٹلی کے کسی ریڈ کراس کے کیمپ میں گزارنے ہوں گے۔ دو مہینے تک

تمہارے فنگر پرنٹ، تصویریں اور میڈیکل وغیرہ ہو جائے گا تو وہ تمہیں 6 مہینے کا مہاجرین کا کارڈ دیں گے۔ اٹلی کی سجورنو (سیاسی پناہ کا کارڈ) بالکل جرمن کے سیاسی پناہ کے کارڈ کی طرح ہوتی ہے۔ وہ بھی سیاسی پناہ کا کارڈ ہے اور یہاں بھی تمہارے پاس سیاسی پناہ کا کارڈ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اٹلی والے آپ کو اپنی سجورنو پہ پورے یورپ میں جانے کی اجازت دیتے ہیں اور آپ پورے یورپ میں کہیں بھی قانونی طریقے سے جا سکتے ہیں لیکن کام نہیں کر سکتے۔ جبکہ جرمنی کے سیاسی پناہ کے کارڈ پر آپ جرمنی سے باہر نہیں جا سکتے۔ چونکہ سارے ہی مہاجرین پہلے اٹلی میں ہی داخل ہوتے ہیں اس لئے اٹلی کو اس چیز کی چھوٹ دی ہوئی ہے۔ آپ اس کی سجورنو پر اپنے دوسرے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی جا سکتے ہیں لیکن آپ ادھر کام نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کہیں بھی کام کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو وہ پکڑ کر واپس اٹلی ڈی پورٹ کر دیتے ہیں اور پھر دوبارہ تم اس ملک میں نہیں سکتے۔ ٹھیک ہے! یہاں تک سمجھ گئے ہو؟'' ظفر بھائی نے اپنی گفتگو کو ایک وقفہ دیتے ہوئے پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب انہوں نے مزید بتانا شروع کیا۔

''دو مہینے اٹلی میں گزار کر جب تمہیں چھ مہینے کی اٹلی کی سجورنو مل جائے گی تو تم اس سجورنو پر ڈنمارک جاؤ گے اور اپنے اور ایسگارڈ کے کاغذات ادھر جمع کروا کر میرج بک لو گے۔ یہ یورپ میں شادی کرنے کا اجازت نامہ ہوتا ہے۔ تمہارے پاس اٹلی کی سجورنو ہو گی اور تم قانونی طور پر ڈنمارک میں گئے ہو گے تو وہ تم دونوں کے کاغذات کی تصدیق کریں گے۔ تصدیق کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر تمہیں میرج بک دے دی جائے گی جس کی فیس تقریباً ایک ہزار یورو ہو گی۔ میرج بک حاصل کرنے کے بعد تم پورے یورپ میں کہیں بھی شادی کر سکتے ہو لیکن تم نے شادی نہیں کرنی ہے۔ اگر شادی کرو گے تو سرفراز کی طرح پھنس جاؤ گے۔ دو دو سال لگ جاتے ہیں جرمنی کا ویزہ حاصل کرنے میں۔۔۔ تم اٹلی کی سجورنو، میرج بک اور سبرینہ کے سارے کاغذات لے کر پولینڈ جاؤ گے اور وہاں سے ایک وکیل کے ذریعے پولینڈ کا ویزہ اپلائی کرو گے۔ وکیل تمہیں ایک مہینے کے اندر اندر پولینڈ کا دو سال کا ویزہ لے کر دے دے گا۔ اب تمہارا مہاجر کا سٹیٹس ختم ہو جائے گا اور تمہارے پاس یورپ کا دو سال کا ویزہ ہو گا۔ تمہیں وہ سب سہولتیں میسر ہوں گی جو ایک اوریجنل طریقے سے ویزہ لے کر یورپ آنے والے کو حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے بعد تم امریکہ، کینیڈا، اور آسٹریلیا کے علاوہ کسی بھی ملک کا ویزہ حاصل کر سکتے ہو۔ یہ تینوں ملک چونکہ یورپی یونین سے بڑے اور امیر ملک ہیں اس

لئے تمہیں ان ملکوں کے ویزے نہیں ملیں گے۔تم آرام سے میکسیکو کا ویزہ حاصل کر سکتے ہو اور وہاں سے پھر آگے امریکہ کے لئے ٹرائی کر لینا! ویسے اگر تمہارا پولینڈ کا دو سال کا ویزہ ختم ہو گا تو پھر جب پانچ سال کا یورپی یونین کا ویزہ ملے گا تو پھر اس پر تم امریکہ کے ویزے کیلئے اپلائی کر سکتے ہو۔پچھلے دو سال کا ٹیکس اور اگلے ایک سال کے کام کا کنٹریکٹ ساتھ لگاؤ گے تو انتہائی آسانی سے امریکہ کا ویزہ مل جائے گا۔آگے جیسے تمہاری مرضی ۔۔۔دو سال انتظار کر کے آرام سے قانونی طریقے سے امریکہ جانا ہے یا فوراً میکسیکو کا بارڈر کراس کر کے جانا ہے۔'' انہوں نے اپنی بات مکمل کی اور ہم دونوں کے چہروں کی طرف دیکھنے لگے۔

''ظفر بھائی! میرج بک ادھر جرمن سے نہیں بن سکتی؟ ادھر تو یہ قانونی طور پر رہ رہا ہے۔ہمیں اٹلی اور پھر ڈنمارک جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے؟''

''نہیں! جرمنی آپ کو میرج بک دیتے دیتے ہی پورا سال لگا دے گا کیونکہ اس کی انکوائری بہت سخت ہے۔صرف ڈنمارک ہی وہ واحد ملک ہے جو بہت نارمل انکوائری کرتے ہیں اور وہاں کا قانون بھی زیادہ پیچیدہ نہیں ہے۔ایک اچھا وکیل ہو تو آپ کو 3 دن میں میرج بک مل سکتی ہے۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''راضی! یہ سب سے سیدھا راستہ ہے۔ایک بار پولینڈ کا ویزہ مل گیا تو تمہاری ان سب چیزوں سے جان چھوٹ جائے گی۔'' اس بار چیمہ صاحب نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا تو میں نے ہاں کر دی۔

''ٹھیک ہے پا جی! دو دن بعد جرمن جج کے سامنے میرا آخری انٹرویو ہے، میں وہ انٹرویو دے دوں۔۔۔اگر مجھے یہیں مزید پناہ مل گئی تو ان سب چیزوں سے جان چھوٹ جائے گی۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں! ٹھیک ہے، جج کے سامنے اچھی سی کہانی بنا کر پیش کرنا! ہو سکتا ہے کہ وہ متاثر ہو جائے اور تمہیں جرمنی کا ویزہ دے دے۔اگر ایسا ہی ہوا تو تم ڈائریکٹ ادھر سے میکسیکو جا سکتے ہو۔جرمن ویزے کی بڑی ویلیو ہوتی ہے لیکن بحرحال ملتا نہیں ہے۔جرمنی پاکستانی مہاجرین کے زیادہ تر کیس مسترد کر دیتا ہے۔'' چیمہ صاحب نے فکرمندی سے کہا اور اٹھ کر کچن میں چلے گئے اور رات کا کھانا تیار کرنے لگے۔جبکہ ہم تینوں میں، ایسگارڈ اور ظفر بھائی بیٹھ کر گپ شپ لگانے لگے۔ظفر بھائی نے ابھی تک امریکہ نہیں دیکھا ہوا تھا، وہ انہیں مونٹانا آنے کی دعوت دینے لگی۔

''ظفر بھائی! کتنی عجیب بات ہے کہ آپ کو امریکہ جانے کے لئے کسی ویزے کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن آپ پھر بھی امریکہ نہیں جاتے؟ ایک میں ہوں جو پچھلے دس سال سے امریکہ جانے کے لئے مر رہا ہوں لیکن پھر بھی ابھی تک ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکا۔'' میں نے کمرے کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''امریکہ کی جھلک؟ یہ بھی تو امریکی ہی ہے نا! یہ کونسی افغانستان سے آئی ہوئی ہے۔'' انہوں نے ایسگارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو ہم سب مسکرانے لگے۔

دو دن تک میں ادھر ہی چیمہ صاحب کے گھر میں ٹھہرا رہا۔ انہوں نے ہم دونوں کے لئے ایک الگ کمرہ خالی کر دیا تھا۔ ایسگارڈ میری ذہنیت سمجھ گئی تھی اور ہم دونوں ایک ہی بیڈ پر سوتے ہوئے بھی ایک ساتھ نہیں ہوتے تھے۔ میری ایسگارڈ سے دوستی بہت بڑھ گئی تھی اور وہ ایک دوست ہی کی طرح مجھ سے چمٹی رہتی تھی۔ دو دن بعد میرا سیاسی پناہ کے لئے مین انٹرویو آ گیا تھا اور میں اگلی صبح 7 بجے ہی ادھر پہنچ گیا۔

یہ بہت بڑی بلڈنگ تھی اور اس کے اندر ایک فلور پر کم از کم بیس کمرے تھے، جس میں اتنی ہی تعداد میں جج ان کمروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر لڑکے کو ایک جج اور ایک ترجمان ملتا تھا اور اس جج کے پاس ہماری پوری فائل ہوتی تھی۔ اندر کمرے میں میرے ساتھ جج اور ترجمان کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا۔ یہاں پر ایک مخصوص وقت ہوتا ہے۔ جج آٹھ بجے سے لے کر پانچ بجے تک بیٹھتا ہے اور وہ سائل کی ہر بات سنتا ہے۔ سائل ایک گھنٹے میں اپنی کہانی بیان کرے یا 8 گھنٹے میں، جج اور ترجمان سائل کو پورا ٹائم دیتے ہیں۔

ٹھیک آٹھ بجے مجھے ایک کمرے میں بلا لیا گیا۔ میرا ترجمان KPK کا ایک پٹھان تھا اور بہت ہی اچھا آدمی تھا۔ اس نے اپنا اور جج کا تعارف کروایا اور مجھے کرسی پر سامنے بٹھا کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہماری دوسری طرف کمپیوٹر کے سامنے ایک نوجوان جج بیٹھا ہوا تھا۔ سب سے پہلے سوالات کی باری جج کی تھی۔ جج نے سوالات شروع کئے تو میں ان کے جوابات دینے لگا۔ ان کے سارے ہی سوالات میرے پاسپورٹ اور شناختی کاغذات کے متعلق تھے۔ میں کہاں سے آیا ہوں، کن کن ممالک سے گزر کر آیا ہوں، یورپی یونین کے کس کس ملک میں میری انگلیوں کے نشانات ہیں اور کہاں کہاں میں نے سیاسی پناہ کے لئے درخواست دی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان کے پاس میرا پورا ڈیٹا موجود تھا۔

یورپی یونین کے رکن ممالک ایک دوسرے سے معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اگر آپ کے یونان میں انگلیوں کے نشانات موجود ہیں تو پورے یورپی یونین میں اندارج ہو گا۔ یورپ کے کسی بھی ملک کے چھوٹے

سے چھوٹے تھانے میں بھی صرف ایک گھنٹے کے اندر آپ کی انگلیوں کے نشانات آ جائیں گے۔ اس کے علاوہ آپ کی فائل بھی ۔۔۔ کہ آپ کدھر کدھر رہے ہیں اور کہاں کہاں کام کیا ہے۔ یورپ کی یہی سیکورٹی اسے محفوظ بناتی ہے۔

جج ایک گھنٹے تک گھما پھرا کر وہی سوالات کرتا رہا کہ میرے پاس پاسپورٹ یا شناختی کارڈ کیوں نہیں ہے۔ جرمن حکومت ہمیشہ پاکستانی شہریت کا ثبوت تلاش کرتی رہتی ہے تا کہ آپ کو واپس پاکستان ڈی پورٹ کیا جا سکے۔ بغیر پاکستانی پاسپورٹ یا شناختی کارڈ کے ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ ہم پاکستانی ہیں یا انڈین ۔۔۔ اسی وجہ سے ہماری پاکستانی حکومت ان لڑکوں کو قبول نہیں کرتی۔ اس جج کی بھی یہی کوشش تھی کہ کسی طریقے سے میں کوئی پاکستانی دستاویز اس کے حوالے کر دوں تا کہ جرمن گورنمنٹ مجھے پاکستان ڈی پورٹ کر سکے، لیکن میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے رضوان علی گھمن! آپ کے پاس کوئی بھی پاکستانی ڈاکومنٹ نہیں ہے۔ بغیر کاغذات کے آپ کا کیس پاس نہیں ہو گا لیکن پھر بھی آپ اپنی کہانی سنا سکتے ہیں۔'' جج نے مجھے اپنی کہانی سنانے کا کہا تو میں اسے اپنی کہانی سنانے لگا۔

ایمان کی ہمارے گاؤں سے آنے سے لے کر میرے جرمنی پہنچنے تک ۔۔۔ میں انہیں پوری تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ صرف بیچ میں ایسگارڈ اور امریکہ کی کہانی گول کر گیا۔ کیونکہ امریکہ اور ایسگارڈ کی کہانی کو بیان کرنے کا یہاں کوئی مقصد نہیں تھا۔ مجھے اس پوری کہانی کو سنانے میں تین گھنٹے لگے۔ درمیان میں جج مختلف سوالات پوچھتا رہا جن کے میں جوابات دیتا رہا۔ بارہ بجے تک میں نے اپنی کہانی مکمل کر لی تو جج اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تقریباً تین چار منٹ رکنے کے بعد وہ دوبارہ اندر آ گیا۔

''رضوان علی گھمن! تمہاری کہانی بہت متاثر کن ہے، شروع سے لے کر آخر تک انسان کو بٹھائے رکھتی ہے۔ تمہارے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا ہے اور میں دل سے تمہارے ساتھ ہوں لیکن بہر حال! تمہارا کیس مسترد ہو جائے گا۔ پاکستان میں تمہاری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ محبت کی کہانیوں میں بہت جان ہوتی ہے لیکن سیاسی پناہ کے لئے کسی ٹھوس ثبوت کی ضرور ہوتی ہے۔ ویسے بھی جرمن گورنمنٹ پاکستانی لڑکوں کا کیس پاس نہیں کرتی کیونکہ آپ لوگ صرف پیسہ کمانے کے لئے جرمنی آتے ہو۔'' جج نے میرا نام کاغذات پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں سر! آپ کے ملک نے دو سال مجھے مہاجر بنا کر رکھا اور یہاں پر سہولت دی۔۔۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ابھی کسی اور ملک جا کر کوشش کرتا ہوں، کوئی تو ایسا ملک ہوگا جو ہم پاکستانیوں کو بھی قبول کر لے گا!'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''چلو دیکھتے ہیں۔۔۔ میں تمہارا کیس بنا کر آگے امیگریشن آفس کو بھیجوں گا، باقی ان کا فیصلہ ہے۔ صرف عرب ملکوں سے آنے والے مہاجرین کو ہی میں ڈائریکٹ پاس کر سکتا ہوں۔ پاکستانیوں کو ڈائریکٹ فیل تو کر سکتا ہوں لیکن پاس نہیں کر سکتا۔ میں تمہارا مثبت کیس بنا کر آگے امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کو بھیج دیتا ہوں، آگے ان کی مرضی ہے۔ایک مہینے کے اندر اندر آپ کے کیس کا فیصلہ آ جائے گا۔95 فیصد چانس فیل ہونے کے ہیں اور 5 فیصد چانس پاس ہونے کے ہیں۔کوئی اور بات پوچھنی ہے تو پوچھ لو ورنہ آپ جا سکتے ہو؟'' جج نے میرے طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی سر! صرف ایک اور بات کرنی ہے۔'' جج میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''سر! میرا ایک چھوٹا بھائی تھا احمد۔۔۔ ایرانی کرد تھا اور اسے جرمنی سے بہت محبت تھی۔ یونان آنے کے لئے ہم اکٹھے ہی سپیڈ بوٹ پر بیٹھے تھے۔ہم 31 لڑکے اس رات یونان جانے کے لئے سپیڈ بوٹ میں بیٹھے تھے لیکن سپیڈ بوٹ الٹ گئی اور سبھی لڑکے ڈوب گئے۔اس رات 31 لڑکوں میں سے صرف سات لڑکے ہی زندہ بچ سکے تھے جبکہ باقی سب سمندر کی لہروں کی نظر ہو گئے تھے۔ان میں سے ایک احمد بھی تھا۔6 گھنٹے تک لگاتار میں اسے لے کر لہروں سے لڑتا رہا لیکن آخر ہار گیا۔میرے ہاتھوں سے جب اس کا ہاتھ نکلا اور وہ نیچے لہروں کی طرف جا رہا تھا تو اس وقت میں اسے بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔وہ میرے سامنے ڈوب رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اس کا ہاتھ ہی تھام سکتا۔'' انہیں بتاتے بتاتے میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

''سر! میں اسے روکنا چاہتا تھا کیونکہ وہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔اس کی جگہ پر خود مر جانا چاہتا تھا لیکن مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ ہی تھام لیتا۔وہ مر گیا اور اس کا چہرہ آج بھی مجھے راتوں کو خواب میں آتا ہے۔سر! اسے جرمنی سے بہت محبت تھی اور وہ اسی محبت کی بھینٹ چڑھ گیا۔آج سوچتا ہوں کہ اچھا ہوا وہ وہیں مر گیا ورنہ آج جب اس کا کیس ایسے ہی مسترد ہوتا تو وہ دکھ سے ہی مر جاتا۔۔۔لیکن میں بہت مضبوط ہوں، اتنی جلدی مروں گا نہیں۔ایک سے دوسرے ملک کی طرف بھاگتا ضرور رہوں گا لیکن

ٹوٹ کر کبھی ہمت نہیں ہاروں گا۔احمد کے ساتھ اچھا ہوا جو وہ سمندر میں ہی ڈوب کر مر گیا ورنہ آپ لوگ اسے ویسے ہی مار دیتے۔'' میں نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی سے آنسو صاف کیئے اور خاموشی سے باہر نکل کر ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھ گیا۔میرے پیچھے پیچھے میرا پٹھان ترجمان بھی میرے سارے کاغذات لے کر آ گیا۔میں نے اس سے اپنے کاغذات پکڑے اور عمارت سے باہر نکل آیا۔

ایسگارڈ صبح سے باہر بیٹھی ہوئی میرا انتظار کر رہی تھی۔اس نے ایک کار پورے ایک ہفتے کے لئے ہی کرائے پر لی ہوئی تھی اور ابھی بھی اسی کار کے پاس کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔میں بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

''کیا ہوا راضی؟ کوئی چانس ہے تمہارا کیس پاس ہونے کا؟'' ایسگارڈ نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ایسگارڈ! کیا تم مجھے برلن لے کر جا سکتی ہو؟'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسگارڈ! میں جرمنی چھوڑنے سے پہلے ایک بار برلن جانا چاہتا ہوں۔۔۔صرف ایک بار دیوارِ برلن کے اوپر کھڑا ہو کر احمد کو پکارنا چاہتا ہوں۔ایسگارڈ میں۔۔۔میں باہر سے بہت مضبوط نظر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ایمان کے سوا اور کسی کی بھی محبت مجھ پر اثر نہیں کرتی لیکن نہیں! میں بھی انسان ہوں اور مجھے بھی چھوٹی چھوٹی محبتیں توڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔میں احمد سے بہت محبت کرتا تھا اور صرف ایک بار اس ایرانی لڑکے کے لئے برلن جانا چاہتا ہوں۔صرف ایک بار ایسگارڈ؟'' میں اس کے سینے سے لگا رونے لگا۔

مجھ سے اپنی بات مکمل نہ ہو سکی اور میں ایسگارڈ سے لپٹا روتا رہا۔ایسگارڈ دو تین منٹ تک ادھر ہی کھڑی مجھے دلاسہ دیتی رہی۔جب مجھے کچھ حوصلہ ہو گیا تو اس نے مجھے کار کی سیٹ پر بٹھایا، سیٹ بیلٹ باندھ کر دروازہ بند کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔کارل سروہے سے برلن 550 کلومیٹر دور تھا۔اس نے کار موٹروے پر ڈالی اور اسی وقت برلن کی طرف جانے لگی۔ہم لگاتار چلتے ہوئے 5 بجے کے قریب برلن پہنچ گئے۔اس نے برلن پہنچ کر ایک پیٹرول پمپ سے دیوارِ برلن کا پوچھا اور کار کو نیویگیشن پر لگا کر سیدھی دیوارِ برلن کے پاس پہنچ گئی۔

ایک بڑی دیوار جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔پوری دیوار رنگ برنگی پینٹنگ سے سجی ہوئی تھی۔دیوار کے سامنے ہی ایک بہت بڑا پارک تھا۔ایسگارڈ نے کار ادھر جا کر

پارک کی اور آہستہ سے میری طرف کا دروازہ کھول دیا۔اس نے مجھے باہر نکالا اور سہارا دیتے ہوئے مجھے دیوار کے پاس لا کر کھڑا کر دیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر دیوار کو چھونا شروع کر دیا۔انتہائی سخت سیمنٹ سے بنی ہوئی دیوار مجھے بہت نرم محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے احمد کے نرم گالوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ میرے سامنے کھڑا ہو۔

آخر میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور میں دیوار سے ٹیک لگائے نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ایسگارڈ بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔وہ میرے سینے پر سر رکھ کر میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ہم سے کچھ فاصلے پر نوجوان جوڑے دیوار کے اوپر چڑھے خوشی سے چلاّ رہے تھے اور تصویریں بنوا رہے تھے۔ میں اوپر اٹھا اور دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ میں ٹانگیں نیچے لٹکا کر دیوار پر بیٹھا ہوا تھا۔

''راضی بھائی! ایک دن دیوارِ برلن پر دونوں بھائی چڑھ کر چلاّئیں گے۔'' مجھے احمد کی باتیں یاد آنے لگیں۔اسے جرمنی آنے کا جنون تھا اور وہ اس ملک پر اپنی جان دینے پر تلا ہوا تھا۔وہی جرمنی جس نے آج مجھے مسترد کر دیا تھا۔

''احمد۔۔۔!'' میں اپنی پوری قوت سے چلایا۔

''احمد! دیکھ لو، آج تیرا بھائی دیوارِ برلن پر کھڑا تجھے پکار رہا ہے لیکن تم کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے ہو! کہاں ہو تم یار؟ صرف ایک بار اپنا چہرہ تو دکھا دو! دیکھو یار! آج تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لئے ترس رہا ہوں۔صرف ایک بار میں۔۔۔وہی زندگی سے بھرپور آنکھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔صرف ایک بار۔۔۔احمد!'' میں زور زور سے چلاّنے لگا۔

ایسگارڈ دوسری طرف سے دیوار پر چڑھ کر میری طرف آنے لگی لیکن میں اس کے آنے سے پہلے ہی نیچے گر گیا۔ یہاں دیوار کافی اونچی تھی اور مجھے کافی چوٹیں آ گئیں۔لوگ بھاگ کر میرے ارد گرد اکٹھے ہونا شروع ہو گئے اور مجھ سے خیریت پوچھنے لگے۔ میں جلدی سے دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔اتنی دیر میں ایسگارڈ بھی میرے پاس پہنچ چکی تھی اور وہ دوبارہ مجھے سہارا دینے لگی۔

''ایسگارڈ! اب جرمنی میں مزید رہنے کو دل نہیں کر رہا، مجھے یہاں سے لے جاؤ! میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں، اس ملک کو چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے لے جاؤ یہاں سے۔۔۔'' میں ایسگارڈ کے سہارے آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔

لوگوں کا کافی ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا، جب انہوں نے مجھے کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تو وہ واپس چلے گئے۔ جبکہ ایسگارڈ بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھی اور وہ کار سٹارٹ کر کے پارک سے باہر نکالنے لگی۔

''راضی اب کدھر جانا ہے؟'' دو تین منٹ تک میں کچھ سنبھل گیا تو وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔

''ابھی تو شام ہونے والی ہے، ہم رات ادھر برلن میں ہی رک جاتے ہیں۔ کل رات کو برلن سے نکلیں گے اور صبح صبح کونسٹانز چلے جائیں گے۔ وہاں سے سوئیزرلینڈ جانا بھی آسان ہے۔ وہ ایک ہی شہر دو ملکوں میں بٹا ہوا ہے اور وہاں کوئی بارڈر نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں کے اندر چلتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخل ہو گئے۔''

کونسٹانز شہر کی جھیل جرمنی کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ اس جھیل کے کنارے تین ملکوں جرمنی، آسٹریا اور سوئیزرلینڈ سے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ شہر زیورچ سے صرف 60 کلومیٹر دور ہے۔ زیورچ شہر سوئیزرلینڈ کی سیاحت کا مرکز سمجھا جاتا ہے اور پوری دنیا سے سیاح یہاں آتے ہیں۔ یہاں ہر وقت سیاحوں کی آمد و رفت رہتی ہے اور نہ ہی یہاں کوئی بارڈر ہے۔ کونسٹانز شہر میں چلتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلتا کہ آپ کس ملک میں چل رہے ہیں۔ جرمنی یا سوئیزرلینڈ کا صرف نقشہ دیکھ کر ہی پتہ چلتا ہے۔ بارڈر کے دونوں طرف پورے شہر میں جرمن زبان بولی جاتی ہے اور کرنسی بھی یورو ہی چلتی ہے۔

''ایسگارڈ! تم کار کسی ہوٹل کی طرف لے جاؤ۔۔۔ آج رات ادھر ہی گزارتے ہیں اور پھر کل رات کو کونسٹانز چلے جائیں گے۔'' میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! کل رات کو بھی جانا ہے تو پھر آج ہی کیوں نہیں؟ 6 گھنٹے کا تو سفر ہے، میں آسانی سے ڈرائیونگ کر سکتی ہوں۔ 12 بجے تک ہم آرام سے کونسٹانز پہنچ جائیں گے۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! ہم لوگ صبح 6 بجے کے اٹھے ہوئے ہیں۔۔۔ تم بھی تھک گئی ہو گی، اب تمہیں تھوڑا آرام کی ضرورت ہے۔'' میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! میں اتنی بھی نازک نہیں ہوں، 6 گھنٹے کی ڈرائیونگ تو آرام سے کر سکتی ہوں۔ اگر راستے میں تھک بھی گئی تو کار کسی پیٹرول پمپ پر روک کر گھنٹہ دو گھنٹے آرام کر لوں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور کار موٹروے پر ڈال کر کونسٹانز کی طرف بڑھنے لگی۔

کار کے اندر عاطف اسلم کے رومانٹک گانے لگے ہوئے تھے اور وہ اس ماحول میں خود بھی رومانٹک ہو

رہی تھی۔موٹروے پر سفر اتنا مشکل نہیں ہوتا ہے۔ہم بڑے آرام سے سفر کرتے رہے اور راستے میں کہیں بھی آرام کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے ظفر بھائی کو فون کر کے انہیں کونسٹانز اور پھر ادھر سے اٹلی جانے کا بتایا تو انہوں نے مجھے ایک ایجنٹ کا نمبر دے دیا۔ یہ کونسٹانز میں ہی رہتا تھا اور سوئیز رلینڈ کراس کروا کر اٹلی پہنچاتا تھا۔ میں نے ان سے نمبر لے کر ایجنٹ کو ملایا، اسے بتایا کہ میں کونسٹانز آرہا ہوں اور مجھے آگے اٹلی جانا ہے۔اس نے مجھے دوسرے دن 10 بجے جھیل پر ملنے کا کہا۔پیسوں وغیرہ کی بات ظفر بھائی نے ہی ان سے کر لی تھی اور گارنٹی بھی دے دی تھی۔

وہ کونسٹانز سے اٹلی کے شہر میلان تک کا ایک ہزار یورو لے رہا تھا۔ ویسے عام طور پر فی لڑکے کا بارڈر کراس کروانے کا ریٹ 300 یورو ہوتا ہے لیکن چونکہ میں اکیلا ہی جا رہا تھا اس لئے میں اسے پوری کار کا کرایہ ایک ہزار یورو دے رہا تھا۔اگر بس یا ٹرین کے ذریعے یہی سفر کیا جائے تو صرف 50 یورو کا کرایہ بنتا ہے۔ چونکہ ہمارے پاس کاغذات نہیں ہوتے اس لئے ہم بس یا ٹرین سے سفر نہیں کر سکتے۔رات کو بارہ بجے سے پہلے پہلے ہم کونسٹانز پہنچ گئے۔ یہاں پر ایسگارڈ نے ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا اور ہم دونوں کھانا کھا کر سو گئے۔

دوسرے دن صبح صبح اٹھ کر ہم دونوں جھیل کے کنارے پر پہنچ گئے۔ یہاں پیدل چلنے والوں کے لئے ایک چھوٹا سا فٹ پاتھ بنا ہوا تھا جس کے ساتھ ساتھ جھیل کے عین سامنے لکڑی کے بنچ رکھے ہوئے تھے۔صبح صبح ایسا لگ رہا تھا جیسے پورا شہر ہی ادھر آ گیا ہو۔لوگ ورزش کے لئے جھیل کے کنارے کنارے دوڑنا یا پیدل چلنا پسند کرتے تھے اور اسی وجہ سے یہاں بہت رش تھا۔ میں اور ایسگارڈ دونوں سوئیز رلینڈ والی طرف رکھے ہوئے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئے۔ ہمارے پیچھے ایک چھوٹا سا گراؤنڈ تھا جس کے ایک کنارے پر سوئیز رلینڈ اور جرمنی کا ایک چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا جبکہ ادھر جھیل کے کنارے پر کوئی بورڈ وغیرہ نہیں تھا۔البتہ جھیل کے اندر ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا جس کے اوپر تینوں ملکوں کے نام اور تیر کی مدد سے ان کی نشاندہی کی ہوئی تھی۔ میں اور ایسگارڈ پورے دس بجے ادھر آئے تھے،تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایجنٹ کا فون آ گیا۔ میں نے اسے جھیل کا بتایا تو وہ سیدھا ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''السلام وعلیکم! یہ لڑکی بھی آپ کے ساتھ ہے؟'' اس نے ہمارے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی! یہ میرے ساتھ ہی ہے لیکن یہ اپنی کار میں علیحدہ میلان میں جائے گی۔آپ کے ساتھ صرف

میں ہی جاؤں گا۔ پیسے بھی میلان پہنچ کر آپ کو یہی دے گی یا پھر آپ اپنا اکاؤنٹ نمبر دے دیں گے تو یہ آن لائن پیسے آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دے گی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، اس کو کہو کہ یہ ابھی ادھر سے نکل جائے اور میلان سینٹرل اسٹیشن کے باہر ایک میکڈونلڈ کی دوکان ہے، ادھر ہمارا انتظار کرے۔ ابھی ساڑھے دس بجے ہیں، ٹھیک تین بجے ہم میلان پہنچ جائیں گے۔ میلان یہاں سے صرف 4 گھنٹے کا سفر ہے۔'' اس نے مجھ سے اردو میں کہا تھا جسے ایسکارڈ سمجھ گئی اور وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''ٹھیک ہے راضی! میں نکل رہی ہوں۔ تین بجے سے پہلے ہی میں ادھر پہنچ جاؤں گی اور میکڈونلڈ میں ہی آپ کا انتظار کروں گی۔'' اس نے اردو میں کہا تو ایجنٹ حیرانگی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''یار! اسے اردو آتی ہے؟ شکر ہے میں نے کوئی غلط بات نہیں کی ہے۔۔۔کونسے ملک کی ہے؟'' وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔

''جرمنی کی ہے۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ویسے بھی اس کا اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

''اچھا! آپ کے پاس جرمنی کے کوئی کاغذات وغیرہ تو نہیں ہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

میرے سارے کاغذات ایسکارڈ نے لے لئے تھے اور وہ جاتے ہوئے ان کو ظفر بھائی کے گھر کے لئے پوسٹ کر دیتی۔ میرے پاکستانی کاغذات بھی پہلے اس کے پاس ہی تھے۔ ایجنٹ نے مجھے اک پاکستانی پاسپورٹ اور اٹالین کارڈ دیا۔ پاکستانی پاسپورٹ کے اوپر اٹلی کا ویزہ لگا ہوا تھا۔

''اس کا نام، والد کا نام اور تاریخ پیدائش اچھی طرح رٹ لو، اگر راستے میں کہیں گاڑی روکی گئی تو یہی نام و پتہ بتانا ہے۔ کار یہاں سے تھوڑی دور کھڑی ہے، تم میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ!'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور سوئیزرلینڈ کی طرف جانے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھوڑا فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔

کار جھیل سے تھوڑا ہٹ کر ایک گلی میں کھڑی تھی، اس نے کار سٹارٹ کی تو میں دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اس نے کار گلی سے باہر نکالی اور چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے ہوتا ہوا مین روڈ پر آ گیا۔ یہاں سے ہم پہلے زیورچ کی طرف گئے جو کہ کونسٹانز سے صرف آدھا گھنٹہ دور تھا۔ راستے میں پولیس کی کوئی

بھی چیکنگ نہیں تھی، وہ بڑے آرام سے مجھے زیورچ شہر لے آیا۔ ہم زیورچ شہر کے اندر نہیں گئے بلکہ باہر سے ہی لوگانو (Lugano) شہر جانے والی ہائی وے پر مڑ گئے۔ زیورچ شہر سے لوگانو 200 کلومیٹر دور ہے، ہمیں لوگانو پہنچنے میں دو گھنٹے لگے۔ زیورچ سے لوگانو کا سارا سفر ایلپس کے پہاڑوں کے درمیان ہے اور یہیں پر دنیا کی سب سے لمبی ریلوے سرنگ بھی ہے۔ جو گوٹھارڈ (Gotthard) سے لوگانو 57 کلومیٹر لمبی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے لمبی سرنگ ہے۔

لوگانو سوئیزرلینڈ کا انتہائی جنوبی شہر ہے اور یہاں اٹالین زبان بولی جاتی ہے۔ یہ لوگانو جھیل اٹلی اور سوئیزرلینڈ میں ہے۔ ہم نے پل کے اوپر سے جھیل کراس کی۔ دوسری طرف کا علاقہ بھی سوئیزرلینڈ میں شامل تھا۔ لوگانو سے مزید 25 کلومیٹر آگے کیاسو (Chiaso) کا ایک چھوٹا سا ٹاؤن تھا۔ یہ سوئیزرلینڈ کا آخری ٹاؤن ہے۔ سوئیزرلینڈ میں فرنچ، جرمن اور اٹالین تینوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کیاسو شہر بھی جرمن کونسٹانز شہر کی طرح سوٹس اور اٹلی دونوں ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اصل میں یہ اٹلی کا کومو (Como) شہر ہے۔ ایک لاکھ کی آبادی والا یہ شہر ہی دونوں طرف تھا۔ میرا ایجنٹ کیاسو ٹاؤن کی چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرتا ہوا اٹلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے میلان شہر مزید آدھا گھنٹہ دور تھا۔ ہم سوا تین بجے میلان شہر پہنچ گئے۔ اس نے کار ایک جگہ پر پارک کی اور مجھے لے کر اسٹیشن کی طرف چلنے لگا۔

میلان میں اسٹیشن کے سامنے ایک چھوٹا سا پارک بنا ہوا تھا۔ پارک سے میری مراد گھاس کے گراؤنڈ یا درخت اور جھولے نہیں ہیں۔ یہاں کوئی درخت یا جھولے نہیں تھے بلکہ پکا فرش تھا اور چار پانچ چھوٹے چھوٹے گھاس کے پلاٹ بنے ہوئے تھے۔ جن کے کنارے پر بیٹھنے کے لئے دو فٹ کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے آگے لکڑی کے بنچ بنے ہوئے تھے۔ یہ مسافروں اور دوسرے مقامی لوگوں کے لئے بنے ہوئے تھے تا کہ وہ ادھر آ کر آرام سے بیٹھ کر انتظار کر سکیں۔ پارک کے ایک کنارے پر سڑک کی دوسری طرف میکڈونلڈ تھا۔ وہ مجھے سیدھا ادھر ہی لے گیا۔ ایسگارڈ ہم سے پہلے ہی ادھر بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ڈرائیور نے مجھے اس کے حوالے کیا تو اس نے پرس سے سو سو یورو کے دس نوٹ نکالے اور اسے پکڑا دیئے۔ میں نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور وہ ہمیں سلام کر کے واپس چلا گیا۔

''اب آگے کیا ارادہ ہے؟ کدھر جانا ہے؟'' ایسگارڈ مجھ سے پوچھنے لگی۔

یہاں میلان میں سیاسی پناہ کی درخواست جمع تو ہو جاتی ہے لیکن چونکہ یہ بڑا اور مین شہر ہے۔ اس لئے

یہاں رش بہت زیادہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اٹالین سجورنو بھی دیر سے ملتی ہے۔ میں نے خلیل سے رابطہ کیا تھا اور اس نے بتایا کہ میں گوریزیا (Gorizia) چلا جاؤں، ادھر کام بہت تیزی سے ہوتا تھا۔ چونکہ ان دنوں ہنگری نے اپنے بارڈر پر ڈبل تار لگا کر پورا بارڈر سیل کر دیا تھا۔ سربیا سے ہنگری داخل ہونا ناممکن ہو گیا تو مہاجرین نے کروشیا (Croatia) کا رخ کر لیا تھا۔ وہ پہلے کروشیا جاتے، وہاں سے سلوینیہ (Slovenia) اور پھر وہاں سے اٹلی میں داخل ہو جاتے تھے۔ سلوینیہ سے اٹلی داخل ہوتے ہوئے سب سے پہلے گوریزیا کا چھوٹا سا شہر آتا تھا۔ مہاجرین یہیں پر اپنی سیاسی پناہ کی درخواست دے دیتے تھے۔

یہ بالکل چھوٹا سا شہر تھا اور اتنے مہاجرین کو نہیں سنبھال سکتا تھا۔ اس لئے اٹلی کی گورنمنٹ نے انہیں گوریزیا اور اڈینا (Udine) شہر میں دو سابقہ آرمی کیمپ اور چار پانچ چھوٹے چھوٹے کیمپ دے دیئے۔ اس کے علاوہ گوریزیا میں امیگریشن کا عملہ بھی چار گنا بڑھا دیا۔ بعد میں جب سربیا نے اپنے بارڈر پر سختی کر دی تو یہ روٹ مکمل طور پر بند ہو گیا۔ سلوینیہ کی طرف سے مہاجرین آنا تو مکمل طور پر بند ہو گئے لیکن امیگریشن کا عملہ ابھی تک وہیں تھا۔ اسی وجہ سے گوریزیا میں کیس انتہائی تیزی سے آگے بڑھتا تھا۔ پورے اٹلی میں جو سجورنو تین مہینے میں ملتی تھی وہ گوریزیا میں ایک مہینے میں مل جاتی تھی۔

''اب یہاں سے گوریزیا جانا ہے، یہ جرمن کار واپس کر وا اور میرے ساتھ ٹرین پر گوریزیا چلو۔ میں تو سیدھا تھانے چلا جاؤں گا تا کہ سیاسی پناہ کی درخواست دے سکوں اور تم ادھر گوریزیا کے کسی ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لینا! رات کو تو مجھے کیمپ میں ہی سونا پڑے گا البتہ دن کو میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں۔'' میں نے اسے بتایا تو وہ کار کمپنی کو فون کرنے لگی۔

اس کے پاس جرمنی کی ایک انٹرنیشنل کمپنی کی کار تھی۔ یہ کمپنی یورپی یونین کے 28 ملکوں میں اپنی سروس چلاتی تھی۔ آپ ان 28 ملکوں کے کسی بھی بڑے شہر سے کار لے سکتے تھے۔ کمپنی نے میلان شہر میں ہی ایک آفس کا پتہ سینڈ کیا تو ایسگارڈ انہیں کار واپس کرنے چلی گئی۔ میں ادھر میکڈونلڈ میں ہی بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا، اس کی واپسی 40 منٹ میں بعد ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہوا اور پھر اس کے ساتھ پلیٹ فارم پر آ گیا۔ میلان سے ڈائریکٹ گوریزیا کی ٹرین نہیں ملتی تھی بلکہ میلان سے پہلے وینس (Venice) جانا پڑتا تھا اور پھر وینس سے آگے گوریزیا کی ٹرین ملتی تھی۔ ایسگارڈ نے دو ٹکٹیں گوریزیا کی لیں اور ہم دونوں وینس جانے والی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ ہم نے ادھر سے ہی ٹکٹ لے لی تھی تا کہ آگے وینس سے نہ لینی پڑے۔ میلان سے

وینس کا سفر سوا دو گھنٹے کا تھا جبکہ وینس سے آگے گوریزیا مزید دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔

وینس شہر سمندر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جسے ایک پُل کے ذریعے باقی اٹلی سے جوڑا گیا ہے۔ یہ ایک پُل نہیں بلکہ ٹرین اور دوسری گاڑیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ پُل ہیں۔ وینس شہر دنیا کا سب سے خوبصورت ترین شہر ہے۔اس میں نہریں ہیں جو کہ سڑکوں کا کام کرتی ہیں۔ پورا شہر ہی سمندر کے اندر پانی پر بنا ہوا ہے۔ چونکہ میرے پاس اٹلی کے کاغذات نہیں تھے اس لئے میں شہر میں گھوم نہیں سکتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن جزیرے کے بالکل کونے پر ہی تھا۔ہم وینس شہر کے ریلوے اسٹیشن پر اترے اور گوریزیا جانے والی ٹرین پر بیٹھ گئے۔رات کو نو بجے تک ہم گوریزیا پہنچ گئے۔

میں نے اسٹیشن سے تھانے کا پتہ کیا جو کہ شہر کے دوسرے کنارے پر سلووینیہ کے بارڈر پر تھا۔ایسگارڈ اسٹیشن سے ہوٹل کی طرف چلی گئی۔ وہ آج رات کے لئے عارضی ایک کمرہ لے لیتی اور پھر کل دن کو جب میرا کیمپ کلیئر ہو جاتا (کہ میں کونسے کیمپ میں جا رہا ہوں) تو پھر وہ میرے کیمپ کے نزدیک ترین کسی ہوٹل میں کمرہ لے لیتی۔ میں نے ایک ٹیکسی لی اور تھانے چلا گیا۔ٹیکسی والے نے مجھے تھانے سے تھوڑی دور اتار دیا تو میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا تھانے پہنچ گیا۔

بیرونی گیٹ پر دو پولیس والے کھڑے تھے۔ میں نے ان سے سیاسی پناہ کا پوچھا تو وہ مجھے اندر لے گئے۔ یہاں تھانے کے لاک اپ میں پہلے سے ہی 5 لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔انہوں نے مجھے بھی لاک اپ میں بند کر دیا۔میری تلاشی کے دوران انہوں نے میری جیب سے موبائل فون نکال کر رکھ لیا تھا۔ میں اپنا اصل موبائل ایسگارڈ کو ہی دے کر آ گیا تھا۔ یہاں میں ایک سستا سا موبائل لے کر آیا تھا اور ایسگارڈ کو میں نے فون کرنے سے منع کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رات مجھے تھانے میں ہی گزارنی ہو گی اور کل صبح ہی میری انگلیوں کے نشانات لے کر وہ مجھے کسی کیمپ میں ٹرانسفر کریں گے۔

اٹلی میں موبائل فون بھی چیک ہوتا تھا۔ پولیس والے آپ کی کال ہسٹری، کانٹیکٹ نمبر اور سوشل میڈیا اکاؤنٹ سب کچھ چیک کرتے ہیں۔ وہ آپ کو اٹلی تک پہنچانے والے اسمگلر کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان پانچ لڑکوں میں تین پاکستانی تھے اور دو انڈین لڑکے تھے۔ شام اور عراق سے آنے والی عربی فیملیاں جرمنی کا رخ کرتی تھیں اور افریقی لڑکے لیبیا سے ربڑ کی کشتیوں کے ذریعے دوسری طرف سے اٹلی کے جزیروں کا رخ کرتے تھے۔ یہاں صرف پاکستانی، انڈین یا افغانی لڑکے ہی آتے تھے۔ میں نے ان

لڑکوں سے جا کر باری باری ہاتھ ملایا اور دیوار کے ایک کونے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یورپ میں دن کو جتنی بھی گرمی ہو جائے، رات کے آخری پہر ہمیشہ سردی ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کمرے میں کوئی کمبل وغیرہ نہیں تھا۔رات کو سردی بڑھ گئی تو ہم سب ایک دوسرے سے جڑ کر لیٹ گئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔

صبح آٹھ بجے امیگریشن کا عملہ آ گیا تو انہوں نے ہمیں باہر نکالا اور ہماری انگلیوں کے نشانات اور تصویریں لینے لگے۔صبح صبح مزید بیس کے قریب لڑکے بھی آ گئے تھے۔ یہ لڑکے رات کو ہی آ گئے تھے لیکن چونکہ ان کے دوست پہلے سے ہی ادھر موجود تھے، اس لئے انہوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ تھانے والے صبح آٹھ بجے سے ہی کام شروع کرتے ہیں۔رات کو جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اگر رات کو جاؤ گے تو وہ اندر بند کر دیں گے۔اس لئے وہ سبھی صبح سات بجے کے قریب آئے تھے اور تھانے کی عمارت کے باہر لائین بنا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

امیگریشن کے اس سارے عمل میں ہمیں دو بج گئے اور آخر کار انہوں نے ہمیں ایک ایک فارم دے دیا جس کے اوپر ہمارا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔تھانے کے اندر سے ہمیں ایک اور فارم دیا گیا جس پر ہمارے کیمپ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ یہ کیمپ تھانے سے صرف 5 منٹ کے فاصلے پر تھا۔ یہ ایک پرانا سوئمنگ پول تھا جس کے ساتھ تین کمروں کا مساج سنٹر اور اس کے نیچے تہہ خانہ تھا۔ جبکہ باقی سارا احاطہ خالی پڑا ہوا تھا جس میں گورنمنٹ نے کنٹینرز لگا دیئے تھے۔

ایک پولیس والا ہمارے ساتھ پیدل کیمپ میں آیا اور اس نے ہمیں کیمپ انچارج کے حوالے کیا۔کیمپ انچارج نے ہماری رجسٹریشن کی اور ہمیں لے کر تہہ خانے میں آ گیا۔ یہاں پہلے سے کافی لڑکے لیٹے ہوئے تھے۔اس نے ہمیں جدھر جگہ ملے ادھر لیٹ جانے کو کہا۔ یہاں بستر کافی تعداد میں پڑے ہوئے تھے۔ یہاں بالکل کسی مسجد کی طرح لڑکے صفیں بنا کر لیتے ہوئے تھے۔کمرے کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک پہلے ایک لائین، اس کے بعد دوسری اور پھر تیسری۔۔۔ایسے ہی پانچ لائینوں میں تقریباً دو سو کے قریب لڑکے لیٹے ہوئے تھے۔ایک سینئر لڑکے نے لڑکوں کو کلوز کلوز کروا کر لٹایا اور ہمارے لئے جگہ بنانے لگا۔

یہاں چار مرحلوں میں لڑکوں کو رکھا جاتا تھا۔ پہلے تہہ خانے میں، کالی داس (یہ 5 منزلہ عمارت مقامی کلیسا کے انڈر تھی یہاں 20 کے قریب کمرے تھے جس میں تقریباً 200 لڑکے آ جاتے تھے) اس کے بعد کنٹینرز اور پھر مساج سینٹر کی عمارت۔۔۔لڑکوں کو باری باری ایک ایک ہفتے کے لئے ان جگہوں پر ٹھہرایا جاتا

تھا اور پھر سجورنو دے کر فارغ کر دیا جاتا تھا۔لڑکے سجورنو لے کر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے پاس چلے جاتے تھے تا کہ وہاں کام کر سکیں۔

مین اور بڑے انٹرویو کے لئے ایک سال لگ جاتا ہے۔اس دوران امیگریشن ڈیپارٹمنٹ آپ کے پورے کیس کو پڑھ لیتا ہے کہ آپ کب پاکستان سے چلے، کہاں کہاں آپ نے سیاسی پناہ کے لئے درخواست دی اور کدھر کدھر آپ کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ یہ سارا کچھ ہم پہلی سجورنو لیتے وقت لکھواتے ہیں، جس کے بعد امیگریشن والے تصدیق کرتے ہیں اور پھر فائنلی ہمیں ایک جج اور ترجمان دیا جاتا ہے جو ہمارے کیس کو سنتا ہے۔پھر ہماری قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ہمیں مہاجر کے طور پر پناہ دی جائے یا نہیں۔

یہاں روزانہ صبح چھ بجے اور رات کو دس بجے حاضری لگتی تھی۔صبح چھ بجے سے لے کر رات دس بجے تک آپ کیمپ سے باہر کہیں بھی جا سکتے تھے۔رات کو دس بجے سے پہلے پہلے ہر حالت میں آپ کو واپس آنا پڑتا ہے ورنہ آپ کے کیس پر اثر پڑتا ہے اور آپ کو سجورنو لیٹ ملتی ہے۔رات کو دس بجے حاضری لگاتے وقت ہی وہ اگلے دن کا پروگرام بنا دیتے تھے۔جن لڑکوں کو آگے کالی داس شفٹ کرنا ہوتا تھا یا میڈیکل وغیرہ کروانا ہوتا تو وہ لڑکوں کی حاضری کے وقت بتا دیتے تھے۔جن لڑکوں کا کام ہوتا، وہ صبح صبح انتظار کرتے جبکہ باقی لڑکے سارا دن شہر میں گھومتے رہتے۔گوریزیا شہر دریائے اسنزو (Isonzo) کے کنارے پر واقع ہے۔لڑکے سارا سارا دن دریا کے کنارے ٹائم پاس کرتے رہتے۔

میں نے تہہ خانے میں اپنا بستر لگایا اور اپنے ساتھ والے لڑکے کو بستر کا خیال رکھنے کا کہا اور خود باہر آ گیا۔میں نے ایک پبلک فون بوتھ سے کال کر کے ایسگارڈ کو ادھر آنے کا کہا اور خود ادھر ہی کھڑا ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔گوریزیا چھوٹا سا شہر تھا۔40 منٹ میں ایک آدمی پیدل شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آرام سے جا سکتا تھا۔سرحدی شہر ہونے کی وجہ سے یہاں سیاحوں کی بھی کافی آمد ہوتی تھی۔ سلووینیہ اور کروشیا سے اٹلی جانے والے سیاح اسی شہر سے ہو کر جاتے ہیں۔اس کے علاوہ آسٹریا اور ہنگری سے بھی اپنی گاڑی پر وینس جانے والے سیاح یہیں سے ہو کر جاتے ہیں۔اس وجہ سے یہاں ہوٹلوں کی بہتات ہے۔اس چھوٹے سے شہر میں کم از کم 20 کے قریب چھوٹے بڑے ہوٹل ہیں۔

ایسگارڈ آ گئی تو اسے میں کیمپ لے کر آ گیا۔وہ کیمپ کے اندر تو نہیں جا سکتی تھی اس لئے ہم باہر ہی کھڑے ہو گئے۔ابھی میرے پاس امیگریشن کا پیپر موجود تھا اور میری انگلیوں کے نشانات بھی ہو گئے تھے،

اس لئے میں پورے شہر میں کہیں بھی کسی کے بھی ساتھ گھوم سکتا تھا۔ ہم دس پندرہ منٹ تک ادھر ہی کھڑے گپ شپ لگاتے رہے۔ اس کے بعد ایسگارڈ نے موبائل سے نزدیکی ہوٹل کا ایڈریس تلاش کیا اور ہم دونوں ادھر آ گئے۔ یہ چھوٹا سا لیکن بہت خوبصورت ہوٹل تھا اور کیمپ سے 10 منٹ کے فاصلے پر تھا۔ کمرہ کرائے پر لینے کے بعد ہم مارکیٹ آ گئے تا کہ کچھ کپڑے اور دوسرا ضروری سامان خرید سکیں۔ ایسگارڈ خالی ہاتھ ہی یہاں آئی تھی۔ اس کے پاس صرف ایک جوڑا رات کو پہننے کیلئے تھا جبکہ دوسرا سوٹ وہ پچھلے تین دن سے پہنے ہوئی تھی، جو کہ اب بہت گندہ ہو گیا تھا۔

''یار! تمہارے کپڑے بہت گندے ہو گئے ہیں، کتنے دن سے تم وہی سوٹ پہنے ہوئے ہو، تمہارے ساتھ چلتے ہوئے تو اب مجھے بھی شرم آ رہی ہے۔'' میں نے مذاق میں اسے چھیڑتے ہوئے کہا تو اس نے میرے بال پکڑ لئے۔

''راضی! پچھلے تین دن سے مسلسل ایک ملک سے دوسرے ملک بھگا رہے ہو۔۔۔ ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ ایسگارڈ! تم ٹھیک تو ہو نا! تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ بس مسلسل بھگا ہی رہے ہو اور ابھی کہہ رہے ہو کہ میں بہت گندی ہو گئی ہوں؟ ہاں! لڑکی ہوں، میری سو ضروریات ہوتی ہیں۔ پچھلے تین دن سے قسم اٹھوا لو جو میں نے کسی صابن سے منہ بھی دھویا ہو۔'' اس نے میرے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''سوری ڈاکٹر صاحبہ! غلطی ہو گئی۔۔۔ آپ تو بہت اچھی ہو اور بہت خوبصورت بھی ہو۔'' میں اس سے اپنے بال چھڑوانے لگا۔

''ڈاکٹر۔۔۔؟ اچھا! میں کس زاویے سے ڈاکٹر لگ رہی ہوں؟'' اس نے اپنے کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایسگارڈ! تم ڈاکٹر ہی نہیں ہو بلکہ بہت اچھی دوست بھی ہو اور مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ میرے گلے لگ گئی۔

''راضی! اس محبت میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے میں جو مزا ہے اس کے سامنے پوری دنیا کی بادشاہت بھی کچھ نہیں ہے۔ یہ محبت چیز ہی کچھ ایسی ہے۔ راضی! مجھے چھوڑنا مت! بے شک اپنے گھر کی نوکر بنا کر رکھ لینا۔۔۔ میں ساری زندگی تمہاری اور ایمان کی خدمت کروں گی لیکن تم سے دور رہ کر مر جاؤں گی۔'' وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

’’ایسگارڈ! تم بہت خوبصورت اور معصوم ہو، خدا ہم سب کے حق میں بہتر کرے گا۔‘‘ میں اسے لے کر مارکیٹ کے اندر چلا گیا۔

یہاں سے ہم نے کپڑے اور دوسرا ضروری سامان خریدا اور واپس ہوٹل آ گئے۔ ہوٹل میں پہنچ کر ایسگارڈ تو نہانے کے لئے باتھ روم چلی گئی جبکہ میں ٹی وی پر فلم دیکھنے لگا۔ وہ نہا کر باہر نکلی تو میں بھی جلدی سے نہانے لگا۔ میرے باہر آنے تک وہ تیار ہوگئی تھی اور اس نے میرے لئے بھی ایک جوڑا نکال دیا تھا۔ میں اس سے کپڑے لے کر دوبارہ باتھ روم میں گھسا اور نئے کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔

’’واہ راضی! قسم سے کسی بھی طرف سے تم مہاجر نہیں لگ رہے ہو۔۔۔ ایسے ہی اگر تم کیمپ چلے جاؤ تو وہ تمہیں گیٹ سے اندر بھی داخل نہیں ہونے دیں گے۔‘‘ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’اچھا! چلو اب کہیں کھانا کھانے چلتے ہیں، بہت بھوک لگی ہے۔‘‘ میں نے معصوم سی صورت بنا کر کہا تو وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ ایک جگہ سے کھانا کھانے کے بعد ہم واپس ہوٹل آ گئے۔

رات کو ساڑھے نو بجے تک ہم دونوں ادھر ہی بیٹھے ٹی وی پر فلم دیکھتے رہے اور پھر میں نے نارمل سے کپڑے پہنے اور واپس کیمپ آ گیا۔ میرا بستر ویسے ہی لگا ہوا تھا جیسے میں رکھ کر گیا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ والے لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ رات کو ٹھیک دس بجے کیمپ کا انچارج آیا اور اس نے ہم سب کی حاضری لگائی اور واپس چلا گیا۔ حاضری کے بعد ہم بھی سونے کی تیاری کرنے لگے۔

یہاں رات کو دس بجے کے بعد لائیٹ بند ہو جاتی تھی۔ لڑکے اپنے اپنے موبائل پر ہینڈز فری لگا کر فلم وغیرہ دیکھ سکتے تھے لیکن کوئی بھی فون پر یا آپس میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں آ کر سبھی لڑکوں کی بدمعاشی ختم ہو جاتی تھی۔ جھگڑا کرنے یا بات نہ ماننے والے لڑکے کو کیمپ انچارج کیمپ سے باہر نکال دیتا تھا اور پھر اس لڑکے کو پورے اٹلی میں کہیں بھی رہنے کے لئے گھر نہیں ملتا تھا۔ اسے مجبوراً بھی پانچ چھ مہینے دیر سے ملتی تھی اور تب تک وہ لڑکا اپنے پیسوں سے کرائے پر گھر لے کر رہتا تھا۔ جبکہ یہاں کیمپ میں کھانا اور رہائش سب فری تھا۔ میں روزانہ رات کو ادھر آ جاتا تھا اور صبح چھ بجے حاضری لگوا کر ہوٹل چلا جاتا۔ ایک ہفتے کے بعد مجھے یہاں سے کالی داس شفٹ کر دیا گیا تو ایسگارڈ بھی اس ہوٹل کو چھوڑ کر دوسرے ہوٹل میں شفٹ ہوگئی۔

جیسے جیسے لڑکوں کو پتہ چل رہا تھا کہ ادھر کام جلدی ہو رہا ہے ویسے ویسے لڑکے گوریزیا کا رخ کر رہے تھے اور ان کی تعداد دن بدن زیادہ ہو رہی تھی۔ ایک دن صبح صبح تین بڑی بسیں آ کر ہماری بلڈنگ کے سامنے

رکیں۔ انہوں نے ہماری پوری بلڈنگ سے لڑکوں کو اکٹھا کیا اور دوسرے شہروں میں منتقل کرنے لگے۔ میرے والی بس میلان شہر آ گئی۔ یہاں کے ایک بڑے ریڈ کراس کے کیمپ میں لڑکوں کو اتارا گیا اور پھر آگے چار چار پانچ پانچ لڑکوں کو میلان کے مختلف چھوٹے چھوٹے کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا۔ میرا کیمپ میلان اسٹیشن سے صرف 15 منٹ دور ایک چھوٹی سی بلڈنگ تھی جس میں 40 لڑکوں کے رہنے کی گنجائش تھی۔ یہ عمارت پہلے ایک اولڈ ہاؤس تھی جس کو بعد میں مہاجرین کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔

میں نے ادھر پہنچنے کے بعد ایسگارڈ کو فون کر کے بتایا تو وہ بھی ادھر میلان آ گئی۔ ہم دونوں یہیں سے گوریزیا گئے تھے اور پھر واپس ادھر ہی آ گئے۔ یہ بہت اچھی جگہ تھی اور یہاں ایک کمرے میں چھ لڑکے رہ رہے تھے۔ یہاں کا عملہ بھی بہت اچھا تھا۔ خاص طور پر ہائیمن (Hayman) اور فرانچسکا (Francheska)۔۔۔ ہائیمن کا تعلق مصر (Egypt) سے تھا، وہ دس سال پہلے مصر سے اٹلی آیا تھا اور اس نے ادھر ہی شادی کر لی تھی۔ اس کے پاس اٹلی کی شہریت بھی تھی۔ اسے انگلش، عربی اور اٹالین تینوں زبانیں آتی تھیں۔ ہائیمن ہمارے اس کیمپ کا انچارج تھا جبکہ اس کے ساتھ فرانچسکا اٹالین تھی۔ ہمارے سارے کاغذات اور میڈیکل وغیرہ کی یہی جواب دار تھی۔ رات کو حاضری والا سسٹم ادھر بھی تھا بلکہ روزانہ حاضری کا سسٹم پورے اٹلی میں تھا۔ چونکہ ہمارے انگلیوں کے نشانات اور دوسرے سارے کاغذات مکمل تھے اور ہمیں صرف اٹالین سجورنو کا ہی انتظار تھا اس لئے یہاں بھی ہم سارا دن فارغ ہی ہوتے تھے۔

ایسگارڈ نے میلان میں کمرہ لے لیا تھا۔ میں روزانہ دن کو ادھر چلا جاتا اور رات کو واپس کیمپ میں آ جاتا تھا۔ یہاں میلان میں مجھے پورا ایک مہینہ لگ گیا اور آخر کار مجھے اٹلی کی چھ مہینے کی سجورنو مل گئی۔ میں میلان شہر کے مین تھانے چلا گیا۔ اٹلی میں امیگریشن کا سارا کام مقامی تھانے کے تحت ہی ہوتا ہے۔ میلان کا مرکزی تھانہ جہاں امیگریشن کا کام ہوتا ہے، امریکن ایمبیسی کے ساتھ ہی ہے۔ امریکن ایمبیسی تھانے سے تھوڑا ہٹ کر روڈ کی دوسری طرف تھی۔ ایسگارڈ مجھے تھانے کے دروازے پر چھوڑ کر خود ایمبیسی چلی گئی تھی۔ میں آٹھ بجے تھانے آیا تھا۔ یہاں ہمارے ایک بار پھر انگلیوں کے نشانات اور تصویریں لی گئی تھیں۔ ایک چھوٹا سا انٹرویو بھی ہوا تھا جس میں ہم اپنی مشکلات کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے تھے۔

شام کو 4 بجے کے قریب ہمیں سجورنو دے دی گئی تو میں نے باہر نکل کر ایسگارڈ کو فون کیا۔ وہ بھی ایمبیسی سے باہر آ گئی تو ہم دونوں واپس ہوٹل آ گئے۔ یہاں آ کر میں نے ظفر بھائی کو فون کیا اور انہیں سجورنو مل جانے

کی اطلاع دی اور آگے کا مشورہ مانگنے لگا۔

''ٹھیک ہے یار! میں اپنے ایک دوست کو فون کر کے پھر تمہیں بتاتا ہوں کہ آگے کیا کرنا ہے۔'' انہوں نے مجھے انتظار کرنے کا کہا۔

''ظفر بھائی! میں ادھر سے واپس جرمنی کی ٹرین پکڑ لیتا ہوں، رات کو آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا اور پھر کل ڈنمارک کے لئے روانہ ہو جائیں گے؟ تب تک آپ بھی معلومات اکٹھی کر لو گے۔'' میں نے جلدی سے بولتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگے۔

''راضی! یہ جو تمہیں سجورنو ملی ہے اس پر سوئیزر لینڈ اور انگلینڈ نہیں جا سکتے ہو۔ انگلینڈ اور سوئیزر لینڈ دونوں یورپی یونین کے رکن ممالک تو ہیں لیکن یورپی یونین کے ویزے پر آپ ان دونوں ملکوں میں نہیں جا سکتے۔ ان کے لئے علیحدہ ویزے کی ضرورت ہوتی ہے (یہ قانون صرف مہاجرین کے ویزے پر اپلائی ہوتا ہے)۔ اس لئے تھوڑا صبر کرو، میں تھوڑی دیر تک فون کرتا ہوں۔'' انہوں نے دوسری طرف سے فون بند کر دیا اور ہم دونوں ظفر بھائی کی اگلی کال کا انتظار کرنے لگے۔ ان کا فون 15 منٹ کے بعد ہی آ گیا۔ ان کا ایک جاننے والا مونٹی کارلو (Monte Carlo) میں رہتا تھا جو کچھ پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں کو جانتا تھا۔ وہ ڈرائیور اٹلی سے لڑکوں کو پیرس یا جرمنی لے کر جاتے تھے۔ ظفر بھائی نے مجھے اس آدمی کا نمبر دیا تو میں مونٹی کارلو والے آدمی سے بات کرنے لگا۔ اس نے ہمیں صبح 6 بجے وینٹی مگلیا (Ventimiglia) آنے کا کہا۔

میلان سے ونٹی مگلیا ٹرین کا چار گھنٹے کا سفر تھا۔ ہم نے جلدی جلدی سامان کلوز کیا اور ریلوے اسٹیشن پر آ گئے۔ یہاں سے ہم نے ونٹی مگلیا کی ٹکٹیں لیں اور دس بجے کے قریب ونٹی مگلیا آ گئے۔ رات ہم نے ادھر ہی گزاری اور صبح چھ بجے مونٹی کارلو فون کر دیا۔ اس آدمی نے ہمیں ایک انڈین ڈرائیور کا فون دیا جو ہمیں جرمنی لے کر جاتا۔ میں نے انڈین کو فون کیا تو وہ ہمارے ہی فون کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں وینٹی مگلیا کے ٹرین اسٹیشن پر پہنچنے کا کہا۔ ہم اسٹیشن پر پہنچے تو تھوڑی دیر بعد وہ بھی ادھر آ گیا۔ یہاں اسٹیشن پر بہت بڑی تعداد افریقن اور عرب ملکوں سے آئے ہوئے مہاجرین کی تھی۔ لیبیا اور دوسرے افریقی ساحلوں سے مہاجرین اٹلی پہنچتے تھے تو اسی شہر سے آگے فرانس کی طرف جاتے تھے۔

وینٹی مگلیا کو فرانس کے دو بڑے شہر نیس (Nice) اور کینز (Cannes) لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ

منا کو کا شہر مونٹی کارلو بھی ادھر ہی ہے۔ منا کو فرانس کے اندر بہت چھوٹا سا ایک ملک ہے جو ایک ہی شہر مونٹی کارلو پر مشتمل ہے۔ یہ سارے شہر ایک ہی لائین پر ہیں اور وینٹی مگلیا سے صرف 60 کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ یعنی ہر بیس کلومیٹر کے بعد ایک شہر آجاتا ہے۔ یہ تینوں شہر بڑے بڑے جوئے خانوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ تقریباً پورے یورپ میں 90 فیصد جوا انہی شہروں میں ہوتا ہے۔ ان جوا خانوں کی ٹوٹل کمائی پاکستان کی کل کمائی سے بھی زیادہ ہے۔ پورا مشرقی یورپ اسی لائین سے ہوتا ہوا ان جوا خانوں میں جاتا ہے اور اتنا رش ہوتا ہے کہ بعض اوقات ٹریفک جام کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ اٹلی اور فرانس کے بارڈر پر کوئی چیک پوسٹ نہیں ہے اور یہاں ایک منٹ میں بیس سے زیادہ گاڑیاں گزر جاتی ہیں۔ یہ دو رویہ بڑی موٹر وے ہے جو ان شہروں سے گزرتی ہوئی آگے سپین چلی جاتی ہے۔ وینٹی مگلیا میں رش ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سپین کا مرکزی شہر بارسلونہ (Barcelona) اسی روڈ کے اوپر واقع ہے۔ اسی چیز کا فائدہ انسانی سمگلر بھی اٹھاتے ہیں۔ فرانس، سپین اور پرتگال جانے والے مہاجرین یہیں سے جاتے ہیں۔

''السلام وعلیکم مترجی! آپ جرمنی جانا چاہتے ہو؟'' ایک سردار نے میرے پاس آکر پوچھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جی سردار جی! ہم دونوں جانا چاہتے ہیں، آگے ڈنمارک تک جانا ہے۔ اگر مناسب پیسے لوگے تو چلے جائیں گے ورنہ پھر کسی اور کو دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے خالصتاً کاروباری انداز میں کہا۔

''مترجی! آپ ہمارے پنجابی بھائی ہو، جتنا آپ کا دل کرے دے دینا۔۔۔کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی یار! ہمیں کچھ اندازہ تو ہو کہ آپ کتنے پیسے لیتے ہو؟''

''بھائی جان! ڈنمارک بہت دور ہے۔ یہاں سے کوپن ہیگن (Copen Hagen) کا فاصلہ سولہ سترہ سو کلومیٹر ہے اور آنے جانے میں دو دن لگ جائیں گے۔ کوئی بھی ڈرائیور آپ سے دو ہزار یورو سے کم نہیں لے گا۔ بہت لمبا سفر ہے، اگر میرا برادرانہ مشورہ مانو تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ ادھر سے پیرس چلے جاؤ۔'' مجھے احمد بھائی نے بتایا تھا کہ آپ کے پاس اٹالین سجورنو ہے تو پھر آپ کو کوئی پرابلم نہیں ہے۔

''پیرس سے آپ ٹرین پکڑیں اور ڈنمارک چلے جائیں۔ یہ سب سے آسان راستہ ہے اور آپ کے زیادہ پیسے بھی نہیں لگیں گے۔ باقی آپ کی مرضی ہے۔''

’’کیا کہتی ہو ایسگارڈ! یہ ٹھیک رہے گا یا کوئی اور پلان ہے؟‘‘ میں نے ایسگارڈ سے پوچھا۔
’’نہیں یار! یہ بہترین رہے گا۔۔۔تمہارے پاس اٹالین سجورنو تو ہے، پھر ٹرین سے سفر آسان رہے گا۔‘‘ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
’’ٹھیک ہے مترجی! آپ ہمیں پیرس لے جاؤ، اس سے آگے ہم ٹرین سے چلے جائیں گے۔‘‘ اس نے ہم دونوں کے کاغذات دیکھے، ہمیں کار میں بٹھایا اور اسٹیشن سے باہر لے آیا۔
اسٹیشن سے دو گلیاں ہٹ کر ایک پاکستانی پیزے کی دکان تھی۔اس نے کار ادھر کھڑی کی اور اندر سے مزید دو پاکستانی لڑکوں کو لے کر آ گیا۔ یہ لڑکے بھی ہمارے ساتھ ہی پیرس جا رہے تھے۔ یہاں سے پیرس 900 کلومیٹر دور تھا۔اس نے گاڑی موٹروے پر ڈالی اور تیز رفتاری سے بارڈر کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں موٹروے کے اوپر کوئی بارڈر چیک پوسٹ نہیں تھی۔ نیچے چھوٹے روڈ پر پہلے چیک پوسٹ ہوا کرتی تھی۔ بعد میں موٹروے بنا تو اس وقت تک اٹلی اور فرانس میں شینگن زون متعارف ہو چکا تھا، یعنی کوئی سرحدی چیک پوسٹ اور بارڈر کنٹرول نہیں ہوگا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا، ہم نے ایک سرنگ عبور کی تو فرانسیسی علاقے میں آ گئے۔اس بار تو ہمیں فرانسیسی بورڈ بھی نظر نہیں آیا۔ہم گیارہ بجے ادھر سے چلے تھے اور ٹھیک شام سات بجے پیرس آ گئے تھے۔

پیرس فرانس کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ شہر یورپ کے چند حسین ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ میں نے کہانیوں میں پڑھا تھا کہ اس شہر کی سڑکیں بھی شیشے کی بنی ہوئی ہیں۔ایسی تو کوئی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی انتہائی خوبصورت اور کشادہ سڑکیں ہیں۔ خاص طور پر شانزے لیزے(Shanzelise) روڈ اور پیرس کا ایفل ٹاور۔۔۔میرے خیال میں مجھے اور کچھ بھی بتانے کی ضرورنہیں ہے۔ہم دونوں پیرس کے مرکزی ٹرین اسٹیشن پر آ گئے اور ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن کی ٹرین دیکھنے لگے۔ یہاں سے ہمیں کوئی بھی ڈائریکٹ ٹرین کوپن ہیگن کے لئے نہیں ملی۔ایک ٹرین بیلجئم کے دارالحکومت برسلز(Brussels) سے ہوتی ہوئی ہیمبرگ(Hamburg) سے آگے کوپن ہیگن جاتی تھی۔
’’کیا ارادہ ہے ایسگارڈ! پندرہ گھنٹے کا راستہ ہے۔۔۔رات ادھر گزار کر صبح جائیں یا پھر سیدھے ہی نکلیں؟‘‘ میں ایک پھر ایسگارڈ سے پوچھنے لگا۔
’’جیسے تمہاری مرضی ہے یار! ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ایک بار تمہارا ہاتھ پکڑ لیا ہے تو اب نخرہ کیا؟

جیسے رکھو گے خاموشی سے رہ لیں گے۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال سے سیدھا آگے نکلتے ہیں۔۔۔ٹرین میں برتھ لے لیں گے اور آگے سوتے ہوئے ہی جائیں گے۔ رات بھی گزر جائے گی اور دن کو ادھر پہنچ بھی جائیں گے؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

''راضی! یہ محبت کا شہر ہے۔۔۔ پوری دنیا سے محبت کرنے والے اس شہر کی زیارت کرنے آتے ہیں اور تم کتنے عجیب ہو جو اس شہرِ محبت میں ایک گھنٹہ بھی نہیں گزار رہے ہو؟'' اس نے شرارت سے کہا تو میں خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''یار! مذاق کر رہی ہوں، مجھے معلوم ہے کہ ہمیں جلد سے جلد امریکہ پہنچنا ہے۔ ایک بار امریکہ پہنچ گئے تو یہ سب چیزیں دوبارہ بھی زندگی میں آجاتی ہیں۔'' وہ ٹکٹ کاؤنٹر پر گئی اور کوپن ہیگن کی دو ٹکٹیں لے کر آگئی۔

ٹکٹیں لینے کے بعد ہم دونوں اپنے مطلوبہ نمبر کے پلیٹ فارم پر جا کر ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ آٹھ بجے پیرس سے ٹرین نکلی اور ساڑھے نو بجے اس کا پہلا سٹاپ بروسلز ہی تھا۔ آدھے گھنٹے بعد دوسرا سٹاپ لیگے (Liege) اور پھر ٹرین بیلجئم سے باہر نکل گئی۔ صرف دو گھنٹے میں ٹرین پیرس سے نکلی اور پورے بیلجئم کو کراس کر کے جرمنی میں داخل ہو گئی۔

شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ ٹرین کی بہت سپیڈ تھی۔۔۔ نہیں! بلکہ ملک ہی بہت چھوٹا تھا۔ 30 ہزار مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلے ہوئے اس شہر کی آبادی ایک کروڑ دس لاکھ ہے۔ اس ملک کی 60 فیصد آبادی جرمن زبان بولتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جرمنی دنیا کے طاقت ور ترین ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ سائنس کی زبان بھی جرمن تھی جو دوسری جنگ عظیم تک رہی اور پھر جرمنی کی جگہ انگلش زبان آگئی۔ انگلش زبان کو صحیح طاقت امریکہ نے دی اور آج انگلش پوری دنیا کی انٹرنیشنل زبان ہے۔ دوسرے نمبر پر سپین کی سپینش (Spanish) زبان ہے جو پورے جنوبی امریکہ کے سبھی ملکوں میں بولی جاتی ہے۔ اس کے بعد عربی کا نمبر آتا ہے جو ایشیاء اور افریقہ کے عرب ملکوں میں بولی جاتی ہے۔ میں یہاں آبادی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس لحاظ سے تو چائنیز اور ہندی زبان بھی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہیں کیونکہ دنیا کی آدھی آبادی پاکستان، انڈیا، بنگلہ دیش اور چائنہ میں رہتی ہے۔ ہندی اور چائنیز ان چاروں ملکوں سے باہر کوئی بھی نہیں بولتا ہے۔

رات کو تین بجے کے قریب ہم ہیمبرگ پہنچ گئے۔ یہاں سے ہم نے دوسری ٹرین کوپن ہیگن کے لئے پکڑنی تھی۔ ہم پلیٹ فارم پر پہنچے تو ابھی ٹرین آنے میں آدھا گھنٹہ ٹائم تھا۔ ہم نے اسٹیشن پر ہی موجود ایک برگر شاپ سے ایک ایک برگر لے کر کھایا اور دو پانی کی بوتلیں لے کر واپس پلیٹ فارم پر آ گئے۔ کوپن ہیگن جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر آ گئی تھی۔ ہم ٹرین پر سوار ہوئے اور اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ ساڑھے تین بجے ٹرین ہیمبرگ سے نکلے اور اس کا پہلا سٹاپ ڈنمارک کا شہر کولڈنگ (Kolding) تھا۔ یہ ہیمبرگ سے چار گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ دن کو گیارہ بجے ہم ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن پہنچ گئے۔

کوپن ہیگن ڈنمارک کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ زی لینڈ (Zealand) جزیرے پر واقع آخری سرحدی شہر بھی ہے۔ کوپن ہیگن اور سویڈن (Sweden) کے درمیان 15 کلومیٹر کا چھوٹا سا سمندر ہے جس کے دوسرے کنارے پر سویڈن کا شہر مالمو واقع ہے۔ میں نے کوپن ہیگن پہنچ کر ظفر بھائی سے رابطہ کیا تو انہوں نے مجھے ایک وکیل کا نمبر دیا جو ہمیں جلد سے جلد میرج بک دلوا سکتا تھا۔ میں نے وکیل کو فون کیا اور اس سے شام 4 بجے کا ٹائم لے لیا۔ ابھی 11 بجے کا ٹائم تھا، ہم نے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا اور دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد نہا دھو کر باہر نکل آئے۔ باہر نکلنے کے بعد ایک ریسٹورنٹ سے کھانا کھایا اور چار بجے وکیل کے دفتر پہنچ گئے۔

وکیل کے ساتھ سارے معاملات پہلے ہی ظفر بھائی طے کر چکے تھے اس لئے ہم نے صرف اپنے کاغذات اس کے حوالے کئے۔ مقامی رجسٹریشن آفس میں وہ پہلے ہی کل دس بجے کا ٹائم لے چکا تھا۔ اس نے ہمارے کاغذات چیک کئے اور مکمل تسلی کرنے کے بعد دوسرے دن دس بجے سے پہلے رجسٹریشن آفس پہنچنے کا کہا۔ ہم نے وکیل سے اجازت لی اور واپس ہوٹل آ گئے۔ دو دن سے مسلسل سفر کر رہے تھے اس لئے کافی تھکاوٹ ہو گئی تھی۔ ہم کمرے میں داخل ہوتے ہی لیٹ گئے تو فوراً ہی نیند آ گئی۔ دوسرے دن صبح چھ بجے کے الارم نے ہی جگایا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر الارم بند کیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ آرام سے نہا دھو کر باہر نکلا تو تب تک ایسگارڈ بھی اٹھ چکی تھی۔ آٹھ بجے تک آرام سے ہم دونوں تیار ہو کر ہوٹل سے باہر آ گئے۔ راستے میں ایک کافی شاپ سے ناشتہ کیا اور کافی پی کر 9 بجے ہی ہم رجسٹریشن آفس پہنچ گئے۔

ہمارا وکیل ساڑھے نو بجے تک آ گیا اور وہ ہم سے سلام کرنے کے بعد اندر رجسٹریشن آفس چلا گیا جبکہ ہم باہر کھڑے اس کا انتظار کرنے لگے۔ پورے دس بجے ہمارا نمبر آیا تو وکیل باہر آیا اور وہ ایسگارڈ کو لے کر

اندر چلا گیا۔ میں باہر ہی کھڑا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک ایسگارڈ اندر مصروف رہی اور پھر مجھے بھی اندر بلا لیا گیا۔ رجسٹریشن آفس کا اہلکار چند موٹی موٹی باتیں مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کہاں سے آیا ہوں، کن کن ملکوں میں رہا ہوں، ایسگارڈ سے کہا ملا، اس سے شادی کیوں کرنا چاہتا ہوں، یہ دو نمبر کی شادی تو نہیں ہے، میں ایسگارڈ کو اس شادی کے لئے کوئی پیسے وغیرہ تو نہیں دے رہا۔۔۔ وغیرہ۔ یہ صرف کاغذی کاروائی تھی۔ ہم دونوں وکیل کے ذریعے شادی کر رہے تھے اور ہمارے سارے معاملات ہمارا وکیل ہی دیکھ رہا تھا۔ ان سب چیزوں کے علاوہ ایسگارڈ امریکن شہری تھی۔ وہ کسی غریب یورپین ملک کی شہری نہیں تھی جو پیسے لے کر شادی کرتی ہیں۔

رومانیہ اور بلغاریہ دونوں یورپی یونین کے نسبتاً غریب ممالک تھے۔ وہاں کی لڑکیاں دس پندرہ ہزار یورو میں شادی کر کے یورپی یونین کا ویزہ لے کر دے دیتی تھیں۔ تین سال تک ویزہ مل جاتا تو وہ پھر کسی نئے لڑکے سے شادی کر لیتیں۔ ان تین سالوں میں وہ لڑکا اس لڑکی کے ماہانہ اخراجات بھی برداشت کرتا تھا۔ تین سال میں 20 ہزار یورو خرچہ آجاتا تھا اور یورپی یونین کا ویزہ مل جاتا تھا۔ یہ میں جرمن ویزے کی بات کر رہا ہوں۔ یہاں چونکہ مزدوری زیادہ ہے اس لئے خرچہ بھی اسی حساب سے ہے۔ دوسرے ملک جرمنی کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ ہیں اور ادھر مزدوری بھی کم ہے۔ اس لئے جرمنی میں ویزے کا ریٹ بہت زیادہ ہے۔ مجھے انہوں نے صرف دس منٹ میں ہی فارغ کر دیا اور ہم دونوں دفتر سے نکل کر وکیل کا انتظار کرنے لگے۔

''ایسگارڈ! اندر کیا کہہ رہے تھے تم کو۔۔۔ بڑی دیر تک تمہارا انٹرویو ہوتا رہا ہے، جبکہ مجھے تو انہوں نے دس منٹ میں ہی فارغ کر دیا تھا؟'' میں اس سے پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں یار! بس ویسے ہی۔۔۔ مجھے تم سے ڈرا رہے تھے۔ تم لوگ اچھے نہیں ہوتے ہو، اپنی عورتوں کو مارتے ہو، کبھی بھی اس کے ساتھ پاکستان مت جانا، یہ لوگ عورتوں کو گھروں میں قید کر کے رکھتے ہیں، پاکستان میں میری جان کی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ بس یہی کچھ بتا رہے تھے۔'' اس نے نارمل سے انداز میں کہا تو میں نے بے اختیار اپنی نظریں جھکا لیں۔

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اگر تم واپس جانا چاہتی ہو تو بے شک چلی جاؤ، میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا؟'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''یار! محبت کرتی ہوں تم سے۔۔۔ایسے بات کر کے توہین تو مت کرو نا؟ اعتبار ہے تم پر راضی! محبت ہے تم سے، جان سے بھی مار دو گے تو بھی اف تک نہیں کروں گی۔'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔

''ویسے واقعی تم لوگ اپنی عورتوں کو گھروں میں قید کر کے مارتے ہو؟'' اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی! جی! بہت مارتے ہیں۔۔۔ہم سے بچ کر رہنا! پاکستان تو بالکل ہی مت جانا ورنہ ساری زندگی گھر کی چار دیواری میں ہی قید ہو کر رہ جاؤ گی۔'' میں نے مصنوعی غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''یار! ہماری قسمت میں تو تمہاری قید بھی نہیں لکھی ہوئی ہے۔'' اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ جبکہ میں خاموشی سے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرے پاس کوئی الفاظ ہی نہیں تھے۔ میں اسے کچھ بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میرے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں تھا، نہ محبت، نہ دوستی۔ کچھ بھی تو نہیں تھا میرے پاس۔۔۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، وکیل آفس سے باہر آ گیا اور ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ٹھیک ہے، ابھی آپ دونوں کے کاغذات میں نے ادھر جمع کروا دیئے ہیں۔ انکوائری مکمل ہوتے ہوتے ایک ہفتہ لگ جائے گا، تب تک آپ آزاد ہو۔ ادھر کوپن ہیگن میں ہی رہنا ہے یا پھر کہیں گھوم پھر کر آنا ہے، وہ آپ کی مرضی ہے۔ جب کوئی ضرورت ہو گی تو میں فون کر کے بول دوں گا۔'' وکیل ہم سے کہہ کر دوبارہ اندر آفس میں چلا گیا جبکہ ہم دونوں واپس ہوٹل آ گئے۔

ایک ہفتے تک ہم کوپن ہیگن میں ہی گھومتے رہے اور میرج بک لے کر واپس جرمنی آ گئے۔ ایک رات ہم نے چیمہ صاحب کے گھر میں گزاری اور اگلے دن پولینڈ (Poland) کے دارالحکومت ورساؤ (Warsaw) چلے گئے۔ پولینڈ یورپی یونین کا چھٹا بڑا ملک ہے۔ اس کی آبادی چار کروڑ ہے اور رقبہ 120,726 مربع کلومیٹر ہے۔ ورساؤ پولینڈ کا دارلحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں پر صرف کاغذات جمع کروا کر ویزے کا ہی انتظار کرنا تھا، ادھر رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ظفر بھائی نے ایک وکیل کر دیا تھا، ہم دونوں اس وکیل کو ساتھ لے کر امیگریشن دفتر گئے اور ویزے کے لئے اپلائی کر کے واپس جرمنی آ گئے۔ آگے کا سارا کام ہمارے وکیل نے ہی کرنا تھا۔ ہمارا چونکہ پولینڈ میں کوئی کام نہیں تھا اس لئے ہم واپس چیمہ صاحب کے گھر آ گئے۔

وکیل نے دس ہزار یورو لیا اور ایک مہینے کے اندر اندر مجھے پولینڈ کا دو سال کا ویزہ مل گیا۔ میں 2006ء میں یورپ میں داخل ہوا تھا اور گیارہ سال تک مسلسل ایک ملک سے دوسرے ملک پناہ کی تلاش میں بھاگتا رہا۔ کوئی بھی ملک اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا تھا اور دور دور تک کوئی سہارہ بھی نہیں مل رہا تھا۔ اب اچانک ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ پولینڈ کے دو سال کے ویزے نے پوری یورپی یونین کے دروازے مجھ پر کھول دیئے۔ میرا مہاجر کا سٹیٹس ختم ہو گیا تھا اور یورپی یونین کا ایک باعزت شہری بن گیا تھا۔ میں یورپی یونین کے 28 ملکوں میں بلا روک ٹوک کہیں بھی جا سکتا تھا۔ رات کو میں نے فیاض چیمہ کے گھر میں ہی اپنے سبھی دوستوں کو ایک اچھی سی پارٹی دی اور ظفر بھائی کے پاس بیٹھ کر آگے کا پلان بنانے لگا۔

''جی پا جی! اب کیا کرنا ہے؟ میکسیکو کے ویزے کے لئے میں کونسے ملک سے اپلائی کروں؟'' میں نے کوکا کولا کا گلاس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''یار! ابھی تازہ تازہ ویزہ ملا ہے، پاکستان جا سکتے ہو۔ ایک چکر پاکستان کا لگا آؤ اور اپنے ماں باپ کو چہرہ دکھا دو پھر آگے چلے جانا۔ میکسیکو سے آگے امریکہ کا بارڈر کراس کرتے ہی تم ایک بار پھر مہاجر بن جاؤ گے۔ اس کے بعد امریکہ کا ویزہ ملنے میں پتہ نہیں اور کتنا عرصہ لگتا ہے۔ اگر خدانخواستہ تم امریکہ کا بارڈر کراس کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہو تو امریکہ تمہیں واپس یورپ ڈی پورٹ کر دے گا۔ تمہارا یہ ویزہ بھی کینسل ہو جائے گا اور دوبارہ پھر پاکستان جانے کا موقع نہیں ملے گا۔'' وہ مجھے پاکستان جانے کا مشورہ دینے لگے۔

''نہیں پا جی! مجھے پاکستان نہیں جانا ہے۔ آپ آگے امریکہ جانے کا کوئی راستہ بتائیں، پیچھے میں نے اپنی ساری کشتیاں جلا دیں ہیں۔'' میں نے پاکستان جانے کا مشورہ رد کرتے ہوئے کہا۔

''راضی! چلے چلتے ہیں ایک بار پاکستان میں بھی۔۔۔ پاکستان میں تمہاری فیملی اور ماں باپ کو دیکھ لیتی؟'' ایسگارڈ نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔

''یار! تمہیں گیارہ سال ہو گئے ہیں پاکستان سے آئے ہوئے۔۔۔ کیا تمہیں کبھی بھی اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی یاد نہیں آئی؟'' ایسگارڈ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''نہیں ایسگارڈ! مجھے کسی کی یاد نہیں آتی، میرا دل بہت سخت ہو گیا ہے۔ جو کچھ میرے گاؤں والوں نے اور میرے سگے باپ نے میرے اور ایمان کے ساتھ کیا ہے وہ میں کبھی بھلا نہیں سکتا ایسگارڈ! میں ان واقعات کو یاد بھی نہیں کرنا چاہتا۔ 10 سال کی ایمان تھی جب اس کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی، صرف دس

سال۔۔۔جانتی ہونادس سال کی عمر کیا ہوتی ہے؟ کونسے گھر کی بات کرتی ہوتم؟ جو گھر میری ایمان کو تحفظ نہیں دے سکا اسے میں اپنا گھر ہی نہیں مانتا۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ پارٹی ختم ہو چکی تھی اور سارے لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ صرف ظفر بھائی رہ گئے تھے، وہ بھی چیمہ صاحب سے اجازت لے کر گھر چلے گئے۔

دوسرے دن صبح صبح ان کا فون آیا تو میں ان سے ملنے فرم چلا گیا۔ انہوں نے مجھے جرمنی سے ہی میکسیکو کی ایمبیسی میں ویزہ اپلائی کرنے کے لئے کہا تو میں اور ایسگارڈ اسی دن برلن چلے گے۔ وہاں پہنچ کر میں نے میکسیکن ایمبیسی میں ویزے کے لئے اپلائی کر دیا۔ چونکہ میرے پاس یورپی یونین کا دو سال کا ریگولر ویزہ تھا اس لئے مجھے میکسیکو کے ویزے کے لئے زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔ ایمبیسی نے 150 یورو ویزہ فیس لی، میرے کاغذات کی فوٹو کاپیاں انکوائری کے لئے رکھ لیں اور تین دن بعد کی تاریخ دے دی۔ کارل سروہے سے برلن صرف 6 گھنٹے کا سفر تھا اس لئے ہم برلن رکنے کی بجائے واپس کارل سروہے آ گئے۔

تین دن بعد صبح 9 بجے ہم نے میکسیکن ایمبیسی میں پاسپورٹ جمع کروایا اور ویٹنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ 2 بجے ایمبیسی نے میرے پاسپورٹ پر میکسیکو کا چار مہینے کا ویزہ لگا کر پاسپورٹ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے اسی وقت ظفر بھائی کو فون کر کے ویزہ لگ جانے کی اطلاع دی اور واپس کارل سروہے جانے کی بجائے برلن سے میکسیکو سٹی (Mexico City) کے لئے ایرو میکسیکو کی دو ٹکٹیں لے لیں۔ ایسگارڈ کے پاس امریکن پاسپورٹ تھا اس لئے اسے ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی میکسیکو میں ویزہ فری انٹری تھی۔

دوسرے دن رات کے دس بجے ہماری میکسیکو کے لئے فلائیٹ تھی۔ آٹھ بجے کے قریب ہم ائیر پورٹ پر پہنچ گئے اور امیگریشن کروانے کے لئے لائین میں لگ گئے۔ میرے آگے ایسگارڈ تھی، کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی نے ایسگارڈ کا پاسپورٹ لیا، ایک دو سوال کئے اور اسے بورڈنگ پاس (Boarding Pass) دے دیا۔ اس کے بعد میری باری تھی۔ میں نے اپنا پاسپورٹ اور جہاز کا ٹکٹ لڑکی کو پکڑایا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی نے ایک نظر میرے پاسپورٹ پر ڈالی اور وہی پولیس والا چکر پھر شروع ہو گیا جو یونان میں میرے ساتھ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

میں سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس اہلکاروں کے ساتھ امیگریشن آفس چلا گیا۔ اس بار میرے پاس اصل پاسپورٹ اور اصل ویزہ تھا اس لئے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ آدھے گھنٹے تک امیگریشن کے اہلکار مجھ

سے مختلف سوالات کرتے رہے اور میں اعتماد سے ان کے سوالات کے جوابات دیتا رہا۔ چونکہ میں نے میکسیکو سے واپس نہیں آنا تھا اس لئے ایسگارڈ نے یہ شو نہیں کروایا تھا کہ وہ مجھے جانتی ہے اور ہم اکٹھے سفر کر رہے ہیں۔ اس نے جہاز کی ٹکٹیں بھی کارڈ کی بجائے نقد پیسے دے کر علیحدہ علیحدہ خریدیں تھیں۔ میکسیکو کی ایمبیسی میں میں نے یہ کہہ کر ویزہ لیا تھا کہ میں چمڑے کا بزنس مین ہوں، میری پاکستان میں دستانوں کی فیکٹری ہے اور میں میکسیکو میں بزنس کے لئے مارکیٹ کا جائزہ لینے جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے تک امیگریشن کے اہلکار مجھ سے مختلف سوالات کرتے رہے اور آخر کار انہوں نے مجھے پاس کر دیا۔ میں نے واپس جا کر کاؤنٹر سے اپنا بورڈنگ پاس لے لیا اور اندر گیلری میں جا کر اپنی فلائیٹ کا انتظار کرنے لگا۔

ساڑھے 9 بجے ہم جہاز میں بیٹھے اور ٹھیک دس بجے جہاز رن وے پر آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔ اگلے کچھ ہی منٹوں میں اس نے رن وے چھوڑا اور برلن کی فضاؤں میں بلند ہونے لگا۔ ایک مخصوص بلندی پر پہنچنے کے بعد جہاز سیدھا ہوا اور میکسیکو کی طرف بڑھنے لگا۔ برلن سے میکسیکو 13 گھنٹے کی فلائیٹ تھی۔ ہم شام چھ بجے میکسیکو سٹی کے ائیر پورٹ پر اتر گئے۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ میں نے 13 گھنٹے کی فلائیٹ بتائی تھی لیکن یہاں تو جہاز 20 گھنٹے میں پہنچا ہے تو جناب اس میں 7 گھنٹے کا جرمنی اور میکسیکو کے ٹائم کا فرق بھی موجود ہے۔

میکسیکو رقبے کے لحاظ سے امریکہ کا چھٹا جبکہ دنیا کا تیرہواں بڑا ملک ہے۔ اس کا ٹوٹل رقبہ 1964375 (انیس لاکھ چونسٹھ ہزار تین سو پچھتر) ہے اور آبادی بارہ کروڑ ہے۔ پاکستان سے تین گنا بڑے رقبے والا ملک اور اس کی آبادی ہم سے بھی آدھی ہے۔ آبادی کے حساب سے یہ دنیا کا گیارہواں بڑا ملک ہے۔ یہاں کی 100 فیصد آبادی Spanisn زبان بولتی ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا ہسپانوی زبان بولنے والا ملک ہے۔ جبکہ ہسپانوی زبان کے اصل ملک سپین میں چار کروڑ 70 لاکھ لوگ ہسپانوی زبان بولتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں صرف امریکہ میں ہی چار کروڑ لوگ ہسپانوی زبان بولتے ہیں۔ یہ زبان دنیا کے چھبیس ملکوں میں بولی جاتی ہے اور انگلش کے بعد دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔ انگلش سے اگر امریکہ اور کینیڈا نکال دیں تو پیچھے کچھ بھی نہیں بچتا ہے۔ یہی حال ہندی اور چینی زبان کا ہے۔ ہسپانوی اور پرتگیز زبانیں بالکل ایک جیسی ہیں۔ اگر ایک شخص ہسپانوی زبان جانتا ہے تو وہ پرتگیز زبان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اگر ان دونوں زبانوں کو ایک مان لیا جائے تو اس میں پرتگال اور برازیل بھی آ جائیں گے۔

کچھ قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ میں ہسپانوی زبان کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہوں۔ یہ اس لئے ہے کہ سپین کے ساتھ ہم مسلمانوں کی ایک ان دیکھی سی جذباتی وابستگی ہے۔ یہ وہی سپین ہے جس پر ہم مسلمانوں نے 850 سال تک حکومت کی۔ جب ہم مسلمانوں میں اتحاد ختم ہو گیا، بیٹا باپ کی بادشاہت چھیننے کے چکر میں پڑ گیا، مسلمان ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے لگ گئے تو یہ عظیم الشان ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔

ہم لوگ کہتے ہیں کہ پورا یورپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، ہم مسلمانوں نے ان کو جینے کا سلیقہ سکھایا۔ شاید ہم لوگ صحیح کہتے ہیں لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب مسلمان سپین سے باہر نکلے تو یہی ملک پورے جنوبی امریکہ پر قابض ہو گیا۔ سپین، فرانس اور انگلینڈ یہ تینوں ملک مسلمانوں کے جانے کے بعد اپنی سرحدوں سے باہر نکلے اور پوری دنیا میں پھیل گئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب تاج برطانیہ کی سلطنت میں سورج بھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ سپین پورے جنوبی امریکہ تک پھیل گیا اور فرانس کے حصے میں افریقہ آ گیا۔ آج بھی آپ دنیا کا نقشہ نکال کر دیکھ لیں۔۔۔ آپ کو فرانس اور انگلینڈ کے جزیرے انڈیا کے ساحلوں کے نزدیک بھی نظر آئی گے اور امریکی ساحلوں کے قریب بھی۔

دنیا کو سکندر سے لے کر جدید تاج برطانیہ تک بڑی بڑی طاقتوں نے فتح کیا ہے۔ سب عارضی تھا، اصل کامیابی صرف مسلمانوں اور یورپ والوں کو ہی ملی۔ مسلمان مدینے سے باہر نکلے اور دنیا کے تین بر اعظموں میں اپنی حکومت قائم کی جو آج پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ مسلمانوں کے سپین چھوڑنے کے بعد یورپ، ایشیاء اور افریقہ کے علاوہ باقی تین براعظموں پر بھی قابض ہو گیا۔ خدا کامیابی صرف انہی لوگوں کو نصیب کرتا ہے جو انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ یورپ والوں نے افریقہ اور امریکہ کے جنگلیوں کو جینے کا سلیقہ سکھایا۔ آپ آج کی تاریخ نکال کر دیکھ لیں، جس جس ملک میں انگلینڈ حکومت کر کے گیا ہے وہ ملک باقی ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ مہذب ہیں۔

کچھ لوگ شاید ہمارا موازنہ عرب ملکوں سے کرنے لگیں اور آپ کو عرب ملک زیادہ امیر اور ترقی یافتہ لگیں۔ ان ملکوں کے پاس تیل کے علاوہ اور کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ سعودی عرب سب سے بڑا ملک ہے لیکن وہ ایک سوئی بھی نہیں بنا رہا۔ مرغی کا گوشت بھی وہ لوگ باہر سے درآمد کرتے ہیں۔ تیل کے پیسوں سے بڑی بڑی عمارتیں اور سڑکیں بنا رہا ہے، جس کی وجہ سے مزدور کی طلب ہوتی ہے اور ملک میں پیسہ سرکل کرتا ہے اور

بس! دنیا کی پہلی جمہوریت ہمارے اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس وقت متعارف کروائی تھی جب کسی کو جمہوریت کے لفظ کا بھی نہیں پتہ تھا۔ بیٹا باپ کی ساری جائیداد کا مالک ہوتا ہے لیکن حکومت کا نہیں۔ باپ کی جگہ پر اس کا بیٹا ملک کا بادشاہ نہیں بن سکتا، یہ نظریہ اسلام نے دیا تھا۔

حضرت امام حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری بھی اسی شرط پر دی تھی کہ اس کے بعد اس کا بیٹا یزید خلیفہ نہیں بنے گا۔ حضرت امام حسینؓ نے شہادت بھی اسلام کی اسی جمہوریت کی خاطر دی تھی۔ اسلام سے پہلے بادشاہ شہروں کے شہر اجاڑ دیتے تھے اور کوئی بھی ان سے سوال نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اسلام ہی تھا جو ایک چادر کے معاملے پر بھی خلیفۂ وقت کو عدالت کے کٹہرے میں لاکر کھڑا کر دیتا تھا۔ اسلام میں بادشاہت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ بیٹا باپ کی جگہ پر بادشاہ نہیں بن سکتا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نبی پاک ﷺ کے خاندان سے نہیں تھے لیکن چونکہ آپ سب سے زیادہ عرصے تک محمد ﷺ کے ساتھ رہے تھے اور پورے مدینے میں سب سے معزز صحابہ میں سے تھے، اس لئے نبی پاک ﷺ کے بعد آپ کو خلیفہ بنایا گیا۔ آپؓ کے بعد حضرت عمر بن خطابؓ برسراقتدار آئے اور خلافت سنبھالی۔ یہ بھی نہ تو حضرت محمد ﷺ کے رشتہ دار تھے اور نہ ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے۔ خلافت باپ سے بیٹے کو منتقل نہیں ہوئی بلکہ ایک صحابی سے دوسرے بزرگ صحابی کو منتقل ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے قبل چھ صحابہ کے نام دیئے کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنالو۔ یہ چھ کے چھ صحابہ حضرت عمرؓ کے کوئی رشتہ دار نہیں تھے۔ ان چھ میں حضرت علیؓ بھی تھے اور حضرت عثمان غنیؓ بھی۔۔۔ ان چھ صحابہ نے حضرت عثمان غنیؓ کو خلیفہ بنایا۔ آپ بنوامیہ کے خاندان سے تھے جو نبی پاک ﷺ کے خاندان بنو ہاشم کا پچھلے کئی عشروں سے مخالف تھا۔ اسلام سے پہلے بنوامیہ اور بنو ہاشم ایک دوسرے کے مخالف تھے لیکن اسلام کے بعد یہ دونوں خاندان پھر آپس میں مل گئے۔ یہ اسلام کی ہی طاقت تھی جو اپنے مخالف خاندان کو عزت بھی دی اور خلافت بھی۔

اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ تھے جو نبی پاک ﷺ کے چچا زاد بھائی اور ان کے داماد تھے۔ اسلام یہ ہے۔۔۔ بادشاہ کا بیٹا کبھی بھی بادشاہ نہیں ہوتا۔ کروڑوں لوگوں پر حکومت کرنے کا حق صرف اسی شخص کو ہوتا ہے جو اس کا اہل ہو، نہ کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ بن کر حکومت کرنے لگے۔ ہمارے کچھ مسلمان بھائی اور کسی چیز میں مضبوط ہوں یا نا ہوں لیکن نفرت اور گالیاں دینے میں بہت آگے ہیں۔ معاف کر دینا یہ شیوہ ہم لوگوں نے

سیکھا ہی نہیں ہے۔ اسلام کی بات کرنے کے لئے پانچ وقت کی نماز اور مولوی ہونا لازمی نہیں ہے۔ اسلام سب کا ہے اور اسلام کی حقانیت اور اس کی سچائی بیان کرنا سب کا حق ہے۔

جہاز ٹھیک چھ بجے شام کو میکسیکو سٹی لینڈ کر گیا۔ یہاں پر بھی ایسگارڈ تو فوراً ہی اپنی امیگریشن کروا کر نکل گئی لیکن مجھے ادھر بھی ائیر پورٹ کے عملے نے گھیر لیا اور ایک بار پھر سوالات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک۔۔۔ وہی پرانے سوالات بار بار دہرا رہے تھے تاکہ میں کہیں غلطی کر جاؤں۔ اس بار یہ عمل آدھے گھنٹے سے بڑھ کر ایک گھنٹے تک چلا گیا۔ چونکہ میرے پاس سب کچھ اصل تھا اس لئے آخر کار انہوں نے مجھے کلئیر کر دیا اور میں ائیر پورٹ سے باہر آ گیا۔

میں امریکہ کے بالکل نزدیک پہنچ گیا تھا۔ یہاں سے امریکہ صرف 750 کلومیٹر دور رہ گیا تھا۔ ہم نے میکسیکو سٹی سے بس پکڑی اور اسی رات مونٹری (Monterrry) آ گئے۔ مونٹری پچاس لاکھ کی آبادی والا میکسیکو کا نوواں بڑا شہر ہے۔ مونٹری نام کا ایک اور شہر امریکہ کی ریاست کیلیفورنیا میں بھی ہے۔ یہ 27 ہزار کی آبادی والا چھوٹا سا شہر ہے جو سان فرانسسکو سے 190 کلومیٹر دور ہے۔ رات کو ہم ادھر پہنچ گئے اور ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ میرے پاس ابھی چار مہینے کا ویزہ موجود تھا اس لئے مجھے زیادہ جلدی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں آرام سے میکسیکو میں گھوم پھر کر کسی اچھے ایجنٹ کی تلاش کرتا اور پھر امریکہ کا بارڈر کراس کر لیتا۔

دو دن تک ہم دونوں اسی شہر میں گھومتے رہے۔ تیسرے دن صبح صبح خلیل بھائی کا فون آ گیا اور اس نے مجھے مونٹری سے سبینس ہیڈالگو (Sabinas.Hidalgo) جانے کو کہا۔ خلیل ہیل براؤن میں جس فیکٹری میں کام کرتا تھا وہیں ایک انڈین لڑکا بھی کام کرتا تھا۔ جس کے گاؤں کا کوئی لڑکا میکسیکو سے بارڈر کراس کر کے امریکہ گیا تھا۔ خلیل نے اس سے میرا ذکر کیا تو اس لڑکے نے پیچھے انڈیا فون کر کے میکسیکو سے امریکہ بھجوانے والے ایک ایجنٹ کا نمبر لے لیا۔ ایجنٹ بھی انڈین سردار تھا جو آگے میکسیکن نژاد امریکی ڈنکر کو لڑکے دیتا تھا اور وہ لڑکوں کو آگے امریکہ لے جاتا تھا۔ خلیل کی اس سردار ایجنٹ سے دس ہزار ڈالر میں بات ہوئی تھی۔ ہم ڈیل فائنل کی اور ہوٹل کے کمرے کی ساری ادائیگی کر کے باہر آ گئے۔

مونٹری سے ہیڈالگو 100 کلومیٹر دور تھا۔ یہاں سے ایک ٹرین نکلتی تھی جو ڈیڑھ گھنٹے میں ہیڈالگو پہنچا دیتی تھی۔ ہم نے ٹرین پکڑی اور ہیڈالگو پہنچ گئے۔ یہ پچاس ہزار کی آبادی والا ایک چھوٹا سا شہر تھا جو میکسیکو کی

جنگ آزادی کے ہیرو (MIguel Hidalgo) کے نام پر تھے۔ میں نے اسٹیشن سے باہر نکل کر ایجنٹ کو فون کیا تو اس نے مجھے ادھر ہی انتظار کرنے کا کہا اور فون بند کر دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک انڈین لڑکا اسٹیشن پر آیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ہمیں ہی تلاش کر رہا ہے اس لئے میں اور ایسگارڈ اس کی طرف چل دیئے۔

''السلام وعلیکم متر جی! کیسے ہو؟'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ست سری اکال! یہ عورت بھی آپ کے ساتھ جا رہی ہے؟'' اس نے ایسگارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں پا جی! یہ آگے سے مجھے رسیو کرے گی، اس کے پاس امریکن پاسپورٹ ہے۔'' میں نے انہیں بتاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، پیسے کی گارنٹی تو گرومیل سنگھ (Gurumail Singh) سے ہو گئی ہے۔ آج رات ہی ہم بارڈر کراس کرنے کی کوشش کریں گے اور امید ہے کل صبح تک آپ امریکہ پہنچ جاؤ گے۔ باقی آپ پیسے کہاں دو گے؟'' وہ مجھ سے پیسوں کا پوچھنے لگا۔

''بھائی جی! آپ امریکہ پہنچا کر جو اکاؤنٹ نمبر دیں گے ایسگارڈ وہاں پیسہ ٹرانسفر کروا دے گی۔۔۔ یا پھر اگر آپ نے بائی ہینڈ لینے ہیں تو پھر بھی امریکہ جدھر آپ کہو گے یہ ادھر آ کر آپ کو پیسے دے دے گی اور میں اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔'' میں نے ان کو تفصیل بتائی۔

''بنک ٹرانسفر تو نہیں ہو سکتا، آپ سب کو یہاں سے سان انٹونیو (San Antonio) پہنچایا جائے گا۔ سان انٹونیو تک پہنچا کر ہم پیسہ وصول کرتے ہیں اور اس سے آگے آپ کی جواب داری ہوتی ہے۔ ان کو کہیں کہ یہ سان انٹونیو چلی جائیں اور ادھر ہی ہمارا انتظار کریں۔ کل ادھر پہنچ کر ہم آپ کو ان کے حوالے کر دیں گے۔'' اس نے ایسگارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں ایسگارڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ٹھیک ہے ایسگارڈ؟ اب تم امریکہ چلی جاؤ اور دعا کرنا یار! خدا خیریت سے مجھے بھی امریکہ پہنچا دے۔'' میں نے ایسگارڈ سے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''راضی! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہی ڈنکی لگاؤں؟ میرا تم سے دور ہونے کو دل ہی نہیں مانتا ہے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسگارڈ! یہ ممکن نہیں ہے۔ بارڈر پر ہمارے ساتھ تم پکڑی گئی تو پرابلم ہو جائے گی۔ پہلے تو انسانی سمگلنگ کے الزام سے بچ گئی تھی لیکن اس بار نہیں بچو گی۔'' میں نے اس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

''ایسگارڈ! تم بہت قیمتی ہو۔۔۔ میری کوئی ویلیو، کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن تم۔۔۔ تم جیسی دوست مجھے کہیں نہیں ملے گی۔ خدا نے اگر ایمان کو میری زندگی میں نہ بھیجا ہوتا تو قسم ہے مجھے اس پیدا کرنے والے کی میں ساری زندگی تمہارے لئے گزار دیتا۔ ابھی بھی میں ساری دنیا کا احسان اتار سکتا ہوں لیکن تمہاری اس دوستی کا احسان میں مر کر بھی نہیں اتار سکتا۔ تم میرے لئے بہت قیمتی ہو ایسگارڈ! میں تمہیں پھر سے کھونا نہیں چاہتا، اس راضی کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔'' میں اس سے علیحدہ ہوا اور سردار امرجیت سنگھ کے ساتھ چل پڑا اور ایسگارڈ واپس اسٹیشن کی طرف مڑ گئی۔

امرجیت سنگھ (ایجنٹ کا نام امرجیت سنگھ تھا اور وہ ہریانہ کا رہنے والا تھا) مجھے لے کر ایک کافی شاپ پر آ گیا۔ یہاں پر پہلے بھی چار لڑکے بیٹھے ہوئے تھے اور یہ سب لڑکے انڈین تھے۔ اس نے ان لڑکوں کو بھی ساتھ لیا اور پرانی سی کار میں بٹھا کر ہمیں پراس (Paras) لے کر آ گیا۔ 1500 افراد پر مشتمل یہ چھوٹا سا گاؤں امریکن بارڈر سے صرف چالیس کلومیٹر دور تھا۔ یہاں سے 35 کلومیٹر آگے میکسیکو کا آخری ٹاؤن نیویا گوریرو (NUEVA CIUDAD GUERRERO) تھا۔ پانچ ہزار کی آبادی والا گوریرو شہر بارڈر سے پانچ کلومیٹر دور تھا۔ ہمارا ایجنٹ امرجیت ہمیں پراس لے جانے کی بجائے گاؤں سے باہر جنگل میں لے گیا۔ اس پورے گاؤں کی ذریعہ آمدن زراعت اور بھیڑ بکریاں پالنا تھا۔

امرجیت ہمیں جہاں لے کر آیا تھا وہ جگہ پرانا بھیڑوں کا فارم تھا جو جنگل کے عین درمیان میں بنا ہوا تھا۔ یہاں تک پہنچنے کے لئے ایک چھوٹی کچی سڑک تھی جو بالکل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ ہم سے پہلے بھی یہاں تقریباً پندرہ بیس کے قریب لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کو بارہ بجے کے قریب ایک بڑی وین میں ہم سب لڑکوں کو ڈال کر بارڈر کے نزدیک پہنچا دیا گیا۔ بارڈر سے پانچ کلومیٹر پہلے ہی ہمیں اتار دیا گیا اور پھر پیدل ہی آگے بڑھنے لگے۔

امرجیت ہمیں ادھر چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ یہاں سے آگے دو امریکن ڈنکر ہمیں لے کر جا رہے تھے۔ یہ بارڈر کی دوسری طرف ایک امریکی گاؤں ذاپاتا (Zapata) کے رہنے والے تھے۔ دونوں ہسپانوی زبان بولتے تھے۔ امریکہ میں چار کروڑ افراد ہسپانوی زبان بولتے ہیں اور ان کی بڑی تعداد

ٹیکسس (Texas) اور نیو میکسیکو میں رہتی ہے۔ یہ دونوں ایجنٹ ایک دوسرے کے چچا زاد بھائی تھے اور ان کے دادا میکسیکو سے امریکہ آ گئے تھے۔ ان کے آدھے سے زیادہ رشتہ دار آج بھی میکسیکو میں رہتے تھے۔

دونوں ڈنکر پیدل چلاتے ہوئے ایک بجے کے قریب ہمیں دریائے ریو گرانڈے (Rio Grande) پہنچ گئے۔ ریو گرانڈے امریکی کولوراڈو سے نکلتا ہے اور ایل پاسو سے یہ امریکن میکسیکو بارڈر بن جاتا ہے اور پھر ایل پاسو سے لے کر گلف آف میکسیکو کے سمندر تک یہ امریکہ اور میکسیکو کی سرحد پر بہتا ہے۔ 3,051 کلو میٹر کے ساتھ یہ شمالی امریکہ کا پانچواں بڑا دریا ہے۔ یہ دریا میکسیکو اور امریکہ کے بارڈر کے علاوہ چار لاکھ بہتر ہزار مربع کلومیٹر رقبہ بھی سیراب کرتا ہے۔

دونوں ڈنکر ہمیں ریو دریا پر بننے والی ایک بہت بڑی جھیل کے کنارے پر لے کر آ گئے تھے۔ ہم اس جھیل کے بالکل اوپری کنارے پر کھڑے تھے۔ جنگل کے اندر انہوں نے ایک ربڑ بوٹ بھی چھپائی ہوئی تھی۔ ربڑ کی کشتی تھی اور دو لڑکے آرام سے اسے اٹھا سکتے تھے۔ دریا کے کنارے پر لا کر انہوں نے کشتی میں ہوا بھری اور دریا میں اتار کر ہم سب لڑکوں کو کشتی میں سوار کروا دیا۔ کشتی چھوٹی ضرور تھی لیکن پھر بھی بیس لڑکوں کا بوجھ اٹھا گئی تھی۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے چپوؤں کی مدد سے انہوں نے کشتی کو دوسرے کنارے کی طرف بڑھانا شروع کر دیا۔ یہاں سے دریا تقریباً پانچ سو میٹر چوڑا تھا۔ رات کے اندھیرے میں دریا کے ایک کنارے سے دوسرا کنارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پانچ سو میٹر کا دریا بہت بڑا دریا ہوتا ہے۔ ایک ماہر تیراک ہی اسے پار کر سکتا ہے، عام تیراک اسے کبھی بھی پار نہیں کر سکتے۔

پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا، ہم سیدھے جانے کی بجائے پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ رہے تھے اور یہی پانچ سو میٹر کا فاصلہ پندرہ سو میٹر یعنی ڈیڑھ کلومیٹر بن گیا تھا۔ ہمیں دریا پار کرنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا اور ہم دوسری طرف امریکہ پہنچ گئے۔ ڈنکروں نے ایک ایک کر کے لڑکوں کو دوسرے کنارے پر اتارنا شروع کر دیا۔ میں کشتی کے کنارے پر آیا اور میں نے ہاتھ بڑھا کر دوسری طرف کے کنارے کو چھوا۔ گیلی مٹی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے مٹی کو مٹھی میں لیا اور اپنے ماتھے پر لگا لیا۔ اس امریکہ کے لئے میں نے اپنی زندگی کے گیارہ سال لگا دیئے تھے۔ جوانی کے گیارہ سال میں نے اس امریکہ کے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے میں لگا دیئے تھے اور آج جب امریکہ کی مٹی نصیب ہوئی تو اسے بے اختیار اپنے ماتھے پر لگانے لگا۔

''جلدی جلدی کرو، یہاں بہت خطرہ ہے۔'' میرے پیچھے کھڑے ڈنکر نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا

اور میں جلدی سے کنارے پر آ گیا۔

امریکہ کی طرف دریا کے دوسرے کنارے پر بھی جنگل ہی تھا۔ ڈنکروں نے کشتی سے ہوا نکالی اور ہمیں لے کر جنگل کے اندر کی طرف بڑھنے لگے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد ہمیں ایک دیوار نظر آ گئی جس کی دوسری طرف پکی سڑک تھی۔ اس پر امریکی بارڈر پٹرول کی گاڑیاں اور کیمرے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ امریکہ کی حدود تو دریا کے دوسرے کنارے سے شروع ہو جاتی تھی۔ ہم اس وقت امریکی حدود میں ہی تھے لیکن اصل امریکہ اس دیوار کی دوسری طرف تھا۔ امریکہ نے یہاں اپنی حدود میں دیوار تعمیر کی تھی اور اس دیوار کے دونوں طرف امریکہ کی سیکورٹی تھی۔ یہ مکمل فول پروف سیکورٹی تھی اور کوئی بھی آسانی سے اس سیکورٹی کو توڑ کر امریکہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ امریکہ سپر پاور تھا لیکن امریکہ کے انسانی سمگلر بھی اسی امریکہ کے رہنے والے تھے۔ امریکہ ایک جگہ پر سختی کرتا تھا تو وہ دوسری طرف سے کوئی اور راستہ نکال لیتے تھے۔

ڈنکر ہمیں آگے بڑھانے کی بجائے جنگل میں اوپر کی طرف بڑھنے لگے۔ پانچ گھنٹے کی مسلسل ڈنکی کے بعد ہم نے سیمنول (Seminole) پارک کو کراس کر لیا۔ یہ سارا نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ جنگل میں درختوں کی بجائے قد آور جھاڑیاں تھیں اور جو علاقہ کاشت کے قابل تھا ادھر گندم کے کھیت تھے۔ ہم دریائے پیکوس کے کنارے پر پہنچ گئے تھے۔ دریائے پیکوس سے ایک نالہ نکلتا تھا جو گندم کے کچھ کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ گندم کی فصل کو ابھی پانی کی ضرورت نہیں تھی اس لئے اس نالے کو عارضی طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ یہ نالہ دریا سے نکلتا تھا اور جنگل کے بیچوں بیچ سے گزرتا ہوا آگے جا کر پھر دریا سے مل جاتا تھا۔ دن کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی تو ڈنکروں نے ہمیں نالے کے اندر بٹھا دیا۔

''آج سارا دن تم ادھر ہی لیٹے رہو گے اور کوئی بھی نالے سے باہر نہیں نکلے گا۔ کل رات کو پھر آگے کا سفر کریں گے۔ کوئی بھی لڑکا کسی بھی حالت میں نالے سے باہر جھانکنے کی کوشش مت کرے۔ یہاں چاروں طرف کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کی لوکیشن کا پتہ ہے اس لئے اس سے بچا کر یہاں تک لے آئے ہیں۔ دن کو ادھر ڈرون بھی فضائی نگرانی کریں گے۔ سو کچھ بھی ہو، بے شک ادھر ہی بھوکے پیاسے مر جاؤ لیکن باہر نہیں نکلنا، ورنہ واپس ڈی پورٹ ہو جاؤ گے۔'' ڈنکروں نے ہمیں سمجھایا اور ہمیں ادھر ہی چھوڑ کر خود واپس چلے گئے۔ پانی کی وجہ سے نالے کے اوپر کافی گھاس تھی۔ یہ وجہ تھی کہ ہم اتنی آسانی سے نظر نہیں آ سکتے تھے۔

سورج طلوع ہوا تو دن کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ آہستہ آہستہ سورج نے اوپر آنا شروع کر دیا تو لڑکوں کو بھی بھوک پیاس نے تنگ کرنا شروع کر دیا لیکن سبھی لڑکے برداشت کر کے ادھر ہی لیٹے رہے۔ ہم لوگ پیشاب کے لئے بھی نہیں اٹھ رہے تھے بلکہ ادھر ہی بیٹھے بیٹھے ایک سائیڈ پر ہوتے اور دوبارا ادھر ہی لیٹ جاتے۔ شام تک ہم سب مکمل طور پر تھک کر چُور ہو چکے تھے۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب ڈنکر آ گئے اور انہوں نے ہمیں نالے سے باہر نکال کر پھر آگے پیدل چلانا شروع کر دیا۔ دریائے پیکوس ہم سے صرف دو کلو میٹر دور تھا، ہم آدھے گھنٹے تک دریا کے کنارے پر پہنچ گئے۔ ڈنکروں کے پاس ادھر بھی ربڑ کی کشتی موجود تھی، انہوں نے کشتی میں ہوا بھری اور پھر ہمیں کشتی میں سوار کروا دیا۔

اس بار ہم دریائے پیکوس میں اوپر کی طرف سفر کر رہے تھے۔ یہ ریو دریا کی نسبت چھوٹا دریا تھا اور اس کا بہاؤ بھی بہت کم تھا۔ ڈنکر کشتی کو دریا میں اوپر امریکہ کی طرف لے جانے لگے۔ ایک گھنٹے تک مسلسل سفر کرنے کے بعد ہم نے US90 سڑک کو نیچے سے عبور کر لیا۔ ہماری منزل ابھی بھی دور تھی، خطرہ ابھی تک موجود تھا۔ ڈنکر ہمیں زیادہ سے زیادہ بارڈر سے دور لے کر جا رہے تھے۔ مزید ایک گھنٹے تک دریا میں سفر کرتے ہوئے مجھے اچانک گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ کوئی ان دیکھا خطرہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پٹرولنگ پولیس کی دو گاڑیاں دریا کی دونوں پٹیوں کے ساتھ ساتھ تیزی سے دوڑتی ہوئی ہمارے نزدیک آنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے تیز سرچ لائٹوں نے ہماری کشتی روشنی میں بدل کر رکھ دیا۔ اب دونوں گاڑیاں ہماری کشتی کے اوپر آ کر کھڑی ہو گئیں تھیں اور بارڈر پولیس کے جوان گاڑیوں سے باہر نکل کر دریا کے کنارے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک پولیس والا اونچی آواز میں ہمیں کنارے پر آنے کے لئے کہنے لگا۔ پولیس کی وارننگ ابھی جاری تھی جب اچانک دونوں ڈنکروں نے کچھ لڑکوں کو دریا میں دھکا دیا اور خود بھی دریا میں کود گئے۔ پولیس والوں نے لڑکوں کو دریا میں کودتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ میں بھی باقی لڑکوں کے ساتھ دریا میں کود گیا۔

اتنی دیر میں پولیس کی دو اور گاڑیاں بھی پیچھے سے آ گئیں تھیں اور ان میں سے پولیس والے باہر نکل کر ہمارے پیچھے دریا میں کود گئے۔ ابھی دونوں سائیڈوں پر پولیس والے کھڑے تھے اور پیچھے بھی پولیس والے دریا میں کود گئے تھے۔ پورا دریا سرچ لائیٹ کی روشنی سے دن بنا ہوا تھا۔ لڑکوں کو فرار کی کوشش کرتے ہوئے

انہوں نے دیکھا تو وہ دریا کے اندر گولیاں مارنے لگے۔ایک گولی میرے ساتھ تیرتے ہوئے لڑکے کے بازو میں لگی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ مجھے شک تھا کہ وہ صرف پانی میں ہی گولیاں ماریں گے یا فضائی فائرنگ کریں گے لیکن یہاں وہ ڈائریکٹ گولیاں مار رہے تھے۔ یہ چھوٹے کیلبز کی گولیاں تھیں جو صرف زخمی کرتی تھیں لیکن جان سے نہیں مارتی تھیں۔ ہاں، اگر کوئی گولی سیدھی دل پر آکر لگتی تو پھر بندے کی موت یقینی تھی۔ بصورتِ دیگر صرف زخمی ہی کر رہی تھیں۔

دو تین لڑکوں کو گولیاں لگیں تو سارے لڑکے کنارے پر آ گئے۔ دو تین میرے جیسے اکھڑ مزاج لڑکے تھے جن کو پولیس والوں نے دریا میں کود کر پکڑ لیا۔صرف آدھے گھنٹے کے آپریشن سے ہی ہم سب لڑکے پکڑے گئے تھے اور ہمارے ساتھ دونوں ڈنکر بھی ان کے قابو آ گئے تھے۔ چار لڑکوں کو گولیاں لگی تھیں جن میں ایک ڈنکر بھی شامل تھا۔ پولیس والوں نے ہمیں پکڑا اور واپس ریوگرانڈے کے کنارے پر بنے ہوئے ایک عارضی کیمپ میں لے آئے۔ انہوں نے زخمی لڑکوں کی مرہم پٹی کی اور صبح چھ بجے کے قریب ہمیں دریا عبور کروا کر دوسری طرف میکسیکو بھیج دیا۔البتہ دونوں ڈنکروں کو وہ آگے سان انٹونیو لے گئے تھے۔

میکسیکو کی اس طرف ہمیں کوئی بھی پوچھنے والا نہیں تھا۔ میں نے دریا اور پھر اس سے آگے دیوار اور اس پر لگے ہوئے کیمرے دیکھ لئے تھے۔ بغیر ایجنٹ کے اس طرف سے بارڈر کراس کرنا ناممکن تھا اس لئے میں نے اکیلے بارڈر کراس کرنے والا آئیڈیا کینسل کر دیا۔ ہم سب لڑکے سارا دن جنگل میں چلتے ہوئے قریبی میکسیکن گاؤں میں پہنچے اور اپنے ایجنٹ کو فون کر دیا۔ ایجنٹ کو پہلے ہی ڈنکی کے پکڑے جانے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ ہمیں ہی جنگل میں تلاش کر رہا تھا۔ ہمارے فون کرنے کے دس منٹ بعد ہی وہ ایک بڑی وین پر آیا اور ہم سب لڑکوں کو بٹھا کر واپس ہیڈالگو لے گیا۔

اس بار ہماری رہائش شہر کے اندر ہی ایک تہہ خانے میں تھی۔ زخمی لڑکوں کو اس نے شہر میں ہی چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ اب ڈنکی لگانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ان کی قسمت میں اب واپس اپنے ملک ہی جانا لکھا تھا۔ ایسگارڈ کے پاس امرجیت کا موبائل نمبر تھا اور اسے امرجیت سے پتہ چل گیا تھا کہ میں واپس آ گیا ہوں۔ ڈنکی امریکہ میں پکڑی گئی تھی اور انہوں نے ہمیں واپس میکسیکو ڈی پورٹ کر دیا تھا اس لئے وہ واپس میکسیکو آ گئی۔ ایجنٹ نے اس سے میری صرف فون پر ہی بات کروائی حالانکہ وہ ایسگارڈ سے ملاقات کروا سکتا تھا۔ اس نے صرف اتنی مہربانی کی کہ میری اس سے بات کروادی۔ میں نے اس سے واپس امریکہ چلے جانے کا

کہا۔میری کسی بھی وقت دوسری ڈنکی لگ سکتی تھی۔اگر میں بارڈر کراس کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو وہ آگے سے مجھے لے سکتی تھی۔اسے شاید میری بات کی سمجھ آگئی اور وہ واپس امریکہ چلی گئی۔ہم اس ایجنٹ کے پاس دس دن تک رہے اوران دس دنوں میں مسلسل تین بار ریوگرانڈے دریا کو پار کر کے دوسری طرف اترنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ہی ناکام ہوئے۔

امریکہ کی صدارت ڈونلڈ ٹرمپ کے ہاتھ میں آگئی تھی اوراس نے اورکسی چیز پرسختی کی ہو یا نہ کی ہولیکن بارڈر پر بہت سختی کردی تھی۔بارڈر پر پٹرولنگ بھی ڈبل کردی تھی اور واپس میکسیکو ڈی پورٹ کرنا بھی شروع کردیا تھا۔بارڈر پٹرولنگ پولیس کوئی رجسٹریشن نہیں کرتی تھی اور صبح کے وقت دریا کراس کروا کر میکسیکو بھیج دیتی تھی۔پولیس والے مارتے بھی بہت تھے،گولی چلانے میں بھی ایک سیکنڈ کی ہچکچاہٹ نہیں دکھاتے تھے بلکہ سیدھا فائر مارتے تھے۔ہم بیس لڑکے تھے جواب کم ہوکر پندرہ رہ گئے تھے۔ہمارے دو مزید لڑکے زخمی ہوگئے تھے۔مجھے بارڈر کراس کرنا اب ناممکن نظر آرہا تھا۔ادھر سے ہمیں امریکی ریاست ٹیکساس لگتی تھی۔ جرمنی،فرانس اور بیلجیم میں دہشت گردی کے بڑے واقعات رونما ہوچکے تھے۔جرمنی اور فرانس دونوں ملک میں سیکورٹی انتہائی ہائی الرٹ تھی۔

ISIS کے دہشت مہاجرین کے روپ میں یورپ میں داخل ہوتے تھے اور پھر دہشت گردی کی منصوبہ بندی کرتے تھے۔ان دہشت گردوں نے پورے یورپ کوخوف میں مبتلا کردیا تھا اور یہی خوف اب امریکہ میں بھی محسوس ہورہا تھا۔یہی وجہ تھی کہ امریکی لوگ مہاجرین کوقبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہورہے تھے۔امریکی لوگوں میں مہاجرین کے خلاف نفرت بڑھ رہی تھی۔ان کی نظر میں ہم سارے مسلم مہاجرین دہشت گرد تھے۔ہم وہ بجھا ہوا بم تھے جوکسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔اسی خوف کا فائدہ ڈونلڈ ٹرمپ نے اٹھایا اور امریکیوں کومسلمان مہاجرین سے ڈرا کر ووٹ لینے میں کامیاب ہوگیا۔پہلی بار ایک غیر سیاسی آدمی اچانک ایک سال کے اندر اندر مشہور بھی ہوا،صدر بھی منتخب ہوگیا اوراب مہاجرین مخالف پالیسیاں بنارہا تھا۔

شاید کچھ قارئین میری بات سے متفق نہ ہوں کہ جب ہماری ملک کے باہر کوئی عزت نہیں ہے،گورے لوگ ہم سے نفرت کررہے ہیں تو ہم کیوں ان کے تلوے چاٹتے ہیں؟ کیوں ان گوروں کے کتے نہلاتے ہیں؟ انتہائی نفرت سے ایسے ہی جملے ہمیں سننے کو ملتے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ ہم مہاجرین ان گوروں کی غلامی کرتے ہیں۔یونان میں میرے مالک نے سور (Pork) پالے ہوئے تھے۔میں خود ان سوروں کو چارہ ڈالتا

تھا، ان کو نہلاتا بھی تھا اور ان کے جنگلے کی صفائی بھی کرتا تھا۔ یہ وہی سور ہیں جن کے بارے میں بچپن میں سنا کرتے تھے کہ ان کا نام بھی لینے سے زبان ناپاک ہو جاتی ہے۔ میں ان کو نہلاتا اور ان کے جنگلے صاف کرتا رہا ہوں۔

ہجرت کرنا ہمارے نبی محمد ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ بھی مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ہاں پناہ لی تھی اور یہودیوں سے معاہدے بھی کئے تھے۔ صرف جان بچانے کے لئے ہی نہیں بلکہ معاشی ضروریات کے لئے بھی ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ہمارے نبی پاک ﷺ کی حدیث ہے کہ؛

''اگر اپنے شہر یا ملک میں روزگار نہیں ملتا تو بہتر روزگار کے لئے دوسرے ملک کی طرف ہجرت کرو۔''

ہم مہاجرین ان گوروں کے کتے نہلاتے ہیں لیکن پورے یورپ اور امریکہ میں اسلام ہم مہاجرین کی وجہ سے ہی پھیل رہا ہے۔ خدا نے ہم مہاجرین کو اسلام پھیلانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ آج آپ کو پورے جرمنی اور فرانس کے ایک ایک گاؤں میں چرچ کے ساتھ ساتھ مسجد بھی نظر آئے گی۔ پورے جرمنی کے کسی بھی ریسٹورنٹ میں چلے جائیں آپ کو حلال کھانا ملے گا۔ ہوٹل کے اندر اور باہر مین گیٹ پر آپ کو حلال کی مہر نظر آئے گی۔

پاکستان میں بیٹھ کر فیس بک پر گالیاں دینے سے اسلام نہیں پھیلتا بلکہ اس کے لئے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ انہی گوروں کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے اسلام کو نقصان یہ عیسائی یا یہودی نہیں پہنچا رہے ہیں بلکہ یہ نام نہاد جہادی پہنچا رہے ہیں جو اسلام کے روشن چہرے کو دہشت گردی سے بگاڑ رہے ہیں۔ امریکی بھی انہی مہاجرین سے ڈر رہے تھے اور پٹرولنگ پولیس والے بھی انتہائی سختی کر رہے تھے۔ میں رمضان کے دنوں میں ایک انڈین ریسٹورنٹ میں کام کرتا تھا۔ ہماری میڈیم ہندو تھیں۔ وہ رات کو سپیشل باورچی کو کہہ کر میرے لئے سحری کا کھانا پیک کرواتی تھی اور جب گیارہ بجے میں ریسٹورنٹ سے چھٹی کرتا تھا تو وہ کھانا مجھے دے دیتیں تھیں تاکہ میں صبح سحری کر سکوں۔ افطاری کے وقت جتنا مرضی رش ہوتا وہ آدھے گھنٹے کی چھٹی دیتی تھیں۔ میں خود پانچ منٹ میں افطاری کر کے اوپر آجاتا تو وہ ناراض ہوتی تھیں۔

ویٹر کھانا لے جاتے وقت ایک چمچ لگا کر کھانا چیک کرتا تھا تاکہ کھانے میں کوئی کمی وغیرہ نہ رہے۔ اگر کسی کھانے میں شراب ڈالی ہوتی تو باورچی مجھے بتا دیتا تھا کہ راضی! اس کھانے میں تھوڑی سی شراب ڈال کر

تڑ کا لگایا ہے، اسے چیک مت کرنا۔ وہ سکھ تھا، ایک انڈین سکھ۔۔۔لیکن ایک مسلمان کے مذہب کی عزت کرتا تھا۔

دس دن تک ہم مسلسل بارڈر کراس کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔ ایجنٹ نے ادھر سے بارڈر کراس کرنے کی کوشش ترک کردی اور ہمیں مغربی جانب سونورا لے آیا۔ سونورا میکسیکو کی 32 ریاستوں میں سے ایک ہے جس کا مین شہر ہرموسیلو ہے۔ یہ ریاست امریکی ریاست ایری زونا کو لگتی ہے۔ مین شہر ہرموسیلو کی آبادی قریباً آٹھ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ ہم ہرموسیلو کی بجائے کابورکا آ گئے۔ یہ امریکن بارڈر سے سو کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ ایک رات اور اگلا دن انہوں نے ہمیں اسی شہر میں رکھا اور اگلی رات آٹھ بجے کے قریب ہم لڑکوں کو ایک وین میں ڈال کر بارڈر کی طرف لے جانے لگے۔

دو گھنٹے تک مسلسل سفر کرنے کے بعد وہ ہمیں ایک صحرا میں لے آئے اور گاڑی سے باہر نکلنے کو کہا۔ ہم تقریباً بیس کے قریب لڑکے تھے۔ ڈرائیور نے ہمیں ادھر ہی اندھیرے میں بٹھایا اور خود واپس چلا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک چھوٹی پک اپ ہمارے پاس آ کر رک گئی اور اس میں سے تین آدمی باہر نکلے۔ انہوں نے گاڑی میں پانی کی بوتلیں اور اتنے ہی بریڈ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے تین تین بڑی بوتلیں اور اتنے ہی بریڈ ہمیں دیئے اور اپنے اپنے بیگوں میں ڈالنے کو کہا۔ ہم نے ان سے سامان لیا اور اپنے اپنے بیگوں میں ڈال لیا۔

''یہاں سے آگے پانچ دن کا سفر ہے۔ سارا پیدل سفر ہے جو ریگستان میں ہی طے کرنا ہے۔ راستے میں کوئی گاؤں نہیں آئے گا اور نہ ہی کوئی پانی ملے گا اس لئے پانی اور بریڈ دونوں کو احتیاط سے استعمال کرنا! تین دن بعد ایک جگہ سے ہمیں پانی مل جائے گا اس لئے پانی کی خالی بوتل مت پھینکنا کیونکہ اس میں دوبارا بھرا جا سکتا ہے۔ تین دن کے بعد پانی ملنے کی صرف امید ہے۔ اگر پولیس کی کوئی پرابلم ہوئی تو ہم راستہ بدل لیں گے، اس لیے کبھی بھی پانی سارا استعمال مت کرنا۔ یہی ذہن میں رکھو کہ تین بوتلوں سے تم نے پانچ دن نکالنے ہیں۔'' ایک ڈنکر نے ہم سب کو سمجھایا اور پھر ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ ہم سب لڑکے قطار بنا کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ دوسرا ڈنکر قطار میں آخر پر چلا گیا اور تیسرا ڈرائیور تھا وہ گاڑی لے کر واپس چلا گیا۔

چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے ہمارا سفر شروع ہو گیا تھا۔ ہم سبھی بیس کے بیس

نوجوان لڑکے تھے۔ تین پاکستانی، دس انڈین اور باقی سات لڑکے جنوبی امریکہ کے دو غریب ملکوں ایکاواڈور اور بولیویا سے تھے۔ رات کو دو بجے کے قریب ہم بارڈر پر پہنچ گئے۔ یہ لوہے کی جالی سے بنی ہوئی دیوار تھی جو تقریباً بارہ فٹ کے قریب اونچی ہوگی۔ اندھیرا ہونے کے باوجود ہمیں ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف جاتی ہوئی دیوار نظر آ رہی تھی۔ بجلی کے پول بھی دوسری طرف لگے ہوئے تھے لیکن ان کی روشنی یہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

ڈنکروں نے ہمیں دیوار سے بیس میٹر دور ہی روک لیا۔ انہوں نے ایک پہاڑی کٹاؤ کے کنارے پر لگی ہوئی جھاڑیوں کو ہٹایا تو ہمیں ایک چھوٹی سی سرنگ نظر آ گئی۔ یہ بالکل چھوٹی سے سرنگ تھی جس میں ایک لڑکا چاروں ہاتھوں اور پاؤں کی مدد سے چل سکتا تھا۔ سب سے پہلے ہمارا ڈنکر آگے لگا اور سرنگ میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہم سب لڑکے بھی سرنگ میں داخل ہو گئے اور جانوروں کی طرح چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

ہم لوہے کی دیوار کو اوپر سے بھی رسی کی مدد سے پھلانگ سکتے تھے لیکن دیوار کے اوپر سنسر لگے ہوئے تھے اور دیوار کراس کرنے کی صورت میں ان کو پتہ چل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بجلی کے پولوں کے اوپر کیمرے بھی لگے ہوئے تھے اور ان سبھی کیمروں کا رخ دیوار کی طرف ہی تھا۔ ہم دیوار تو آسانی سے کراس کر جاتے لیکن دوسری طرف پہنچتے ہی پکڑے جاتے اور پھر ڈی پورٹ ہو جاتے۔ یہاں دریا نہیں تھا اس لئے باقاعدہ چیک پوسٹ پر رجسٹریشن ہوتی اور میکسیکن امیگریشن کے حوالے کیا جاتا، جس سے مجھے بہت پرابلم ہو جاتی کیونکہ میں اوریجنل طریقے سے میکسیکو کا ویزہ لیکر آیا تھا اور میرا سارا ریکارڈ میکسیکو کے پاس تھا۔ میرا ویزہ ریجیکٹ ہو جاتا اور مجھے واپس جرمنی ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔

امریکن پولیس کے پاس بارڈر کنٹرول کے لئے انتہائی جدید ترین طریقے تھے لیکن زمین کے اندر سرنگ کو ڈھونڈنے والی کوئی ٹیکنالوجی نہیں تھی۔ یہ سرنگ دیوار سے پانچ سو میٹر آگے تک تھی۔ ہمیں سرنگ کو کراس کرنے میں آدھا گھنٹہ لگا۔ دوسری طرف سرنگ کا دہانہ بھی جھاڑیوں کے اندر ہی تھا۔ یہاں دہانہ بالکل چھوٹا سا ہو گیا تھا جسے ایک ڈھکن کی مدد سے بند کر دیا گیا تھا۔ ہم سب لڑکے لیٹ کر باری باری اس دھانے سے باہر نکلنے لگے۔ آخر میں ڈنکر بھی باہر آیا تو اس نے دوبارا دھانے پر ڈھکن دے کر اس کے اوپر جھاڑیاں اور ریت ڈال دی۔ اب بالکل محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ ادھر کوئی سرنگ بھی موجود ہے۔

ڈنکر ہمیں لے کر جلدی جلدی آگے بڑھنے لگے۔ میں ایک بار پھر امریکہ کی حدود میں داخل ہو گیا تھا اور امریکی صحرا کے بیچوں بیچ سے گزر رہا تھا۔ چونکہ میں خود بھی صحرائی ہوں اور راجھستان کا رہنے والا ہوں، اس لئے صحرائی حسن مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے اور یہ تو ویسے ہی امریکی صحرا تھا۔ امریکہ۔۔۔ میرے محبوب کا عشق تھا اور صحرا میرا عشق۔ میں اس صحرا کے حسن میں کھونے لگا۔ ایک عجیب سا احساس میرے رگ وپے میں سرایت کرنے لگا اور میں مدہوش ہونے لگا۔ میری رفتار آہستہ ہوئی تو میں باقی لڑکوں سے پیچھے ہوتا ہوتا بالکل آخر میں پہنچ گیا۔

''اے! جلدی جلدی آگے بڑھو، اتنی جلدی تھک گئے؟'' ڈنکر نے مجھے پیچھے سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا تو میں اچانک ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا اور جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔ ڈنکر ہمیں مسلسل صبح چھ بجے تک چلاتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ہمیں جھاڑیوں کے اندر دو دو تین تین ہو کر چھپ جانے کا کہا۔ دن کو ہم انہی جھاڑیوں میں چھپے رہتے اور رات کو پھر آگے سفر شروع ہو جاتا۔

''جھاڑیوں میں اکثر سانپ بھی ہوتے ہیں، اس لئے پہلے احتیاط سے ہلکی سی جھاڑ لینا! سانپ بھاگ جائے گا تو پھر اندر جانا۔۔۔ اگر سانپ نے کاٹ لیا تو کوئی ڈاکٹر نہیں ملے گا اور ادھر ہی مر جاؤ گے۔'' ڈنکر نے آہستہ سے کہا اور ہم جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

ہم تینوں پاکستانی ایک ہی جھاڑی میں اکٹھے ہی چھپ کر لیٹ گئے۔ ایک پاکستانی ساہیوال سے تھا جب کہ دوسرا واہ کینٹ سے تھا۔ دونوں لڑکے ابھی نوجوان تھے۔ گرمیوں کے دن تھے اور ادھر امریکہ میں ایریزونا ریاست میں اچھی خاصی گرمی پڑتی ہے۔ بالکل پاکستان کی طرح ادھر بھی گرمی ہوتی ہے۔ سورج جب اوپر آیا تو گرمی کی شدت بڑھ گئی۔ ریت پر سورج کی روشنی پڑتی تو آگ سی اٹھتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ ذرا سی دیر میں ہی پیاس کی شدت سے حلق سوکھنے لگے تو لڑکے پانی پینے لگے۔ پانی بھی گرمی سے تپ گیا تھا اور پیاس بجھانے میں ناکام ہونے لگا۔

میں نے لڑکوں کو پانی پینے سے منع کیا کیونکہ مجھے صحرا میں رہنے کا تجربہ تھا۔ ابھی جتنا پانی پیتے اتنی ہی پیاس بڑھنی تھی۔ ہم پوری بوتل بھی پانی کی پی جاتے تو اگلے ایک گھنٹے میں پسینہ آتا اور وہ ساری پانی کی بوتل پسینے کے راستے نکل جاتی۔ گرم پانی کی وجہ سے ذہن کو دھوکا ہی رہتا ہے کہ ابھی تک پیاس باقی ہے اور اس سے مزید شدت سے پیاس محسوس ہونے لگتی۔ ذہن بار بار پیاس کی شدت کو بڑھاتا رہتا اور آخر کار ہم تینوں

بوتلیں ختم کر لیتے۔ میں نے اپنے ساتھ والے لڑکوں کو سمجھایا تو بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے باقی لڑکوں کو بھی سمجھانا شروع کر دیا۔

یہاں پولیس کی زیادہ پرابلم نہیں تھی۔ صحرا میں آواز کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہاں دور و نزدیک کوئی بھی نہیں تھا بلکہ صرف فضائی نگرانی کا ڈر تھا۔ امریکی ہیلی کاپٹر یا ڈرون صحرا میں سفر کرتے رہتے تھے۔ ہم جھاڑیوں میں اسی لئے چھپے ہوئے تھے تاکہ ان کے کیمروں سے بچ سکیں۔ فضا سے اوپر نظر نہیں آتا تھا۔ جیسے تیسے کر کے ہم نے دن گزار لیا اور رات کا اندھیرا پھیلتے ہی آگے بڑھنے لگے۔ ہم مسلسل چلتے رہے اور رات کو ایک بجے کے قریب بیٹھ کر کچھ لمحوں کے لئے آرام کیا اور ایک بار پھر اٹھ کر چلنے لگے۔ پانی کی شدید پیاس سے لڑکے ٹوٹ گئے تھے لیکن پھر بھی آگے بڑھ رہے تھے۔

صبح چھ بجے تک مسلسل چلنے کے بعد آخر ڈنکر رک گئے اور انہوں نے ہمیں پھر جھاڑیوں میں آرام کرنے کا کہا۔ ہم تینوں ایک محفوظ جگہ دیکھ کر ادھر آ گئے۔ اچانک مجھے ایک لڑکے کے چیخنے کی آواز آئی تو میں بے اختیار ادھر دیکھنے لگا۔ ڈنکر بھی بھاگ کر اس لڑکے کے پاس پہنچ گئے۔ اسے ایک سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ ایری زونا ریاست کے صحرا میں سانپوں کی بہتات ہے۔ ڈنکر نے ہمیں جھاڑیوں کو ہلا کر اندر لیٹنے کا کہا تھا۔ وہ انڈین لڑکا تھا۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ سانپ دوسری طرف بھاگنے کی بجائے اس کی طرف آ گیا۔ اس کے رستے میں آنے کی وجہ سے سانپ نے اس کی ٹانگ پر کاٹ لیا۔

زہر پھیلنا شروع ہوا تو لڑکے کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ڈنکر کے پاس بلیڈ اور رسی موجود تھی۔ اس کے علاوہ سانپ سے بچاؤ کا ٹیکہ بھی موجود تھا۔ ڈنکر نے جلدی سے اس کی ٹانگ کو باندھا اور بلیڈ سے زخم کو گہرا کر کے خون باہر نکالنے لگا۔ یہ طریقہ نارمل سانپ کے کاٹنے کے لئے ٹھیک تھا لیکن شاید وہ سانپ زیادہ ہی زہریلہ تھا۔ لڑکے کی تکلیف میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی۔ زہر اس کے جسم میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈنکر نے اسے ٹیکا لگایا لیکن وہ ویسے ہی بے کار تھا۔ سانپ سے بچاؤ کی ویکسین ہوتی ہے اور اسے فریزر میں ٹھنڈا رکھا جاتا ہے۔ جبکہ یہاں اس صحرا کی گرمی میں ڈنکر کی جیب میں موجود سانپ کے زہر کے تریاق کا وہ ٹیکا بے کار تھا اور اس کا کوئی بھی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔

لڑکے کی تکلیف بڑھنی شروع ہو گئی تو اس کی چیخیں دردناک حد تک بڑھ گئیں۔ دونوں ڈنکروں نے مضبوطی سے اسے پکڑا ہوا تھا لیکن وہ ان کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر باقی لڑکے بھی آگے آئے اور

اسے پکڑنے میں مدد کرنے لگے۔آخر جب اس کی چیخیں حد سے بڑھ گئیں تو ایک ڈنکر نے اپنی جیب سے رسی نکالی اور رسی کی مدد سے اس کے ہاتھ پیر باندھنے لگا۔ وہ پروفیشنل تھے۔انہوں نے لڑکے کو اس طریقے سے باندھا کہ وہ بالکل ہی حرکت نہیں کرسکتا تھا۔اس کے بعد ڈنکر نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تا کہ وہ چیخ نہ سکے۔

''ارے! یہ کیا کررہے ہو؟ بجائے اس کی مدد کرنے کے تم تو اسے مار رہے ہو؟'' مجھ سے یہ سب دیکھا نہ گیا تو میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی نہیں،اس کی تکلیف کم کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔'' اس نے نارمل انداز میں کہا۔

''تکلیف کم کرنے کی کوشش؟ تم تو اس کو ماررہے ہو۔۔۔کوئی بھی مدد کرنے کی بجائے تم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے اس ریگستان میں ماررہے ہو۔'' میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ ہم تیرہ لڑکے پاکستانی اور انڈین تھے۔وہ بھی میرے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے۔

''اس کی مدد کرو! یہاں نزدیک ہی کوئی گاؤں وغیرہ ہوگا،تم اسے وہاں تک لے جاسکتے ہو۔'' میں نے اسی لہجے میں چیختے ہوئے کہا۔میرے پیچھے لڑکے آکر کھڑے ہو گئے تھے اس لئے مجھے کچھ حوصلہ ہو گیا تھا۔

''یہاں سے پندرہ کلومیٹر دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔میں راستہ بتادیتا ہوں،تم میں سے جو بھی اس کو لے کر جانا چاہتا ہے وہ لے کر جاسکتا ہے۔ہم دونوں امریکی ہیں اور انسانی سمگلنگ کی سزا دس سال ہے۔وہ بھی ٹھیک ہے کہ میں دس سال کی سزا بھی کاٹ لوں گا لیکن اس کو پندرہ کلومیٹر دور تک اٹھا کر کون لے جائے گا؟ کل سے چل رہے ہیں اور ابھی تیس کلومیٹر سفر کیا ہے۔اس کو اٹھا کر چلیں گے تو دو دن میں بھی اس گاؤں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔جبکہ یہ دو گھنٹے بھی نہیں نکال پائے گا اور اس سے پہلے ہی مرجائے گا۔دس سال کی اٹجنٹی کی سزا ہو گی تو پندرہ سال اس کے بھی لگ جائیں گے۔25 سال۔۔۔لیکن جان تو پھر بھی اس کی نہیں بچ سکے گی۔میرے پاس اور کوئی حل نہیں ہے۔'' اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

میں نے تڑپتے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا۔وہ درد کی اذیت سے تڑپ رہا تھا۔پوری طرح بندھا ہونے کی وجہ سے وہ حرکت نہیں کرسکتا تھا۔وہ چیخ نہیں سکتا تھا لیکن اس کی آنکھیں چیخ رہی تھیں۔درد سے ابل کر باہر کو آرہی تھیں اور مدد کو پکار رہی تھیں،کچھ کہہ رہی تھیں۔مجھ سے برداشت نہ ہوسکا تو میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔اس کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا لیکن اس نے ضبط کیا ہوا تھا۔

اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ میں نے اپنا کان آگے کیا تا کہ اس کے الفاظ سن سکوں۔

''مجھے ماردو!'' ہلکی سی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔ پہلی مرتبہ مجھے سمجھ نہیں آئی تھی اس لئے میں مزید اس کے قریب ہو گیا۔

''یہ درد مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔۔۔ پلیز! مجھے جان سے ماردو۔'' اس بار آواز واضح تھی۔ میں جلدی سے اس سے دور جا کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے جان سے ماردو۔۔۔ یہ درد بہت زیادہ ہے، میں مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس درد سے نجات دے دو۔'' وہ ایک بار پھر چیخنے لگا۔ اس کی چیخیں پورے صحرا میں گونج رہی تھیں۔

''تم ایجنٹ دنیا کے سب سے بے غیرت ترین لوگ ہو۔ پتہ نہیں کتنے نوجوان تم لوگوں نے اس صحرا میں ماردیئے ہیں۔'' ایک سردار سے جب یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا تو اس نے آگے بڑھ کر ایک ڈنکر کا گلا پکڑ لیا۔

''میں تم دونوں کو ہی ادھر ماردوں گا!'' وہ اس کا گلا دبانے لگا۔ دوسرا ڈنکر جلدی سے آگے بڑھ کر اس سے گلا چھڑانے لگا۔ اتنی دیر میں دوسرے لڑکے بھی آگے بڑھ آئے اور انہوں نے جلدی سے ڈنکر کو اس سے چھڑوالیا۔

''تم سب اپنے گھروں سے امریکہ جانے کے لئے نکلے ہو اور میں تم کو امریکہ لے کر جا رہا ہوں۔ گھروں سے نکلنے سے پہلے تم سب کو پتہ تھا کہ یہ سب کچھ رستے میں ہوتا ہے لیکن پھر بھی تم لوگوں نے اس رستے کو چنا ہے، تو اب شور کیوں مچا رہے ہو؟ اس صحرا میں یہ اکیلا ہی نہیں مر رہا ہے بلکہ ہزاروں لڑکے اس صحرا کی ریت میں دفن ہیں۔ ایک مرتا ہے تو یہ سفر رک نہیں جاتا بلکہ مزید دس اور آجاتے ہیں مرنے کے لئے۔۔۔ میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔'' ڈنکر نے چیختے ہوئے کہا۔ سورج کی روشنی پھیل چکی تھی اور خطرہ بڑھ گیا تھا۔

''یار پلیز! کچھ تو کرو اس کے لئے۔۔۔ یہ مر رہا ہے؟'' میں نے اس کے آگے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے پاس کوئی بہتر آئیڈیا ہے؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے پاس کوئی حل نہیں تھا اس لئے میں خاموشی سے ایک جھاڑی میں گھس کر لیٹ گیا۔ دوسرے

لڑکے بھی آہستہ آہستہ اپنی اپنی جھاڑیوں میں جانے لگے اور پھر سارے ہی لڑکے ادھر سے نکل گئے۔ ڈنکروں نے اس لڑکے کو گھسیٹ کر ایک جھاڑی میں لٹایا اور اس کا منہ دوبارہ بند کر دیا۔ لڑکے کی چیخوں کی آواز تو بند ہو گئی تھی لیکن اس کا احساس ابھی تک میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ گرمی کا زور ایک بار پھر شروع ہوا اور سب لڑکوں کو اپنی اپنی فکر لگنے لگی۔ پانی تقریباً سب ہی ختم کر چکے تھے اور ابھی بہت لمبا سفر باقی تھا۔ سارے لڑکے سونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن بھوک اور پیاس لگی ہوئی ہو تو نیند بھی نہیں آتی ہے۔ جیسے تیسے کر کے دن گزارا اور رات کا اندھیرا چھاتے ہی ہم جھاڑیوں سے باہر نکل آئے۔ میں سیدھا اس انڈین لڑکے کو دیکھنے گیا جسے سانپ نے کاٹ لیا تھا، وہ مر چکا تھا۔ پتہ نہیں دن کے کس وقت اس کی جان نکلی ہوگی۔ اندھیرا ہونے کے باوجود مجھے اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا، اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جو امریکہ کا خواب دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لئے ہی بند ہو گئیں تھیں۔

انڈین لڑکے اس کی لاش کو جلانا چاہتے تھے لیکن ادھر صحرا میں سوکھی جھاڑیاں تو بہت تھیں لیکن آگ جلانے کی صورت میں اس کی روشنی بہت دور تک جاتی اور ہم پکڑے جا سکتے تھے۔ ہم ادھر آگ نہیں جلا سکتے تھے۔ ہم نے ہاتھوں کی مدد سے ریت میں ایک چھوٹا سا گڑھا بنایا اور اس کو گڑھے میں ڈال کر اوپر سے ریت ڈال دی۔ سکھ مذہب کے پیروکار اپنے مردوں کو جلاتے ہیں، ہندو اور سکھ دونوں اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن یہاں اس لڑکے کے نصیب میں جلنا بھی نہیں رکھا تھا۔ اسے مسلمانوں کی طرح زمین میں دفن ہونا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ جو گڑھا کھود کر ریت ہم نے اس کے اوپر ڈالی تھی وہ ایک رات بھی نہ نکالتی۔ ایری زونا کے صحرا میں سینکڑوں قسم کے چھوٹے بڑے جنگلی جانور تھے۔ ان جانوروں میں سونگھنے کی بڑی حس ہوتی ہے۔ ہمارے جانے کے ایک گھنٹے بعد ہی وہ ادھر پہنچ جاتے اور اگلے ایک گھنٹے میں اس کی صرف ہڈیاں ہی بچی ہوتیں اور باقی سب کچھ جانور کھا چکے ہوتے۔ یہی پردیس ہے۔

مہاجرین کا درد صرف ایک مہاجر ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اپنے ملک، اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے دور تڑپتے ہوئے جان دینا، اس کا اندازہ امریکہ اور یورپ میں رہنے والوں کو کہاں ہوگا؟ ہمارے حکمرانوں کو کہاں ہوگا جن کے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہوتا ہے اور اپنی عیدیں بھی پاکستان سے باہر مناتے ہیں؟ یہ تکلیف تو صرف ہم لوگ ہی محسوس کر سکتے ہیں جو روٹی کے ایک نوالے کے لئے ایک ملک سے دوسرے ملک کی خاک چھانتے رہتے ہیں۔

ڈنکروں نے ہم سب کو اکٹھا کیا اور ہم ایک بار پھر آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ تیسری رات تھی اور ہماری رفتار بہت سست ہوگئی تھی۔ پانی کی کمی سے ڈی ہائیڈریشن ہونے لگی تھی۔ ہم ایک گھنٹہ چلتے اور پھر تھک کر بیٹھ جاتے۔ ڈنکروں کو بھی اس چیز کا احساس تھا۔ انہیں صحرا میں چلنے کا تجربہ تھا لیکن باقی لڑکے اس چیز کو نہیں جانتے تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ صحرا میں سفر کیسے کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی جیسے تیسے کر کے ہم سفر کر رہے تھے اور آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

صحرا کا حسن اور اس کی طلسماتی کشش بھی اب ڈراؤنی ہونے لگی تھی۔ لڑکے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ جو لڑکا بھی کمزور پڑتا تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ہم حوصلہ دیتے تھے اور آگے اپنے ساتھ چلانے لگتے تھے۔ آنے والا ہر ایک گھنٹہ مشکل سے مشکل تر ہو رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ رات بھی مکمل ہوگئی اور ہم ایک بار پھر دن گزارنے کے لئے کسی محفوظ جگہ کی تلاش کرنے لگے۔ ڈنکر ہم کو لے کر ایک پہاڑی کی کھو میں آگئے۔ یہ کافی بڑی پہاڑی تھی اور اس کا قدرتی طور سے ایسا کٹاؤ بنا ہوا تھا جو اوپر سے سایہ فراہم کرتا تھا۔ ڈنکروں نے ہم سب کو پہاڑی کی کھو میں لٹا دیا اور ہم سب گرنے کے انداز میں لیٹ گئے۔

بھوک اور پیاس سے ہم سب کا برا حال ہو گیا تھا۔ دوپہر تک تو دن آرام سے گزر گیا لیکن اس کے بعد گرمی شروع ہوئی تو لڑکوں نے پیاس سے بلبلانا شروع کر دیا۔ لیکن یہاں پر کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ڈنکر شاید کچھ کر سکتے تھے لیکن وہ بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم بیس لڑکے میکسیکو سے نکلے تھے۔ ایک لڑکا تو بے چارہ اس راستے کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ باقی 19 میں سے بھی مزید پانچ لڑکے پیاس کی شدت سے مرنے کے قریب ہوگئے تھے۔ ڈنکروں کے پاس پانی کی بوتلیں موجود تھیں لیکن وہ بھی رات کو ساری ختم ہوگئیں تھی۔ میرے پاس ابھی تک ایک بوتل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس پورے سفر میں ابھی تک صرف دو بوتلیں ہی پانی کی پی تھیں۔ ان میں سے بھی دوسرے پاکستانی لڑکوں کو تھوڑا تھوڑا پانی دیا تھا۔ تیسری بوتل ابھی تک پڑی ہوئی تھی۔

لڑکوں کی تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی تو انہوں نے ڈنکروں کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ یہاں اس غار میں اب تین گروپ بن گئے تھے۔ پہلے پانچ لڑکے تھے جو پیاس کی شدت سے بے ہوش پڑے سسک رہے تھے۔ انہیں کوئی ہوش نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی سرگرمی میں حصہ لے رہے تھے۔ باقی دو گروپوں میں ایک گروپ ایجنٹوں کو گالیاں دے رہا تھا اور انہیں مارنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرا گروپ ان کو بچانے کی کوشش کر رہا

تھا۔ میں ایک کونے میں ہو کر ان کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ شاید آپ کو تماشے کا لفظ برا لگے لیکن مجھے اس سے اچھا اور کوئی لفظ مل ہی نہیں رہا تھا۔

یہ ہماری بدنصیبی کا تماشہ ہی تو تھا جو دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور کے ریگستان میں پانی کی ایک بوند کے لئے تڑپ رہے تھے؟ دنیا میں امریکہ سے بڑھ کر اور کوئی بھی ملک سپر پاور نہیں تھا لیکن خدا نے ہمیں اس چیز کا احساس دلایا تھا کہ انسان جتنی بھی ترقی کر لے پھر بھی اس خدا سے اوپر نہیں ہوسکتا۔ یہ خدا افریقہ کے گھنے جنگلات میں لاکھوں خوفناک جانوروں کے بیچ میں بھی انسان کو زندہ رکھتا ہے اور جب مارنے پر آ جائے تو امریکہ جیسے ملک میں بھی بھوکا اور پیاسا رکھ کر مار دیتا ہے۔

''سردار جی! ڈنکروں کو چھوڑ دو، ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ راستہ خود ہم نے چنا ہے۔'' میں نے اونچی آواز میں چلّاتے ہوئے کہا تو وہ سردار رک گیا۔ اس نے ڈنکر کا گریبان پکڑا ہوا تھا اور اسے گھونسہ مارنے لگا تھا۔ میری آواز سن کر وہ رک گیا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''او پا جی! تسی ٹھیک ہو۔۔۔ یہ راستہ خود ہم نے چنا ہے لیکن ہمیں صحیح سلامت آگے پہنچانا بھی تو ان کا فرض ہے؟ یہ تو لڑکوں کو رستے میں ہی مار رہے ہیں۔ یہ جو لڑکا ادھر تڑپ رہا ہے، یہ میرے چاچا کا بیٹا ہے۔۔۔ 30 لاکھ روپیہ دے رہے ہیں ایجنٹ کو ایک آدمی کا، ہم دونوں کا 60 لاکھ بنتا ہے۔ اتنا پیسا مرنے کے لیے تو نہیں دے رہے ہیں نا؟ یہ بے غیرت اتنا پیسہ لیتے ہیں تو راستے میں پانی کا انتظام نہیں کر سکتے؟'' اس نے ڈنکر کو چھوڑ دیا اور میری سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ یہ اتنا پیسہ لیتے ہیں تو پانی کا انتظام یا کوئی اور آسان راستہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لڑکے انہی کی غلطی سے مرتے ہیں لیکن اگر آپ ان کو مار دو گے تو پیچھے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ راستہ صرف ان کو معلوم ہے۔ ان کے بغیر ہم سب اس ریگستان میں بھٹک کر مر جائیں گے۔ یہ اگر ہم سے ڈر کر بھاگ گئے تو ہم سب کو منزل تک کون پہنچائے گا؟ پلیز حالات کی نزاکت کو سمجھو! ہمیں ان دونوں کی ضرورت ہے۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ کے کزن کی موت ادھر اس صحرا میں لکھی ہے تو پھر اسے دنیا کی کوئی بھی طاقت نہیں بچا سکتی۔ پلیز یار! ہم سب کی طرف دیکھو، ہمیں ان ڈنکروں کی ضرورت ہے۔ ان کے بغیر ہم سب اس صحرا میں بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔'' میں نے اونچی آواز میں بولتے ہوئے کہا۔

میری بات کی سمجھ سب کو ہی آ گئی اور وہ سارے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے بیگ سے آخری

بوتل نکالی اوران پانچوں لڑکوں کے منہ میں تھوڑا تھوڑا پانی ڈالنے لگا۔ پانی کے دو دو گھونٹوں نے ہی ان لڑکوں میں نئی زندگی ڈال دی اور وہ تھوڑی تھوڑی حرکت کرنے لگے۔ میرے ہاتھ میں پانی کی بوتل دیکھ کر باقی لڑکوں کی بھی پیاس جاگنے لگی اور وہ سب مجھ سے پانی چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے پانی کی بوتل کو اپنی ٹانگوں میں دبایا اوراس کے اوپر بیٹھ گیا۔ تین چار لڑکے مجھ پر جھپٹ پڑے اور وہ مجھ سے بوتل چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔

''پلیز! یہ پانی ان پانچوں لڑکوں کے لئے ہے۔۔۔آپ سب بچ جاؤ گے لیکن پانی کے بغیر یہ پانچوں مرجائیں گے۔ پلیز! یہ پانی ان لڑکوں کے لئے ہے۔'' میں اونچی اونچی آواز میں چیخ رہا تھا۔

میں گھنٹے دو گھنٹے تک دوبارہ ان کو پانی کے دو دو گھونٹ پلاتا تو وہ ٹھیک ہو جاتے، جبکہ وہ لڑکے جو مجھ سے پانی کے حصول کے لئے لڑ رہے تھے ان کے یہ کسی کام نہ آتا، اس لئے میں پانی کو بچانے کی جدو جہد کر رہا تھا۔ دونوں ڈنکر اس لڑائی سے دور کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے، وہ کسی بھی طرف نہیں ہو رہے تھے۔ میں پانی کی بوتل کے ساتھ بالکل چپک گیا، بالکل ایک گیند کی طرح گول ہو گیا تھا۔ جو لڑکوں کے تھپڑ اور لاتوں سے لڑھکتا ضرور تھا لیکن سیدھا نہیں ہو رہا تھا اور وہ جھنجھلاہٹ میں مزید مارنے لگتے۔ 19 لڑکوں میں آدھی پانی کی بوتل تھی جو زندگی تھی اور لڑکے اسی زندگی کے لئے مجھے مار رہے تھے۔

''خدا کے لئے سردار جی! آپ سب کو گرونانک صاحب کی قسم یہ پانی ان پانچوں کی زندگی ہے۔''

ایک زوردار لات میرے پیٹ پر لگی تو میں سیدھا ہو گیا اور بوتل میرے ہاتھوں سے نکل گئی۔ جسے ایک انڈین سردار نے پکڑ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کھولتا میں نے چیختے ہوئے اسے بابا گرونانک کی قسم دے دی۔ (اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کی قسم دینا حرام ہے۔ ہمارا اسلام دنیا کا سب سے بڑا اور آسان ترین مذہب ہے۔ اسلام میں جب کوئی انسان زندگی اور موت کے کنارے پر آجاتا ہے تو جان بچانے کے لئے سبھی حرام چیزیں حلال ہو جاتی ہے۔ اسلام تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ جان بچانے کے لئے کسی بت کو سجدہ بھی کرنا پڑے تو کر دو اور جان بچالو) گرونانک صاحب کا نام اس سردار کے لئے کافی تھا بلکہ اس سردار کے لئے ہی نہیں سبھی کے لئے بہت تھا۔ وہ سارے لڑتے لڑتے رک گئے۔

''واہے گرو جی دا خالصہ واۓ گرو جی کی فتح'' اس نے اونچی آواز میں کہا اور پانی کی بوتل میری طرف بڑھا دی۔

''واہے گرو جی کی فتح سردار جی۔۔۔اب اس بوتل کی حفاظت کی ذمہ داری آپ کی ہے۔گرو نانک صاحب کے سیوک ہو سردار جی جان دے دو گے لیکن اپنے گرو کے نام پر آنچ نہیں آنے دو گے۔ایک گھنٹے تک دوبارہ دو گھونٹ ان لڑکوں کو پھر پلائے گئے تو ان کی جان بچ جائے گی۔'' میں اٹھ کر غار کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا اب اس پانی کو ایک بھی سردار ہاتھ نہیں لگائے گا۔ایک گھنٹہ آرام سے گزر گیا تو میں نے اس سے پانی کی بوتل پکڑی اور دوبارہ باری باری ان لڑکوں کو گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پلانے لگا۔ میں نے ایک ایک کر کے سب لڑکوں کو پانی پلا دیا تو آخر میں بوتل میں تھوڑا سا پانی رہ گیا۔بمشکل دو تین گھونٹ پانی ہو گا۔

''یہ لو سردار جی! یہ پانی آپ کا ہے،اب آپ پی سکتے ہیں۔'' میں نے پانی کی بوتل اسی سردار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں متر جی! یہ پانی ہمارے لئے اب حرام ہے۔۔۔ہم میں سے کوئی بھی یہ پانی نہیں پیئے گا۔آپ نے سردار کو گرو نانک صاحب کا نام لے کر پکارا تھا اب یہ سردار مر تو جائے گا لیکن اپنے گرو کا نام نیچے نہیں آنے دے گا'' اس نے بوتل کو ہاتھ بھی لگانے سے انکار کر دیا۔ میں نے پانی کی بوتل کو واپس اپنے پاس رکھ لیا۔

آدھے گھنٹے تک ان پانچوں لڑکوں میں سے صرف ایک لڑکا ہی لیٹا رہ گیا تھا جبکہ باقی سبھی ٹھیک ہو گئے۔وہ سب پانی کی کمی کی وجہ سے ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو گئے تھے۔آہستہ آہستہ پانی ان کے پیٹ میں گیا تو وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔صرف ایک لڑکا ہی ابھی تک لیٹا ہوا تھا جو بالکل بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔اس بار بھی بے چارہ انڈین سکھ ہی تھا اور پہلے بھی سانپ کے کاٹنے کا شکار سکھ لڑکا ہوا تھا۔اس بار بھی قسمت ان سرداروں کے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔شام تک اس لڑکے میں بالکل ہی جان باقی نہیں رہی تھی۔ صرف اس کی سانس چل رہی تھی باقی ہر قسم کی حرکت ختم ہو گئی تھی۔رات کا اندھیرا پھیلا تو ڈنکر نے لڑکوں کو باہر نکلنے کو کہا۔ہم میں سے کسی کا بھی دل اسے اس صحرا میں چھوڑنے کو نہیں کر رہا تھا لیکن ہم اسے اٹھا کر بھی نہیں لے جا سکتے تھے اور اس کے پاس ادھر بھی نہیں رک سکتے تھے۔اگر ادھر اس کے پاس رک جاتے تو صبح تک مزید دو تین اور لڑکے اس کے ساتھ ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو جاتے۔

''پلیز یار! ان سے کہو نکلتے ہیں،اس بے چارے کی قسمت میں یہیں مرنا لکھا تھا۔'' میرے ساتھ

والے پاکستانی لڑکے نے مجھے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے جو میں ان سے کچھ کہہ سکوں۔ یہ انہی کا فیصلہ ہے اور وہی فیصلہ کریں گے۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ دس منٹ تک آخر انہوں نے فیصلہ کر لیا اور لڑکے کو ادھر ہی غار میں چھوڑ کر باہر آ گئے۔

''مترجی! ان ڈنکروں سے کہو کہ وہ اس کا گلہ دبا کر ماردیں تاکہ ہم اس کو دفن کر کے آگے جائیں۔۔۔ ورنہ اسے جنگلی جانور زندہ ہی چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔'' دن والے اسی سردار نے میرے پاس آکر رکتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز درد سے ڈوبی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

''سردار جی! ہمارا مذہب کسی بھی حالت میں انسانی جان لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ کچھ بھی ہو، کیسے بھی حالات ہوں، انسان آدھا کٹا ہوا درد سے تڑپ رہا ہو اور موت کے چانس سو فیصد ہوں پھر بھی تکلیف سے نجات دلانے کے لئے کسی کو مارنے کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔ سوری یار! یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ خدا نے بچانا ہوگا تو ہمارے بغیر بھی اسے بچالے گا اور اگر یہیں موت لکھی ہے تو پھر تم کیا اور میں کیا۔۔۔ ہمارے کیا حیثیت ہے یار؟'' میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔ دو تین منٹ تک غار کے باہر ہی کھڑے ہونے کے بعد لڑکے آہستہ آہستہ ڈنکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

رات کو بارہ بجے کے قریب ہم ایک چھوٹے سے روڈ پر آ گئے۔ یہاں پر ایک پک اپ پہلے سے ہی کھڑی تھی۔ ڈنکروں نے ہمیں جلدی سے اس پک اپ میں بٹھایا اور دو گھنٹے تک ریگستان میں چلا کر پھر اتار دیا۔ انہوں نے پک اپ سے پانی کی مزید تین تین بوتلیں نکال کر ہمیں دے دیں اور ہم ایک بار پھر آگے پیدل سفر کرنے لگے۔ دو گھنٹے کے پک اپ کے سفر نے ہمیں فونکس (Phoenix) کے کافی قریب کر دیا تھا۔ ایجنٹ نے ہمیں صرف فونکس تک ہی پہنچانا تھا، اس سے آگے ہم نے خود سفر کرنا تھا۔ ایجنٹوں نے انڈیا اور پاکستان سے فونکس تک پہنچانے کا ہی 30 لاکھ روپیہ لیا تھا۔

صبح چھ بجے کے قریب فونکس سے سو کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے گاؤں چوچے (Chichu) پہنچ گئے۔ ڈنکروں نے ہمیں ایک پرانے سے احاطے میں لے جا کر بٹھا دیا اور کسی بھی قسم کے شور سے منع کر دیا۔ اس گاؤں کی ٹوٹل آبادی صرف پانچ سو لوگوں کے قریب تھی اور سبھی لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ہم گاؤں کی بجائے باہر ایک ڈیرے پر ٹھہرے ہوئے تھے جو مین سڑک سے دو کلومیٹر دور تھا۔ گاؤں سے صرف

دس کلومیٹر دور مین ہائی وے تھی۔اس سڑک کا نام انٹرسٹیٹ 10(Interstate 10) تھا اور اس کی لمبائی 3959 کلومیٹر تھی۔ چائنہ کے بارڈر سے لے کر کراچی تک روڈ کی لمبائی 1563 کلومیٹر ہے۔ جب کہ چائنہ کے درہ خنجراب سے نکلنے والی شاہرہ قراقرم (جواب سی پیک(CPEC) کا حصہ بھی ہو گی) درہ خنجراب سے لے کر گوادر کی بندرگاہ تک یہ روڈ 2725 کلومیٹر لمبی ہے اور پاکستانی کی سب سے لمبی سڑک ہے۔جبکہ انٹرسٹیٹ 10 کی لمبائی چار ہزار کلومیٹر کے قریب ہے۔

یہ سڑک امریکہ کی 8 ریاستوں سے گزرتی ہے اور امریکہ کے شمالی سمندر بحرا کاہل کو جنوبی سمندر بحر اوقیانوس سے ملاتی ہے۔ یہ فلوریڈا(Florida) سے شروع ہوتی ہے اور پورے میکسیکو کے بارڈر کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئے کیلیفورنیا(California) پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ایری زونا(Arizona) ریاست کے شہر ٹکسن (Tucson) سے یہ اوپر فونکس جاتی ہے اور پھر میکسیکو کے بارڈر کے ساتھ ساتھ جانے کی بجائے لاس اینجلس چلی جاتی ہے۔جبکہ چوچے گاؤں (جدھر اس وقت ہم چھپے بیٹھے تھے) سے دس کلومیٹر آگے ایک بائی پاس آتا ہے اور ہائے وے 10 تو فونکس جاتی ہے جبکہ ادھر سے ایک اور روڈ ہائے وے 8 نکلتی ہے جو بارڈر کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی سان ڈیاگو چلی جاتی ہے۔

دن کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ ڈنکروں نے ہمیں احاطے میں بٹھایا اور خود واپس چلے گئے۔ یہاں پر ایک امریکی کسان تھا اور یہی ہمارا سیف ہاؤس انچارج تھا۔اس نے ہمیں کھانے کے لئے بریڈ اور جام دیا جسے لے کر ہم آرام سے بیٹھ کر کھانے لگے۔ ہم خطرے کی حدود سے باہر نکل آئے تھے۔ یہاں سے فونکس ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ایجنٹ ہماری پیمنٹ ادھر سے ہی وصول کرتے اور جس جس کی ادائیگی ہو جاتی اسے فونکس پہنچا دیتے۔آدھے گھنٹے بعد ایک سردار ہمارے احاطے میں داخل ہوا۔

''ست سری اکال مترو! ویلکم ٹو امریکہ!'' اس نے آتے ہی مسکراتے ہوئے سب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو ہم سب کھڑے ہوئے اور باری باری اس سے ہاتھ ملانے لگے۔

''اچھا بھائی! سب سے پہلے تو آپ کو بہت بہت بدھایاں ہوں امریکہ آنے کی۔۔۔آپ کے جو دوست راستے میں مر گئے ہیں یا بچھڑ گئے ہیں ان کا مجھے بھی بہت افسوس ہے۔ جان بوجھ کر کوئی بھی بے احتیاطی نہیں کرتا، یہ امریکہ ہے اور اس کے لئے قربانی تو دینی پڑتی ہے۔آج سے بیس سال پہلے جب میں بھی امریکہ آیا تھا تو میرے ساتھ میرا سگا بھائی بارڈر پر گولی لگنے سے مر گیا تھا۔ہم پچاس لڑکے تھے جن میں

سے بارہ لڑکے راستے میں مر گئے تھے اور صرف 38 لڑکے ہی مرتے مرتے یہاں تک پہنچے تھے۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود صرف دو سال بعد ہی میں نے انہی راستوں پر اپنے دو بھائیوں کو بلوا لیا تھا۔ یہ امریکہ چیز ہی ایسی ہے۔ آپ سب نے اس راستے کی تکلیفیں دیکھی ہوئی ہیں لیکن پھر بھی کل کو آپ کے یہی جاننے والے اور رشتے دار اسی راستے پر آ رہے ہونگے۔'' وہ اونچی آواز میں ہم سب سے گفتگو کر رہا تھا۔ واقعی اس کی ساری باتیں ہی ٹھیک تھیں۔ ہم ان راستوں کی تکلیفوں کو جانتے ہوئے بھی اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو بلواتے تھے۔ امریکہ کو ڈھونڈنے کا سفر 1492ء میں کولمبس نے شروع کیا تھا جو آج پانچ سو سال گزر جانے کے بعد بھی جاری تھا۔ امریکہ کو تلاش کرنے کا جنون ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید شدت اختیار کر رہا تھا۔ ہر روز سینکڑوں کی تعداد میں لوگ امریکہ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس امریکہ کو پانے کی جستجو میں لوگ مر رہے تھے لیکن پھر بھی اس کی کشش میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی۔

''اچھا! اب میں آپ سب کی بات آپ کے گھر کرواتا ہوں، آپ بات کر کے رقم ادا کر دیں تاکہ آپ کو آگے فونکس پہنچایا جا سکے۔ جیسے جیسے جس لڑکے کی ادائیگی ہو جائے گی اسے یہاں سے کار کے ذریعے فونکس پہنچا دیا جائے گا۔ اپنے رشتے داروں کو بھی اطلاع کر دو کہ وہ آپ کو فونکس آ کر رسیو کر لیں۔ شہر کے کسی پارک میں آپ کو بٹھا کر آپ کی بات کروا کر ہم واپس آ جائیں اور وہ آپ کو ادھر سے آ کر لے جائے گا۔ ٹھیک ہے! اب جلدی جلدی اپنے گھر والوں سے بات کر کے پیسہ پہنچا دو تاکہ آپ کو ادھر سے روانہ کیا جا سکے۔ یہاں ابھی تک خطرہ موجود ہے اور ہم زیادہ دیر تک آپ کو ادھر نہیں رکھ سکتے۔ اگر خدانخواستہ ادھر پولیس کا چھاپہ پڑ گیا تو سارے کے سارے واپس ڈی پورٹ ہو جاؤ گے اور ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ اس لئے مہربانی کرو اور جلدی سے رقم کی ادائیگی کروا دو۔'' اس نے ایک لڑکے کو موبائل پکڑایا اور اس کی بات کروانے لگا۔ وہ لڑکوں کو زیادہ تفصیل سے بات نہیں کرنے دے رہا تھا۔ صرف مطلب کی بات اور بس وہ زیادہ سے زیادہ دو منٹ کی بات کرواتا تھا۔ لڑکے ایک ایک کر کے بات کرنے لگے۔

''تم میں سے پاکستانی لڑکا کونسا ہے، جس کی گارنٹی جرمنی سے ہوئی ہے؟ وہ ادھر ہی ادائیگی کرے گا۔'' ایجنٹ نے اونچی آواز میں کہا تو میں جلدی سے آگے بڑھا اور اس کے سامنے چلا گیا۔

''جی پاجی! میں ہوں۔ میری ادائیگی ادھر ہی ہوگی، آپ میری بات کروا دیں۔ میری دوست ادھر فونکس میں ہی رکی ہوئی ہے۔ آپ ابھی جا کر اس سے پیسے لے سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے! ایک منٹ ٹھہرو، میں تمہاری بات کرواتا ہوں۔'' اس نے موبائل پکڑا اور مجھ سے نمبر پوچھ کر ڈائل کرنے لگا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے آواز آئی تو اس نے موبائل مجھے پکڑا دیا۔

''ایسگارڈ! میں ادھر پہنچ گیا ہوں۔'' میں نے مختصراً اس سے بات کرتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے یار! تم خیریت سے پہنچ گئے ہو، مجھے تمہاری بہت فکر ہو رہی تھی۔'' دوسری طرف سے اس کی جذبات میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''تم اس وقت کہاں ہو اور پیسے بھی ان کو دینے ہیں؟'' میں نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ ایجنٹ میری بات سن کر مسکرانے لگا۔ فون کا سپیکر آن تھا اور وہ ایسگارڈ کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ بات کو لمبا کر رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ فون پر زیادہ بات کرنا مناسب نہیں ہے۔

''سوری! میں اس وقت فونکس میں ہوں، مونٹری (Montwrey) میں ایک ہوٹل میں رکی ہوئی ہوں۔ پیسے میرے پاس ہی پڑے ہوئے ہیں۔۔۔ جدھر تم بولتے ہو میں ادھر جا کر دے آتی ہوں۔'' میں ایجنٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

''میڈیم! آپ دس منٹ انتظار کریں میں دوبارہ فون کر کے بتاتا ہوں۔'' اس نے ایسگارڈ سے کہا اور دوسری طرف سے جواب سن کر فون بند کر دیا۔ اب وہ ایک اور نمبر ملا کر دوسری طرف بات کرنے لگا۔

''جی پا جی! جرمنی والے لڑکے کا کیا کرنا ہے؟ یہ دستی (By Hand) پیسے دینا چاہتے ہیں۔ آپ جرمنی کے گارنٹر (گارنٹی دینے والا خلیل بھائی کے ساتھ کام کرنے والا انڈین لڑکا، اسی نے میرے پیسوں کی گارنٹی دی تھی) سے بات کر لیں۔۔۔ کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟ میں اس لڑکی پر اعتبار کر سکتا ہوں؟'' ایجنٹ ڈائریکٹ ایسگارڈ سے پیسے لینے سے ڈر رہا تھا کیونکہ خفیہ پولیس انسانی سمگلروں کو پکڑنے کے لئے نت نئے جال بچھاتی رہتی تھی۔

''ٹھیک ہے! میں ایک بار جرمنی فون کر لیتا ہوں۔ انڈیا میں اس کے گاؤں کا بھی مجھے پتہ ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر بھی رسک لینے کی بجائے میں ایک بار پھر بات کرتا ہوں اور مطمئن ہونے کے بعد ہی تمہیں ادھر بھیجوں گا۔ ورنہ پیسے ہم کسی اور طریقے سے وصول کر لیں گے۔'' اس نے دوسری طرف کی بات سنی اور فون بند کر دیا۔ دوسرے انڈین لڑکے ایک بار پھر اپنے اپنے گھروں میں فون کر کے پیسوں کا بولنے

لگے۔تقریباًدس منٹ بعداس کے موبائل پرکال آئی تواس نے کال اٹینڈ کرلی۔

''جی پاجی! کیابناہے؟'' اس نے فون اٹھاتے ہی کہا۔

''ہاں! میری بات ہوگئی ہے،کوئی پرابلم نہیں ہے۔اس لڑکے کا کزن ادھرجرمنی میں ہردیال کے ساتھ ہی کام کرتا ہے۔ یہ دونوں ادھر جرمنی سے ہی آئے ہیں اورلڑکی دوسال سے اس لڑکے کے ساتھ ہے۔کوئی چکرنہیں ہے،تم پیسے لے سکتے ہو۔باقی جیسے تمہاری مرضی !اگرتم مطمئن نہیں ہوتو میں کوئی اور بندوبست کرلیتا ہوں اوراس کوبھی ادھرچھوڑآؤں گا؟'' دوتین منٹ تک وہ دوسری طرف کی بات سنتارہااور پھرفون بند کردیا۔

سارے ہی لڑکوں کی بات ان کے گھروالوں سے ہوچکی تھی۔جنوبی امریکہ سے سات لڑکوں کی بھی بات اس نے کروادی تھی۔مزید آدھے گھنٹے تک وہ لڑکوں کے ساتھ ادھرہی بیٹھارہا۔اس کے بعداس نے مجھے اپنے ساتھ لیااورکارمیں بٹھاکراحاطے سے باہرآگیا۔میں نے اپنے چہرے کوپانی سے اچھی طرح دھولیا تھا۔کپڑے بہت گندے ہوگئے تھےلیکن اس کاکوئی بھی حل میرے پاس نہیں تھااس لئے خاموشی سے کارمیں بیٹھ گیا۔اس نے کارآگے بڑھائی اورسنگل سڑک پرآہستہ آہستہ کارچلاتا ہواوہ پندرہ منٹ میں بائی پاس پر آگیا۔اس نے کارہائی وے 10 پرچڑھائی اورکارکی سپیڈ 120 ہوگئی،اگلے 40 منٹ میں ہم فونکس پہنچ گئے۔شہرکی ایک کالونی براڈوے کےقریب اس نے کارہائی وے سے نیچےاتارلی۔

روڈ سے نیچے اترتے ہی سینٹرل ایونیو(Central EVenew)کے اوپرہی ایک بہت بڑی لائبریری تھی،اس نے کارلائبریری کی پارکنگ میں روکی اورمجھے لےکرلائبریری کے اندرچلاگیا۔میں نے پاکستان میں بہت سی لائبریریاں دیکھی تھیں۔خودہمارے شہربہاولپورکی لائبریری پاکستان کی دوسری بڑی لائبریری ہےلیکن یہ لائبریری اس سے کہیں بڑی اورکشادہ تھی۔ یہاں دس لاکھ سےزیادہ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔دولاکھ اسی ہزارسکیئر فٹ رقبے پرپھیلی ہوئی اس عمارت کے پانچ فلورتھے۔یہاں پڑھنے کے لئے اوربزنس میٹنگ کرنے کے لئے حال موجودتھے۔ایجنٹ نے مجھے ایک ہال میں بٹھایااورخودباہرنکل گیا۔میں نے ایک انگلش کتاب اٹھائی اوراسے پڑھ کرٹائم گزارنے لگا۔

مجھے اب ایسگارڈ کاانتظارتھاتاکہ وہ میرے پیسے دےکرادھرآکرمجھے لے جاتی۔ایجنٹ باہرنکلااور اس نے ایسگارڈکوفون کرکے پیسے برٹن لائبریری آجانے کاکہا۔یہاں سے مونٹیری صرف دوکلومیٹردورتھی۔

ایسگارڈ کو ٹیکسی پکڑ کر آنے میں دو منٹ ہی لگتے۔ ایسگارڈ نے پیسے پکڑنے اور باہر نکل کر ٹیکسی کر کے لائبریری پہنچنے میں صرف پانچ منٹ ہی لگائے۔ وہ لائبریری کے باہر ہی کھڑی ہو کر انتظار کرنے لگی۔ ایجنٹ نے اسے ادھر ہی کھڑے ہونے کا کہا تھا۔ وہ کار میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ ایسگارڈ کے نزدیک اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کار سے باہر نکلا اور سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں لوگ آ جا رہے تھے۔ اس نے دوبارہ اسے فون کیا اور ٹیکسی پکڑ کر گالف کورس جانے کا کہا اور خود آگے جا کر ایک سٹاپ پر کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔

ایسگارڈ لائبریری کے احاطے سے باہر نکل کر روڈ پر آئی اور ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی۔ یہ بڑی سڑک تھی اور یہاں ٹیکسیاں آ جا رہی تھیں۔ اس نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور اس کے اندر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی اس کے پاس سے گزری تو اس نے بھی ایک ٹیکسی کی اور اس کے پیچھے پیچھے گالف کلب جانے لگا۔ دس منٹ تک ٹیکسی چلنے کے بعد اس نے ادھر ہی ایسگارڈ کو اتر جانے کا کہا تو وہ ادھر ہی اتر گئی۔ ایجنٹ نے ٹیکسی ڈرائیور کو ٹیکسی ایسگارڈ کے قریب روکنے کا کہا اور جب ٹیکسی اس کے قریب جا کر رک گئی تو اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا۔

''اندر آ جاؤ!'' اس نے ایسگارڈ کو ٹیکسی کے اندر آنے کے لئے کہا تو وہ اندر آ گئی۔

''کدھر جا رہی ہو؟'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔

''گالف کلب جا رہی تھی، آپ نے فون کیا تھا؟'' اس نے آگے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور ان سے بے نیاز ٹیکسی چلا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! مجھے ادھر ہی اتار دو اور تم واپس لائبریری آ جاؤ۔'' اس نے ٹیکسی رکوائی اور ادھر ہی اتر کر روڈ کی دوسری طرف آ کر ٹیکسی دیکھنے لگا۔

وہ محتاط نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اگر کوئی پولیس والا اس کے پیچھے ہوتا تو پکا اسی وقت پکڑ لیتے۔ اسی سے بچنے کے لئے اس نے پیسے ایسگارڈ سے نہیں لیے تھے۔ اگر پولیس والے اسے پکڑ بھی لیتے تو تب بھی اس سے پیسے برآمد نہ ہوتے۔ بغیر پیسوں کے اس پر کوئی بھی کیس ثابت نہیں ہوتا تھا۔ ایسگارڈ اس سے کافی دور آگے جا کر اتر گئی تھی، اس نے روڈ کراس کیا اور دوسری طرف جا کر واپسی کی ٹیکسی پکڑ لی جبکہ ایجنٹ ادھر ہی کھڑا ایسگارڈ کی ٹیکسی کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ نزدیک آئی تو اس نے ہاتھ دے کر ٹیکسی کو روکا اور دوبارہ ایسگارڈ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہے! اب میں مطمئن ہوں۔۔۔ پیسے دے دو آپ۔'' اس نے سرگوشی سے ایسگارڈ سے کہا تو

اس نے ایک پلاسٹک بیگ اس کے حوالے کر دیا۔

بیگ میں سوسو اور پانچ سو کے نوٹ تھے۔ ایجنٹ نے ایک نظر نوٹوں پر ڈالی اور ٹیکسی سے باہر آ گیا جبکہ ایسگارڈ لائبریری کی طرف جانے لگی۔ وہ اب لائبریری پہنچ کر ایجنٹ کے فون کا انتظار کرتی۔ ایجنٹ روڈ سے اترا اور ایک کالونی کی گلی میں داخل ہو گیا جہاں پہلے ہی سے اس کا ایک دوست گاڑی لیے کھڑا تھا۔ اس نے اسے بٹھایا اور گاڑی فونکس کی گلیوں میں غائب ہو گئی۔ ایسگارڈ لائبریری کے باہر کھڑی ہو کر فون کا انتظار کرنے لگی جبکہ میں اندر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایجنٹ کا فون آ گیا اور اس نے ایسگارڈ کو میرے لائبریری کے اندر ہونے کے اطلاع دے دی۔

ایسگارڈ تقریباً بھاگتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی اور مجھے سامنے بیٹھا دیکھ کر وہ لپک کر میری طرف بڑھنے لگی۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے بازو پھیلائے تو وہ میرے گلے لگ کر رونے لگی۔ اس بار اس کے رونے نے مجھے بھی رلا دیا تھا۔ میں امریکہ پہنچ چکا تھا۔ گیارہ سال میں نے اس ملک کی چاہت میں تڑپ تڑپ کر گزارے تھے۔ پتہ نہیں کتنے لوگوں کو راستے میں بچھڑتے اور مرتے دیکھا تھا۔ ایک ایک پل ایک ایک لمحہ میں نے ایمان کے اس ملک کی تلاش میں گن گن کر گزارا تھا۔ پاکستان سے لے کر امریکہ تک میں نے درجنوں ملکوں کی خاک چھانی تھی۔ ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اس جنت میں پہنچ چکا تھا۔ یہ زمین پر بنائی ہوئی خدا کی جنت ہی تو تھی جس کی خواہش ایمان کے دل میں تھی۔ میں نے آج ایمان کے خواب کو پورا کر دیا تھا۔ بس اب نیویارک میں کھڑے آزادی کے اس عظیم الشان مجسمے کا دیدار کرنا تھا، اس کے قدموں میں جا کر سر رکھنا تھا اور ایمان کے ملن کی دعا کرنا تھی۔ ایمان کو بھی اس مجسمے سے ملانا تھا، پھر چاہے ایمان کو وہاں تک لاتا یا پھر اس مجسمے کو ہی اکھاڑ کر کراچی لے جاتا۔

یہ محبت کی طاقت تھی اور اس محبت کے آگے آج تک کوئی بھی نہیں ٹھہر سکا۔ بڑے بڑے کوہ ہمالیہ اور سمندر بھی اس محبت کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں۔ محبت تو مجھے بھی تھی ایمان سے اور اس محبت کے آگے میں نے اس مجسمے کو بھی جھکانا تھا۔ ایک محبت کی تلاش میں میں نکلا تھا اور ایک محبت میرے گلے سے لپٹی ہوئی تھی۔ محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ کچھ محبتیں ہمیں ساری زندگی کی عبادت اور ریاضت کرنے کے بعد بھی نہیں ملتیں اور کچھ محبتیں بن مانگے ہی ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ایسگارڈ بہت پیاری تھی، بہت خوبصورت تھی۔ اگر ایمان میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تو ایسگارڈ ہی میری کل کائنات ہوتی۔

''راضی! دیکھ لو، آخر تمہاری قسمت تمہیں امریکہ لے ہی آئی۔'' ایسگارڈ کو تھوڑا سکون ملا تو وہ مجھ سے کہنے لگی۔

''ہاں ایسگارڈ! آخر آج میں امریکہ پہنچ ہی گیا۔ گھر سے پانچ سو روپیہ لے کر نکلا تھا، لوگ پاگل کہتے تھے مجھے، پانچ ڈالر میں امریکہ کے خواب دیکھتا تھا لیکن یہ میری ایمان کا خواب تھا۔ ایمان کی دعا تھی کہ ایک دن میں امریکہ پہنچ جاؤں گا اور دیکھ لو! آج میں امریکہ میں کھڑا ہوں۔ یہ سب کچھ اتنا آسان نہ ہوتا اگر تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتی۔ تمہاری محبت اور تمہاری لگن ہی مجھے امریکہ تک کھینچ کے لائی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان شاید ساری زندگی بھی نہ اتار سکوں۔'' میں نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں! محبت کرنے والے کسی پر احسان نہیں کرتے، تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔ پھر چاہے یہ خوشی ایمان کے ساتھ ہو یا کسی اور کے ساتھ کیا فرق پڑتا ہے؟'' وہ واپس مڑی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لائبریری سے باہر نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔

اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور ہم دونوں ہوٹل میں آ گئے۔ کپڑے اور جوتے اس نے پہلے ہی مارکیٹ سے خرید لیے تھے۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلے تو اس نے پرانے کپڑوں اور جوتوں کو جواب تقریباً پھٹ چکے تھے باہر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

''یار! یہاں سے نیویارک کی ٹرین کی ٹکٹ لے لو، ہم آج رات ہی ادھر سے نکل چلتے ہیں۔'' میں نے صوفے پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں راضی! یہاں سے پہلے مونٹانہ جائیں گے، پھر میرے شہر۔۔۔ اور وہاں سے ہم دونوں شادی کریں گے۔ ایک مہینہ لگ جائے گا شادی کے بعد ویزہ آتے آتے۔۔۔ اس کے بعد دونوں نیویارک چلے جائیں گے۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسگارڈ! مجھے پہلے نیویارک جانا ہے۔۔۔ میں نے بہت لمبا عرصہ انتظار کیا ہے، اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار! جہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا سا اور کر لو؟ صرف ایک مہینے کی ہی تو بات ہے۔'' وہ مجھے سمجھانے لگی۔

''نہیں ایسگارڈ! میں نے تم سے شادی نہیں کرنی ہے۔ میں تم سے شادی صرف اس وجہ سے ہی کر رہا تھا تاکہ یہاں تک پہنچ سکوں۔ اب جب میں امریکہ پہنچ گیا ہوں تو پھر اب تم سے شادی کرنے کا کوئی مقصد نہیں رہا۔ میں کیوں شادی کر کے تمہاری زندگی خراب کروں؟'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''راضی! فونکس سے آگے ڈی پورٹیشن کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہاں سے آگے کہیں بھی پکڑے گئے تو بھی کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔ تمہیں آسانی سے امریکہ میں پناہ مل جائے گی لیکن اس پناہ کے چکر میں تمہاری ساری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ مہاجر کا ٹھپہ جب تمہارے ماتھے پر لگے گا تو پھر ساری زندگی گرین کارڈ کے لئے ترستے رہو گے لیکن گرین کارڈ پھر بھی نہیں ملے گا۔ بعد میں شادی بھی کر لو گے تو پھر بھی گرین گارڈ ملتے ملتے چار یا پانچ سال لگ جاتے ہیں۔ ایک بار مہاجر بن گئے تو پھر دوبارہ لیگل ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میرے ساتھ موٹانہ چلو! ایک مہینے کے اندر اندر ڈائریکٹ ویزہ مل جائے گا۔ میری وکیل سے بات ہوئی ہے، وہ ایک مہینے کے اندر اندر پانچ سال کا ویزہ لے کر دے دے گا۔ بعد میں تم امریکن شہریت (امریکن پاسپورٹ) کے لئے بھی اپلائی کر سکتے ہو۔ میرے پاس دو ہزار ایکڑ زمین ہے، اگر دس ایکڑ بھی تمہارے نام لگا دوں گی تو چھ مہینے کے اندر اندر تم امریکی شہری بن جاؤ گے۔'' وہ بھی اٹھ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''راضی! زندگی برباد ہونے کی بات کرتے ہو۔۔۔ زندگی میں جینے کا مزا تو اب آ رہا ہے۔ پچھلے چوبیس سال تو ایسے ہی ضائع کیے ہیں۔ میں کوئی پاکستانی دیہاتی عورت نہیں ہوں جہاں طلاق کو عورت کے لیے موت سمجھا جاتا ہے اور ایک شادی شدہ عورت ساری زندگی اپنے شوہر کی جوتیاں کھاتی رہتی ہے۔ یہ امریکہ ہے اور یہاں اگر طلاق کے بعد مرد کو کوئی فرق نہیں پڑتا تو عورت کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زندگی اور جوانی ایک بار ہی ملتی ہے، اگر ساتھ چلنے میں مزا نہ آئے تو راستے بدل لینا ہی بہتر ہے۔ پھر چاہے وہ راستے ایک بار ہوں یا دس بار۔۔۔ مقصد آپ کی خوشی اور آپ کی راحت ہے، جہاں ملے وہی منزل ہے۔ راضی! جب آپ امتحان میں فیل ہو جاتے ہو تو دوسری بار، تیسری بار تک امتحان دیتے ہو جب تک پاس نہیں ہو جاتے۔ عورت کمپرومائز کرتی ہے لیکن مرد کے جوتے اور گالیاں کھانا، بغیر محبت کے کمپرومائز نہیں بلکہ بزدلی ہوتا ہے۔'' وہ باہر کی طرف جانے لگی تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔

''ایسگارڈ!'' میں اگلے کئی لمحوں تک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، میرے پاس بولنے کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ ایک عجیب سا نشہ تھا اس کی آنکھوں میں، بے اختیار ڈوب

جانے کو دل کر رہا تھا۔

''ایسگارڈ یار! تم سے محبت سی ہونے لگی ہے۔ خدا نے اگر اس دنیا میں دو جنم بنائے ہوتے تو دوسرا جنم تیری آنکھوں میں ڈوب کر گزار دیتا۔'' میں نے اس کا بازو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں میں اس کے چہرے کو تھام کر نزدیک کیا اور اس کے ہونٹوں کی سرخی کو اپنے ہونٹوں پر لگانے لگا۔

سرخ ہونٹوں کی مٹھاس میرے دل میں اترنے لگی تو میں مدہوش ہونے لگا۔ لمحے ایک ایک کر کے گزرنے لگے لیکن ہم دونوں کو ہی ان کا کوئی احساس ہی نہ تھا۔ شاید کچھ پل یا کچھ صدیاں ایک ایک کر کے گزر رہی تھیں۔ ایسگارڈ کے گلابی ہونٹ سمندر تھے اور میں صحرا بن گیا تھا۔ ایسا صحرا جو پورا سمندر پی کر بھی سیراب نہیں ہوتا۔ میری پیاس بھی مزید بڑھ رہی تھی۔

''راضی! جنت میں حوریں بہت ہوتی ہیں۔'' اچانک ایمان کا کراچی میں کہا ہوا جملہ میرے ذہن میں گونجا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور ایسگارڈ کے ہونٹ میرے ہونٹوں سے الگ ہو گئے۔

''سوری یار! میں بہک گیا تھا۔'' مجھے ایسگارڈ سے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ میں واپس پلٹنے لگا تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔

''راضی! میں نے محبت اس جنم میں کی ہے تو صلہ بھی مجھے اسی جنم میں چاہیے اور میرا یقین ہے کہ مجھے میرے حصے کی محبت ملے گی۔'' اس نے میرا بازو چھوڑا اور باہر نکل گئی۔

ایک گھنٹے تک اس کی واپسی ہوئی تو اس کے پاس ٹرین کی ٹکٹیں موجود تھیں۔ ہم نے جلدی سے ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا اور ہوٹل سے باہر آ گئے۔ فونکس سے مونٹانہ ایسگارڈ کا گاؤں دو ہزار کلومیٹر دور تھا۔ ڈائریکٹ اپنی گاڑی سے یہ سفر 18 گھنٹے کا تھا۔ یہاں سے سیدھی کوئی بھی ٹرین مونٹانہ نہیں جاتی تھی۔ ہم نے یہاں سے پہلے لاس ویگاس کے لئے ٹرین پکڑی۔ فونکس سے ٹرین پہلے گرینڈ کینن جاتی تھی اور پھر ادھر سے لاس ویگاس۔۔۔ گرینڈ کینن کا تذکرہ میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ ہم نے یہاں سے ٹرین تبدیل کی اور لاس ویگاس پہنچ گئے۔

لاس ویگاس امریکی ریاست نیواڈا کا مرکزی شہر ہے۔ ویگاس کو کسینو اور انٹرنیٹ کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس شہر میں کبھی بھی رات نہیں ہوتی۔ چھ لاکھ پچاس ہزار کی آبادی والا یہ شہر کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ چھ بجے کے قریب ہم لاس ویگاس پہنچ گئے۔ سوا چھ بجے ہمیں اگلی وین مل گئی جو امریکی ریاست یوٹاہ

(Utah) کے دارالحکومت سالٹ لیک سٹی جا رہی تھی۔ ہم اس ٹرین میں بیٹھ گئے۔ ویگاس سے لیک سٹی 677 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم سوا چھ بجے ویگاس سے نکلے اور رات کے دو بجے یوٹاہ کے دارالحکومت پہنچ گئے۔ لاس ویگاس نیواڈا ریاست کا آخری جنوبی شہر تھا۔ ویگاس سے ستر کلومیٹر دور امریکی ریاست کیلیفورنیا شروع ہو جاتی تھی اور ویگاس سے کیلیفورنیا کا شہر لاس اینجلس 435 کلومیٹر جبکہ سان فرانسسکو 916 کلومیٹر دور تھا۔

رات کے دو بجے ہم سالٹ لیک سٹی پہنچ چکے تھے۔ اس شہر کی آبادی 12 لاکھ کے قریب ہے۔ یہ شہر گریٹ سالٹ لیک عظیم نمکین جھیل کے کنارے پر واقع ہے اور اسی کی نسبت سے اس شہر کا نام بھی سالٹ لیک سٹی ہے۔ یہ دنیا کی آٹھویں بڑی نمکین جھیل ہے۔ ابھی رات کے دو بج گئے تھے اور ہمیں کوئی بھی بس یا ٹرین نہیں مل رہی تھی۔ ایک بس صبح چھ بجے نکلنی تھی جو میسولہ (Missoula) تک جاتی تھی۔ ہم صبح چھ بجے وہ بس پکڑ لیتے اور راستے میں بٹے (Butte) اتر جاتے۔ بٹھے سے پھر آگے ہمیں دن کو کوئی بھی ٹرین آگے گریٹ فالز تک لے جاتی۔ ابھی ہمارے پاس چار گھنٹے تھے، میرے پاس چونکہ کوئی بھی کاغذ وغیرہ نہیں تھے اس لئے اسٹیشن پر بیٹھنا خطرناک تھا۔ ہم دونوں جلدی سے اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ پولیس اسٹیشن کے اندر بھی موجود تھی اور باہر بھی لیکن کسی بھی پولیس والے نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا۔

پولیس والے کبھی بھی لڑکا اور لڑکی اکٹھے جا رہے ہوں تو نہیں روکتے، یہ لوگ جوڑوں کو تنگ نہیں کرتے۔ مجرمانہ کاروائی ہمیشہ اکیلا مرد یا عورت یا پھر گروپ کرتا ہے۔ یہ سو فیصد تو نہیں ہے لیکن بحرحال اس میں کچھ حقیقت ہے۔ سٹیشن سے باہر سڑک کی دوسری طرف ایک ہوٹل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ہم نے سڑک کراس کی اور دوسری طرف ہوٹل میں آ گئے۔ سامنے کاؤنٹر پر ایک خوبصورت سی نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

''خوش آمدید! ہمارے ہوٹل میں۔۔۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟'' اس نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہمیں ایک رات کے لئے کمرہ کرائے پر چاہیے۔'' ایسگارڈ بھی جواباً مسکرا دی۔

''اوہ میم سوری! ہمارے پاس کوئی بھی سنگل کمرہ خالی نہیں ہے، صرف فیملی روم خالی ہے۔ سوری! آپ پہلے بکنگ کروا دیتیں تو ہم کوئی ارینج کروا دیتے۔'' ہمیں انکار کرتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر ابھی تک مسکراہٹ تھی۔

یہ ہوٹل والوں کی چالاکی ہوتی ہے۔آپ رات کو دس بجے کے بعد کسی بھی ہوٹل میں چلے جائیں یہ آپ کو کبھی بھی سنگل کمرہ نہیں دیں گے۔ان کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ آپ کو ڈبل یا فیملی روم دیں، یہی بزنس ہے۔ ریسیپشن پر کھڑا ہوا آدمی یا عورت آپ کو دیکھتے ہی پہچان جاتا ہے کہ آپ ضرورت مند ہو اور وہ آپ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

''ٹھیک ہے! آپ فیملی روم ہی دے دیں، ہماری صبح چھ بجے کی بس ہے اور ہم صبح پانچ بجے تک نکل جائیں گے۔'' ایسگارڈ نے اسے اپنا پاسپورٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔

کاؤنٹر والی لڑکی نے ایسگارڈ سے پاسپورٹ لیا اور اس کا نام اور پتہ لکھ کر ہمیں پیسے بتائے تو ایسگارڈ نے ادائیگی کر دی۔ یورپ اور امریکہ میں جتنے بھی ہوٹل اسٹیشن کے باہر ہوتے ہیں وہاں ایک رات کے لئے کمرہ لو تو اس کی ادائیگی پہلے ہی کرنی پڑتی ہے۔ جاتے ہوئے کوئی چیک آؤٹ نہیں ہوتا۔ کمرہ دوپہر کو تین بجے سے اگلے دن تین بجے تک ہوتا ہے۔اگر آپ دن کو دس بجے کمرہ کرائے پر لیں گے تو صبح دس سے اگلے دن دس بجے تک دو دن کا کرایہ بن جائے گا۔ساری ادائیگی پہلے ہی کی جاتی ہے اور جاتے ہوئے صرف کاؤنٹر پر بتا دیا جاتا ہے۔

ہم نے کمرے کی چابی لی اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر فلور پر آ گئے۔ ہمارا کمرا پہلے ہی فلور پر تھا۔ ہمارے پاس تین گھنٹے کا وقت تھے اس لئے سونے کی بجائے صوفے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ یہاں ایک کمرے کے اندر دو چھوٹے سنگل بیڈ تھے جو ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔انگلش میں اسے ڈبل ڈیکر کہتے ہیں۔آرمی یا پولیس اکیڈمیوں میں ایسے ہی لوہے کے بیڈ ہوتے ہیں۔ یہ بچوں کے لئے تھے جبکہ ایک بڑا ڈبل بیڈ بڑوں کے لئے تھا۔کافی کھلا کمرہ تھا۔ایک سائیڈ پر ٹیبل اور چار کرسیاں لگی ہوئی تھیں، یہ ڈائننگ ٹیبل تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں صوفہ لگا ہوا تھا جس کے آگے ٹی وی اور سی ڈی پڑا ہوا تھا۔ایسے کمرے کا ایک رات کا کرایہ ہم نے 250 ڈالر دیا تھا۔ویسے نارمل عام روٹین میں کمرہ 100 ڈالر سے نیچے نیچے مل جاتا ہے۔کمرے میں بالکونی بھی تھی جہاں باہر بھی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ہم دونوں باہر تازی ہوا میں جا کر بیٹھ گئے۔

''راضی! ایمان کے سوا کبھی کسی اور سے محبت نہیں ہوئی تم کو؟'' اس نے سامنے شہر کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! میں چودہ سال کا تھا جب پہلی بار ایمان سے محبت ہوئی تھی۔ ہاں! ایمان سے پہلے دو سال تک محبت کے لئے اچھی سی لڑکی تلاش کرتا رہا تھا لیکن اچھی کیا بری بھی نہیں ملی۔ کسی نے مجھے گھاس تک نہیں ڈالی، دو سال تک میں لڑکیوں کا پیچھا کرتا رہا تھا۔ کبھی اس محلے کبھی اس محلے لیکن بہر حال کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ میرا ایک دوست تھا وحید، اس نے بھی مجھے دو تین لڑکیوں سے ملوایا لیکن ہر جگہ سے مسترد ہوا ہوں یار!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کاش! میں ہی اس وقت تمہارے آس پاس کہیں ہوتی۔۔۔'' اس نے ایک بھرپور سرد آہ بھری۔

''راضی! کاش خدا امریکہ کی بجائے مجھے پاکستان میں پیدا کر دیتا تمہارے گاؤں میں، تو زندگی کتنی اچھی اور آسان ہو جاتی؟''

''نہیں ایسگارڈ! زندگی اتنی بھی آسان نہ ہوتی جتنی تم سمجھ رہی ہو۔ ہم پاکستانی اتنے بھی اچھے نہیں ہیں۔ دنیا کی ہر چیز معاف کر دیتے ہیں لیکن ایک عورت کی غلطی معاف نہیں کرتے۔ کیسا معاشرہ ہے ہمارا۔۔۔ ہم کسی اور کی بہن یا بیٹی کو پھنسانے کے لئے مہینوں اس کا پیچھا کرتے ہیں لیکن جب ہماری بہن کسی اور کے ساتھ پکڑی جاتی ہے تو اس کا گلا گھونٹ کر مار دیتے ہیں۔ شکر کرو! تم پاکستانی نہیں ہو، ورنہ یہ جو محبت تم مجھ سے کر رہی ہو اس کی پاداش میں کب کی مر چکی ہوتی۔ ہم بہت برے ہیں۔ ایمان نے اسی معاشرے سے بغاوت کی تھی اور اس کی سزا ہم آج بھی بھگت رہے ہیں۔'' ہم دونوں کو باتیں کرتے کرتے صبح ہو گئی۔ ٹھیک پانچ بجے ہم دونوں ہوٹل سے باہر آ گئے۔

اسٹیشن پر پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے ناشتہ کیا اور کافی پی کر ٹکٹ کاؤنٹر پر پہنچے۔ وہاں سے بٹے کے لئے ٹکٹ خرید کر بس میں بیٹھ گئے۔ بس کو ابھی پندرہ منٹ رہتے تھے لیکن ہم نے باہر کھڑے ہونے کی بجائے بس میں بیٹھنا مناسب سمجھا۔ سالٹ لیک سٹی سے بٹے 670 کلومیٹر دور تھا۔ بس کو وہاں پہنچنے میں چھ گھنٹے لگتے تھے۔ ٹھیک چھ بجے بس سالٹ لیک سٹی سے نکلی اور تقریباً چالیس منٹ میں اوڈن پہنچ گئی۔ ایک لاکھ کی آبادی والا یہ شہر بھی سالٹ لیک کے کنارے پر ہے۔ یہ لیک سٹی سے 55 کلومیٹر جب کہ جھیل سے 13 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں بس نے صرف پانچ منٹ کے لیے سٹاپ کیا اور آگے روانہ ہو گئی۔

ہماری اگلی منزل اڑھائی گھنٹے بعد ڈاہو فالز تھی۔ ڈاہو فالز امریکہ کی ریاست اڈاہو کا شہر ہے۔ اس شہر کی آبادی 60 ہزار کے قریب ہے۔ اڈاہو سٹیٹ کی ٹوٹل آبادی 17 لاکھ ہے اور آبادی کے لحاظ سے یہ امریکہ کی

39 ویں بڑی ریاست ہے۔ یہاں بھی بس پانچ سات منٹ ہی رکی اور اسی ہائی وے 15 پر چلتی ہوئی شہر سے باہر آ گئی۔ ہائے وے 15 امریکہ کی چند بڑی ہائی ویز میں سے ایک ہے۔ یہ امریکی ریاست کیلیفورنیا کے شہر سان ڈیاگو سے نکلتی ہے (یہ شہر میکسیکو بارڈر پر موجود ہے اور یہ سڑک میکسیکو کے بارڈر سے شروع ہوتی ہے) اور امریکہ کی چھ ریاستوں سے ہوتی ہوئی کینیڈا چلی جاتی ہے۔ ہم اسی ہائے وے پر چلتے ہوئے ٹھیک 12 بجے دن کو بٹے پہنچ گئے۔ یہاں سے بس ہائی وے 90 پر چلی گئی جو آگے سیٹل تک جاتی تھی۔ ہماری مطلوبہ بس بٹے تک ہی تھی۔ بٹے سے آگے ہم نے گریٹ فالز تک جانا تھا۔ یہاں سے ایک ٹرین ہیلینا جاتی تھی۔ ہم نے ٹرین پکڑی اور ہیلنا آ گئے۔

ہیلینا امریکی ریاست مونٹانہ کا دارالخلافہ ہے۔ اس شہر کی آبادی 32 ہزار ہے۔ شاید آپ لوگ 32 ہزار کی آبادی والے شہر کو امریکی ریاست کا دارالخلافہ پڑھ کر حیران رہ گئے ہوں۔ تو جناب! جس ریاست کا یہ دارالخلافہ ہے، اس ریاست کی کل آبادی صرف دس لاکھ ہے۔ جی ہاں! 3 لاکھ اسی ہزار مربع کلومیٹر کے رقبے والی اس ریاست کی کل آبادی صرف دس لاکھ ہے۔ جبکہ صرف ہمارے شہر بہاولپور کی آبادی دس لاکھ ہے۔ لاہور، کراچی اور راولپنڈی وغیرہ کو تو آپ بھول جائیں، جن کی آبادی کروڑوں میں ہے۔

پاکستان سے رقبے کے لحاظ سے آدھی اس ریاست کی آبادی صرف دس لاکھ ہے اور اس کے 52 شہر ہیں۔ اس کے صرف ایک شہر بیلنگر کی آبادی ایک لاکھ ہے جبکہ باقی سبھی شہر پچاس ہزار سے بھی نیچے ہیں۔ امریکہ اسی وجہ سے امریکہ ہے۔ 9898 لاکھ مربع کلومیٹر رقبہ اور آبادی 33 کروڑ جبکہ ہم پاکستان والے آٹھ لاکھ مربع کلومیٹر کا رقبہ ہے اور آبادی 21 کروڑ سے تجاوز کر گئی ہے۔ جس تیزی سے ہماری آبادی بڑھ رہی ہے اگلے دس سال میں ہم امریکہ کے برابر چلے جائیں گے۔ چلو کسی بات پر تو امریکہ سے آگے نکلیں گے! ہیلینا سے آگے گریٹ فالز تک ہم نے جانا تھا لیکن ایسگارڈ ادھر ہی رک گئی۔ ہم دونوں نے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا اور ادھر ہی رک گئے۔

''کیا ہوا ایسگارڈ؟ ہم نے تو آگے نہیں جانا تھا، ابھی ادھر کیوں رک گئے ہیں؟'' میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں یار! پہلے میں نے سوچا تھا کہ گھر چلتے ہیں۔۔۔ دو تین دن ادھر رکیں گے اس کے بعد پھر شادی کے لئے آ جائیں گے۔ شادی کے لئے ہیلینا ہی آنا پڑتا تھا۔ ابھی سوچا ہے کہ گھر جانے کا کوئی فائدہ

نہیں ہے۔ جب تک شادی نہیں ہو جاتی تب تک خطرہ ہی رہے گا۔اس لئے پہلے شادی کر لیتے ہیں اس کے بعد باقی سب کام ہونگے۔ میں گھر فون کر کے ابو امی کو بھی بلا لیتی ہوں۔'' اس نے فون پکڑا اور اپنے گھر فون کرنے لگی۔تقریباً دس منٹ تک فون کرنے کے بعد وہ باہر چلی گئی۔ وہ ہوٹل میں باقی کمرے بک کروانے گئی تھی۔تھوڑی دیر تک اس کی واپسی ہوئی تو میرا سوالیہ چہرہ دیکھ کر مسکرا دی۔

''یار! پریشان کیوں لگ رہے ہو؟ صرف شادی ہو رہی ہے،تمہاری کوئی عزت نہیں لوٹی جا رہی۔امی ابو دونوں آرہے ہیں اور ان کے ساتھ ہمارے وکیل بھی آرہے ہیں۔تمہارا پاسپورٹ اور دوسری ساری چیزیں میرے پاس موجود ہیں۔اگر کل کو ہمیں کورٹ میں ٹائم مل گیا تو کام جلدی شروع ہو جائے گا۔میں ان کے لئے کمرے بک کروانے گئی تھی۔'' وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔

''اوہ! تمہارے ممی پاپا آرہے ہیں تو میں ایک بار نہا کر تیار ہو جاتا ہوں؟'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''رہنے دو یار! تم کوئی لڑکی تھوڑی ہو جو میرے ممی پاپا تمہیں دیکھ کر پسند کرنے آرہے ہیں؟ لڑکے ایسے ہی اچھے لگتے ہیں اور تم میری پسند ہو، میرے ماں باپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! ویسے بھی سفر سے آئے ہیں، ایک بار نہا کر فریش ہو جاتے ہیں۔ پھر رات کو گپ شپ لگاتے رہیں گے۔'' میں دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''واقعی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ایک بار نہا کر فریش ہو جاتے ہیں، اکٹھے ہی نہانا ہے یا مجھے پہلے باری دو گے؟'' اس نے شرارت سے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''آجاؤ! کوئی بات نہیں ہے، اکٹھے نہا لیتے ہیں۔تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے اب مجھے تم سے ڈر نہیں لگتا۔ مجھے تم پر پورا اعتماد ہو گیا ہے۔'' میں نے بھی جواباً اسے آنکھ مار دی۔

میں اور ایسگارڈ پہلے دن سے ہی اکٹھے سو رہے تھے۔ہم بالکل دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے چمٹ کر سوتے تھے بلکہ ایسگارڈ تو تقریباً میرے اوپر ہی سوتی تھی لیکن کبھی بھی نہ اس کے دل میں کوئی غلط خیال آیا تھا اور نہ ہی میرے دل میں۔ دو سال پہلے یونان میں بھی اس کے ساتھ سوتا تھا اور پھر جرمنی ، اٹلی اور ڈنمارک یہاں بھی ہم اکٹھے ہی سوتے تھے۔ہم دونوں کو ایک دوسرے کی عادت سی ہو گئی تھی اور اکیلے نیند بھی نہیں آتی تھی۔انسان کو اشرف المخلوقات اسی لیے تو کہا جاتا ہے۔ یہ جب شیطانیت پر آتا ہے تو اپنی سگی بیٹوں

کو بھی نہیں چھوڑتا، زمین اس کے قہر سے کانپنے لگتی ہے۔ جب پارسائی پر آتا ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی عیاشی کو بھی ٹھوکر مار دیتا ہے۔

خدا نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے۔ یہ موم کی طرح نرم بھی ہوتا ہے اور پتھر کی طرح سخت بھی۔۔۔ آپ افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والے کسی جنگلی انسان کو دیکھ لیں۔ اسے کپڑے پہننے کا بھی پتہ نہیں ہوتا جبکہ اس کے مقابلے میں بل گیٹس کو بھی دیکھ لیں۔ جس کی سوچ پوری دنیا کے کمپیوٹروں میں پھیلی ہوئی ہے۔ زیرو سے سو فیصد ذہانت صرف انسانوں میں ہی پائی جاتی ہے۔

''کیا سوچنے لگے ہو یار! ڈرو مت، میں بعد میں نہا لیتی ہوں تم پہلے نہا لو!'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! تم پہلے نہا لو۔ نہا کر جب تک تم تیار ہو گی تب تک میں بھی نہا چکا ہوں گا۔'' میں واپس بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''عورتوں کو عزت دینی چاہیے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا! چلو شکر ہے تم بھی عزت دینے لگے ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی۔

وہ نہا کر باہر نکلی تو میں اندر گھس گیا۔ میں نے جلدی جلدی شیو کی، نہا کر دوسرے کپڑے پہنے اور باہر آ گیا۔ تب تک ایسگارڈ بھی کپڑے پہن کر تیار ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ ویسے ہی بہت سفید تھا (انگریز سارے ہی سفید ہوتے ہیں) اسے کسی میک اپ کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف ہلکی سی سرخ لپ سٹک لگائی ہوتی تو بالکل ایسے لگتا جیسے بہاریں پھول برسا رہی ہوں۔ شاید اسے پتہ چل گیا تھا کہ مجھے سرخ ہونٹ بہت پیارے لگتے ہیں۔ وہ میری کمزوری جان گئی تھی اسی لئے اس نے ہونٹوں کو سرخ کر لیا تھا۔ میں ٹکٹکی باندھے اس کے ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو راضی؟'' وہ اٹھ کر میرے مقابل کھڑی ہو گئی۔

''کچھ نہیں یار! زندگی دیکھ رہا ہوں۔ خدا کی بنائی ہوئی خوبصورتی کو اپنی آنکھوں میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یار! تم بہت خوبصورت ہو۔ سب سے خوبصورت، شاید میری ایمان سے بھی زیادہ یا اس سے تھوڑی کم۔۔۔'' اس کے سرخ ہونٹوں میں زندگی تھی اور میں زندگی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ اس زندگی کو

اپنے اندر اتارنا چاہتا تھا لیکن اتار نہیں سکتا تھا۔ ایمان کی محبت مجھے زندگی اور خوشیوں سے دور رکھتی تھی۔ میری خوشی ہی ایمان تھی اور اس کے بغیر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''راضی! محبت اتنی کمزور نہیں ہے جو اتنی جلدی ہار جائے۔ ہم امریکہ والے ہیں ۔۔۔ ہماری محبت، نفرت اور دشمنی سبھی میں شدت ہوتی ہے۔'' اس نے میرا چہرا اوپر کیا اور میرے گالوں کو چومنے لگی۔

''اتنا تو ہمارا بھی حق بنتا ہے یار! ویسے قسم سے آج بڑے پیارے لگ رہے ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میرے برابر بیٹھ گئی۔

ہیلینا سے گریٹ فالز 150 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ایسگارڈ کے والدین شام کو ہی آئے۔ ان کے ساتھ ایک وکیل بھی تھا۔ ایسگارڈ کی والدہ کا نام امیلیا تھا اور وہ 45 سال کی عورت تھی جو بالکل ایسگارڈ ہی کی طرح خوبصورت تھیں۔ جبکہ والد کا نام کارٹر Carter تھا اور وہ امیلیا سے دو سال بڑے یعنی 47 سال کے تھے۔ لمبا چہرہ، سفید رنگت اور سنہری بال دونوں میاں بیوی بہت خوبصورت جوڑی تھے۔ ہمارے وکیل کا نام لوگان تھا اور وہ 60 سے اوپر تھے۔ ایسگارڈ نے اپنے والدین کے لئے فیملی روم لیا تھا اور ہم سب ان کے کمرے میں ہی جا کر بیٹھ گئے۔ میں ایسگارڈ کے والد کارٹر کے پاس بیٹھ گیا۔

''راضی! پاکستان سے ہو نا؟'' انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔

''جی جی! میں پاکستان سے ہوں، آپ نے نام تو سنا ہوگا پاکستان کا؟''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں یار! میں اور امیلیا انڈیا بھی گئے تھے، دو مہینے کا ہمارا ہنی مون تھا اور ہم یورپ، ترکی، دوبئی اور پھر انڈیا گئے تھے۔ وہاں سے نیپال، چائنہ اور جاپان سے ہو کر آئے تھے۔ مشرقی سمت سے گئے اور مغربی سمت سے واپس آئے تھے۔ پوری دنیا کا ایک گول چکر لگایا لیکن پاکستان نہیں جا سکے۔'' انہوں نے ایسگارڈ کی امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں ماضی کے اس خوبصورت ہنی مون کے سفر کو یاد کر کے مسکرا دیئے تھے۔

''انکل! انڈیا میں آپ کہاں کہاں رہے ہیں؟'' میں نے گفتگو میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ممبئ، دہلی، ہماچل، اتر پردیش، اور راجستھان بھی دیکھا تھا۔'' انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میں پاکستانی راجھستان سے ہوں ۔۔۔ آپ انڈین راجھستان میں کہاں کہاں گئے تھے؟

''جے پور اور پھر اس سے آگے جیسل میر گئے تھے۔ جیسل میر کا قلعہ بہت خوبصورت تھا۔ وہ بہت بڑا

قلعہ تھا اور شہر میں جو جھیل ہے اس کے اندر بھی ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ کیوں امیلیا جیسل میر تو یاد ہے نا؟''
انہوں نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

''ہاں! ہاں! کیوں نہیں، مجھے تو وہاں کی اونٹ کی سواری بہت پسند آئی۔'' ایسگارڈ کی ممی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ! جیسل میر سے صرف 80 کلومیٹر دور بارڈر ہے اور بارڈر کی دوسری طرف 70 کلومیٹر دور ہمارا گاؤں ہے۔ ہم جیسل میر سے صرف 150 کلومیٹر دور ہیں۔ وہی راجھستان، وہی ریت کے بڑے بڑے ٹیلے اور اس پر چلتے ہوئے اونٹ۔۔۔ سب کچھ وہی ہے۔ صرف درمیان میں کھینچی ہوئی اس چھوٹی سی لکیر نے ہم کو جدا کر دیا ہے۔ ہماری عورتیں بھی ویسے ہی گھاگھرے اور چولی پہنتی ہیں اور پانی کے لئے دور دور کے تالابوں کا رخ کرتی ہیں۔'' میں ان کو بتاتے بتاتے خود کھونے لگا۔

میرا بہاولپور ایسا ہی تھا۔ روہی (Rohi) کے رنگ بارڈر کے دونوں طرف تھے۔ شاید کسی دن یہ نا ختم ہونے والی (انڈیا، پاکستان) جنگ ختم ہو جائے اور ہم ان لکیروں کو کراس کر کے ایک دوسرے کے ملک جا سکیں۔ جیسل میر کے اس قلعے کو دیکھنے کی مسرت بارڈر کے اس طرف ہے تو ہمارے قلعہ دراوڑ کو دیکھنے کی تمنا جیسل میر والوں کو بھی ہے۔

''اچھا! واقعی راجھستان بہت پسند آیا تھا، وہاں کا لباس بھی بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ ہمارے پاس زمینوں پر سارے ہی پاکستانی اور انڈین لڑکے کام کرتے ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھوں بہت کپڑے منگوائے ہیں۔ تم گھر آؤ گے تو میں تمہیں دکھاؤں گی۔'' انہوں نے پر خلوص لہجے میں کہا۔

''جی آنٹی! مجھے خوشی ہوگی۔۔۔ آپ کے راجھستانی کپڑے دیکھ کر اور اگر کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہو گی تو مجھے بتا دیجئے گا، میں بہاولپور سے منگوا دوں گا۔ ہمارے ڈیزائننگ کپڑے انڈین کپڑوں سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔'' یہ واقعی حقیقت تھی، پاکستان کپڑوں کی فیشن انڈسٹری میں انڈیا سے کہیں آگے تھا۔ یہ اور بات تھی کہ یورپ اور امریکہ میں انڈیا ہی کی مارکیٹ ویلیو تھی اور پاکستانی کپڑوں پر انڈیا کے مشہور فیشن برانڈ کی مہر لگا کر بیچا جاتا تھا۔

''اچھا! ابواب آپ یہ باتیں چھوڑو اور شادی کا پوچھنے دو۔'' ایسگارڈ نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا اور وہ وکیل کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وکیل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولنے لگا۔

''سب سے پہلے میں کل مقامی کورٹ سے شادی کے لئے تاریخ لے لوں گا۔آپ دونوں کے سارے کاغذات میں نے دیکھ لئے ہیں، سب پورے ہیں۔ڈنمارک کی میرج بک بھی آپ کے پاس ہے اور کسی پیسہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں زیادہ رش نہیں ہوتا، اسی ہفتے کے اندر اندر ہمیں تاریخ مل جائے گی اور آرام سے شادی ہو جائے گی۔اس کے بعد ڈی پورٹ یا مہاجر والا سارا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔اسی دن ہمیں کورٹ سے ایک پیپر مل جائے گا اور اس کے بعد یہ پورے مونٹانہ سٹیٹ میں کہیں بھی جا سکتا ہے۔اس پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔صرف مونٹانہ سے باہر نہیں جا سکتا۔ چونکہ اس کے پاس امریکہ کا ویزہ نہیں ہے اس لئے اسے پہلے گرین کارڈ ملے گا اور پھر پانچ سال کا ویزہ۔۔۔اس کے بعد یہ آزاد ہے۔امریکہ کا پانچ سال کا ویزہ ہے۔ پاکستان جائے، واپس آئے، ادھر امریکہ میں کاروبار کرے یا جائیدار خریدے سب کچھ قانونی ہے اور یہ کر سکتا ہے۔ امریکن پاسپورٹ کے لئے پانچ سال کے بعد اپلائی کر سکتا ہے اور اگر پانچ سال تک آپ دونوں ایک ساتھ اکٹھے رہتے ہیں تو اسے امریکی شہریت بھی مل جائے گی۔اس کے بعد دونوں طلاق بھی لے لیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ امریکی شہری بن چکا ہوگا۔اس کے بعد یہ دوسری شادی پاکستان میں کر کے لڑکی کو ادھر منگوا سکتا ہے۔ پاکستان میں شادی کر کے لڑکی بآسانی امریکہ آسکتی ہے لیکن لڑکے کے لیے تھوڑی مشکل ہو جاتی ہے۔امریکی ایمبیسی لڑکے کو ویزہ دینے سے پہلے بہت انکوائری کرتی ہے اور ویزہ ملتے ملتے دو تین سال لگ جاتے ہیں جبکہ لڑکی کو زیادہ سے زیادہ تین مہینے میں ویزہ مل جاتا ہے۔

''ابھی ہم دونوں شادی کرتے ہیں تو گرین گارڈ اور پھر ویزہ کب تک ملے گا؟'' ایسگارڈ وکیل سے پوچھنے لگی۔

''گرین کارڈ ملتے ملتے تقریباً چھ مہینے لگ جاتے ہیں اور پھر ویزے میں دو سال۔۔۔امریکی ویزہ لینا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔جبکہ میرا اور ایسگارڈ کا منہ بن گیا۔(گرین کارڈ کو شاید کچھ لوگ امریکی پاسپورٹ سمجھ رہے ہوں۔نہیں! یہ امیگرینٹس کو دیا جاتا ہے جس کے تحت امریکہ میں رہنے اور کام کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔گرین کارڈ ویزہ ہی ہوتا ہے۔ باقی یہ ساری معلومات فکشن ہیں۔ اگر آپ امریکہ جانا چاہتے ہیں یا امریکہ میں شادی کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے کسی اچھے وکیل سے رابطہ کریں۔ یہ کتاب صرف ایک رومانٹک فکشن ہے اور امریکی امیگریشن کے قوانین صرف کتاب کی کہانی کو بنانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔)

''وکیل صاحب! یہ کیا بات ہوئی؟ دو سال تک یہ ادھر ہی بندھا رہے گا۔۔۔ جلدی ویزے کے لئے کوئی اور بھی تو حل ہو گا ناں؟ اسے پاکستان واپس جانا ہے۔'' ایسگارڈ نے میری طرف دیکھتے ہوئے وکیل سے کہا۔

''نہیں! کوئی حل نہیں ہے۔ امریکہ ڈونلڈ ٹرمپ کے آنے سے کافی سخت ہو گیا ہے۔ امیگریشن ڈیپارٹمنٹ والے جان بوجھ کر لیٹ کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں ہر نیا مسلمان جو امریکہ میں داخل ہوتا ہے وہ دہشت گرد ہے۔ ٹرمپ نے اس ملک کو مسلمانوں کے لئے کافی مشکل بنا دیا ہے۔'' وکیل نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ عیسائی ہوتا تو یہی کام دو مہینے میں ہو جاتا، میں اسے دو مہینے میں پانچ سال کا ویزہ لگوا کر دے دیتا۔'' اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''انکل! یہ عیسائی کیسے ہو سکتا ہے، یہ تو مسلمان ہے۔ کوئی ایسے تھوڑی اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے؟'' ایسگارڈ نے قدرے غصے سے کہا۔ اسے وکیل کی بات سن کر غصہ آ گیا تھا۔

''سوری! اگر میری کسی بات پر آپ کو ٹھیس پہنچی ہو، میں صرف حقیقت بیان کر رہا ہوں۔'' وکیل نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں عیسائی بننے کے لئے تیار ہوں۔۔۔ آپ مجھے کسی بھی چرچ میں لے جائیں، میں پادری کے سامنے عیسائیت قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' میں نے ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے گویا دھماکہ کر دیا۔

''کیا۔۔۔؟ راضی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم کیسے عیسائی ہو سکتے ہو؟ صرف امریکہ کے ویزے کے لئے، صرف ایمان کی محبت کے لئے تم اپنا مذہب ہی تبدیل کر لو گے؟'' ایسگارڈ نے حیرانگی سے پوچھا۔ وہ چاروں ہی میری طرف حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔

''جی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھے عیسائیت قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''راضی! ایسگارڈ، ہماری بیٹی تم سے محبت کرتی ہے اور یہ اس کی زندگی ہے۔ وہ جس کے ساتھ رہنا چاہے ہم سب اس کی خوشی میں خوش ہیں۔ اس کی خوشی اور اس کی محبت کی ہم دونوں ماں باپ عزت کرتے

ہیں اور تمہاری بھی عزت کرتے ہیں۔ ایسگارڈ نے ہمیں تمہاری پوری کہانی سنائی ہے، تم ایمان سے محبت کرتے ہو اور اس کی خاطر امریکہ آنا چاہتے تھے۔ ہم تمہاری محبت کی بھی قدر کرتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ تم ہمیشہ ہماری بیٹی کے ساتھ رہو۔ اتنا پیسہ اور تعلیم ہونے کے باوجود تم نے ایسگارڈ کو ٹھکرا دیا۔ جو شخص اتنی محبت کرتا ہے اس میں کچھ تو خاص ہوگا۔ میں دل سے تمہیں اپنا داماد ماننے لگا تھا۔ شاید ہماری ایسگارڈ کی محبت تمہیں پگھلا دے اور تم اس سے محبت کرنے لگو۔ محبت صرف ایک بار ہی نہیں ہوتی بلکہ دوسری بار بھی ہو جاتی ہے۔ وہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن تمہاری عیسائی بننے والی بات نے مجھے دکھ پہنچایا ہے۔ ایک چھوٹے سے ویزے کی خاطر تم کیسے اپنا مذہب چھوڑ سکتے ہو؟'' سبھی لوگ میرے طرف دیکھ رہے تھے۔ ایسگارڈ کے والد نے واقعی ٹھیک بات کی تھی۔ ایک چھوٹے سے ویزے کی خاطر کوئی اتنی جلدی اپنا مذہب نہیں چھوڑتا۔ ویسے بھی وہ ویزا مجھے اسلام میں رہتے ہوئے بھی دو سال بعد مل جاتا۔

''انکل! بات وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں اسلام کو نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔ اس اسلام کی خاطر تو سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں، امریکہ اور اس کا ویزہ کیا چیز ہے۔ آپ مجھے امریکہ کا صدر بھی بنا دو تو میں تب بھی اسلام اور اسلام کی محبت نہیں چھوڑوں گا۔ جہاں تک عیسائی بننے کی بات ہے تو عیسائی بننے کے لئے کیا چاہیے ہوتا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا نبی ماننا اور بس! اگر میں اس چیز پر ایمان لاتا ہوں تو عیسائی ہوں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا نبی مانتے ہیں اس لئے وہ عیسائی ہیں جبکہ مسلمان حضرت محمد ﷺ کو خدا کا نبی مانتے ہیں اس لئے ہم مسلمان ہیں۔ ہم مسلمان تو دونوں کو ہی نبی مانتے ہیں بلکہ ہم تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اپنا نبی مانتے ہیں۔ صرف آپ لوگ ہمارے نبی کو نہیں مانتے۔ ایک مسلمان بیک وقت مسلمان بھی ہوتا ہے، عیسائی بھی اور یہودی بھی کیونکہ ہم ان تینوں کو ہی اپنا نبی مانتے ہیں اور یہی ہمارے مذہب کے سچے ہونے کی علامت ہے۔ ہم سارے نبیوں کو اپنا نبی مانتے ہیں۔ جہاں تک کاغذات کا تعلق ہے تو میں جب پاسپورٹ مل جائے گا تو پھر واپس کاغذات پر مسلمان لکھوا لوں گا۔ آخر مذہب تبدیل کرنا امریکہ میں کوئی جرم تو نہیں ہے؟'' میں نے تفصیل سے اسلام کا تعارف کروایا تو وہ سارے مطمئن ہو گئے۔

''کیوں پاپا! راضی کی بات دل کو لگی یا اوپر سے گزر گئی؟'' ایسگارڈ نے مسکراتے ہوئے اپنے پاپا سے پوچھا۔

''نہیں بیٹا! سمجھ بھی آئی اور دل کو بھی لگی۔۔۔ واقعی ان کا مذہب سچا ہے جو سب نبیوں کو مانتا ہے۔ ہم

عیسائی ہی ہیں جوان کے نبی کونہیں مانتے۔ میرا دل کہتا ہے ان کے مذہب کا مطالعہ تو کروں، یہ واقعی سچ کہہ رہا ہے۔ اسلام ہماری نبی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتا ہے؟''

''انکل آپ ہمارے قرآن پاک کا مطالعہ کریں۔ اس میں سب سے زیادہ ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہی آیا ہے۔ ہم تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زمین پر آنے کا انتظار بھی کر رہے ہیں کیونکہ ہماری کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے۔'' میں نے ان کی دلچسپی دیکھی تو انہیں مزید تفصیل بتانے لگا۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مزید اسلامی کتابوں کا مطالعہ کریں گے۔

میں صرف کاغذوں پر ہی عیسائی بنا اور پھر پاسپورٹ ملنے کے بعد ایسگارڈ اور اس کے ماں باپ ہم چاروں ہی اکٹھے مسلمان ہو گئے۔ ایسگارڈ کے گاؤں میں اسلام کی شمع روشن ہو گئی تھی اور اس کی روشنی آہستہ آہستہ گاؤں کے دوسرے لوگوں تک بھی پہنچنے لگی تھی۔ جس سے باقی لوگ بھی اسلام قبول کرنے لگے تھے۔ مجھے عیسائی بننے کے لئے کسی چرچ میں جانے کی ضرورت پیش نہ آئی بلکہ وکیل نے خود ہی ایک پادری سے رابطہ کر کے اس سے میرے کاغذات بنوا دیئے اور تین دن بعد ہماری باقاعدہ شادی ہو گئی۔

دو بجے کے قریب ہم کورٹ سے شادی کر کے باہر نکلے اور ہیلینا سے پہلے گریٹ فالز اور پھر گریٹ فالز سے واوگن پہنچ گئے۔ یہ گریٹ فالز سے 24 کلومیٹر دور ایک چھوٹی سی کاؤنٹی ہے۔ اصل میں یہ گریٹ فالز کا ہی حصہ ہے۔ شہر سے باہر یہ بہت خوبصورت سی کاؤنٹی ہے جس کی آبادی ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ یہ کاؤنٹی مونٹانہ کے دارالحکومت ہیلینا سے 130 کلومیٹر جبکہ کینڈہ کے بارڈر سے 170 کلومیٹر دور ہے۔ یہ کینڈہ کے مشہور شہر کیلگری سے 450 کلومیٹر دور ہے۔ جو کینڈہ کے صوبے البیرٹا Alberta میں واقع ہے۔

واوگن کاؤنٹی کا نام روبرٹ واوگن کے نام سے ہے جو ایک ویلش مہاجر Welsh Immigrant تھا۔ وہ 1865ء کے قریب ادھر آیا تھا۔ واوگن بہت خوبصورت سا گاؤں تھا۔ ایک منزلہ لیکن بڑے بڑے مکان جن کے آگے چھوٹے چھوٹے گھاس کے قطعہ اراضی اور سوئمنگ پول تھے۔ یہ گاؤں ہائی وے 15 کے اوپر ہی واقع تھا۔ گاؤں کے باہر ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جسے سن ریور Sun River کہتے ہیں۔ یہ دریا آگے جا کر میسوری دریا MIssouri RIver سے جا ملتا ہے۔ 3767

کلومیٹر لمبا یہ دریا امریکہ کا سب سے لمبا دریا ہے جو ہمارے گاؤں واوگن سے صرف 20 کلومیٹر دور گریٹ فالز سٹی سے گزرتا ہے۔ میسوری دریا روکی مانٹین سے نکلتا ہے اور مس سپ دریا Mississippi River میں جا گرتا ہے۔

ہم سب شام کو پانچ بجے کے قریب واوگن پہنچ گئے تھے۔ ایسگارڈ کا گھر گاؤں کے اندر تقریبا چار کنال پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ ڈبل سٹوری گھر تھا۔ گھر کی بیک سائیڈ پر تقریبا 20 کے قریب زیتون کے درخت تھے۔ جبکہ سامنے، دائیں طرف اور پیچھے تین گھاس کے گراونڈ بھی تھے۔ مین گیٹ کے ساتھ ہی ایک تین کمروں کا گھر تھا جس میں گھر کے نوکر رہتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک بڑا کمرہ تھا جس میں پانی کے لئے ایک بڑی موٹر لگی ہوئی تھی۔ یہ سارا آٹو میٹک سسٹم تھا۔ یہاں سے پانی کی سات لائینیں نکلتی تھیں جو آگے گھاس کے پلاٹ اوران کے ساتھ ملحقہ پھولوں کی کیاریوں، پیچھے زیتون کے درخت اور چھوٹے سے سبزی فارم (جس میں ٹماٹر، مرچ توریاں اور تقریبا ساری ہی موسمی سبزیاں اگائی جاتی تھیں) کو سیراب کرتی تھیں۔ ان کو بایو BIO سبزیاں بولا جاتا ہے۔ یہ ہر قسم کی کھاد اور سپرے کے بغیر اگائی جاتی ہیں۔

گھر کے اندر پانچ ملازم کام کرتے تھے جن میں سے تین لڑکے اور دو عورتیں تھیں۔ لڑکے تو رات کو ادھر ہی سو جاتے تھے جبکہ دونوں عورتیں صبح کے ٹائم آتی تھیں اور رات کو کام کر کے واپس چلی جاتی تھیں۔ زمین ان کی 30 کلومیٹر آگے سیمز Simms گاؤں کے پاس تھی۔ سن ریور کا صرف نام ہی دریا تھا لیکن وہ ایک بڑی نہر کے برابر تھا۔ ایسگارڈ کے والد کی زمین سمز گاؤں سے شروع ہوتی تھی اور دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے آگوسٹا تک چلی جاتی تھیں۔ ان کی دو ہزار کی بجائے 2275 ایکٹرز زمین تھی جو اکٹھی نہیں تھی بلکہ بڑے بڑے پلاٹوں کی صورت میں تھی۔ جو سمز اور آگوسٹا کے درمیان میں تھی۔

امریکہ میں بھی زرعی زمین کی پیمائش ایکڑوں کے حساب سے ہی ہوتی ہیں۔ زمین کی پیمائش کا سارا نظام انگلینڈ کا ہی بنایا ہوا ہے اور انگلینڈ سے ہی آگے یہ پاکستان اور امریکہ میں رائج ہوا۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں البتہ زمین کی پیمائش کا دوسرا پیمانہ ہے۔ امریکہ کا ایک ایکڑ پاکستانی ایکڑ سے تھوڑا سا زیادہ ہوتا ہے۔ ایسگارڈ کا والد کارٹر زیادہ تر ان زمینوں پر گندم، مکئی اور جانوروں کے لئے چارہ بیجتا تھا۔ یہ موٹی فصلیں تھیں اور ان کے لئے زیادہ ملازموں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ سارا کام مشینری سے ہو جاتا تھا۔ ان فصلوں کے علاوہ وہ سبزی بھی بیچتے تھے اور انہوں نے گائے اور بھیڑوں کے فارم بھی بنائے ہوئے تھے۔

اصل میں وہ زمیندار تھے اور انہیں ان چیزوں کے بغیر سکون ہی نہیں ملتا تھا۔ گندم اور مکئی نہ اگانے والے کو تو وہ زمیندار ہی نہیں مانتے تھے۔ سمز گاؤں کے باہر ان کا بہت بڑا فارم تھا۔ ابھی کافی دن بڑا ہوا تھا، شام نہیں ہوئی تھی اس لئے ہم سامان گھر میں رکھتے ہی فارم پر آ گئے۔ فارم کو ہماری پنجابی زبان میں ڈیرہ کہا جاتا ہے اس لئے میں بھی اسے ڈیرہ ہی لکھوں گا۔ ڈیرہ واوگن سے صرف 20 منٹ کے فاصلے پر تھا۔ یہ ڈیرہ کم از کم بھی ایک مربع (25 ایکڑ) کے اندر بنا ہوا تھا۔ تین اطراف میں جالی لگا کر اسے کھیتوں سے الگ کیا گیا تھا جبکہ سامنے والا حصہ خالی تھا۔ یہ مین روڈ سے تھوڑا ہٹ کر تقریبا 200 میٹر آگے جا کر بنایا گیا تھا۔ مین روڈ سے ایک چھوٹی سڑک نکلتی تھی جو سیدھی ڈیرے تک جاتی تھی۔ یہ پرائیویٹ سڑک تھی جو چھوٹے سپرے چھڑکنے والے جہاز کے چڑھنے اور اترنے کے کام بھی آتی تھی۔

شاید آپ لوگ حیران ہوں کہ اتنا چھوٹا رن وے کیوں ہے۔۔۔ تو میں آپ کو بتا دوں کہ چھوٹے سپرے والے جہاز کے لئے پچاس میٹر کا رن وے بھی بہت ہوتا ہے۔ ان کو اوپر اٹھنے کے لئے زیادہ لمبے رن وے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ ان کا سائیز ایک بڑی کار کے برابر ہوتا ہے اور وزن کار سے بھی ہلکا ہوتا ہے۔ ڈیرے پر تیس کے قریب لڑکے رہ رہے تھے اور سارے ہی انڈیا یا پاکستان کے رہنے والے تھے۔ ڈیرے کی ایک سائیڈ پر ایک دومنزلہ بلڈنگ تھی جس میں دس کمرے تھے۔ ایک لائین سے پانچ کمرے نیچے اور ان کے اوپر چار دیواری کے مزید پانچ کمرے بنا دیے گئے تھے۔ دو باتھ روم ایک سائیڈ پر نیچے بنے ہوئے تھے اور اسکے ساتھ اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ بلڈنگ کے ساتھ ہی بھیڑوں کا چھوٹا سا فارم تھا جبکہ بڑا فارم گائے کا تھا جو دوسری طرف تھا۔

اس کے علاوہ تین بڑے بڑے ہال تھے جن کی چھتیں لوہے کی بنی ہوئی تھیں اور ان کے دیوہیکل دروازے بھی لوہے کے بنے ہوئے تھے۔ لوہے کے گیٹ کے اندر چھوٹا دروازہ تو نارمل کمرے کے دروازے جتنا بڑا تھا لیکن بڑا گیٹ اتنا بڑا اور بھاری ہوتا تھا کہ اسے کھولنے کے لئے بھی دو آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان ہالوں کے اندر مشینری، کھاد اور بیج وغیرہ رکھا جاتا تھا۔ سپرے والے جہاز کا گیراج دوسری طرف تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا کولڈ سٹوریج بھی تھا جہاں سبزی کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے رکھا جاتا تھا۔ امریکہ میں زمینداروں کے لئے بجلی تقریباً مفت ہوتی ہے اور بجلی کا بل انتہائی کم آتا ہے۔ گورنمنٹ کسانوں کو بہت زیادہ سہولیات دیتی ہے۔

لڑکوں نے کام سے چھٹی کر لی تھی اور اب گھر میں کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کھانا انڈین اور پاکستانی اکٹھا ہی بناتے تھے۔ تیس لڑکوں کے لئے ایک ہی بڑی ہنڈیا پکتی تھی۔ تین تین لڑکے روزانہ کھانا باری پر بناتے تھے اور سور اور گائے دونوں کا گوشت کچن میں لانا اور پکانا منع تھا۔ یہاں صرف تین لڑکے ہندو تھے جبکہ باقی سارے سکھ اور مسلمان تھے۔ ہندو گائے کا گوشت جبکہ مسلمان سور کا گوشت نہیں کھاتے تھے، اس لئے دونوں ہی منع تھے۔

پاکستان اور انڈیا سے باہر نکلتے ہی آپ کو ایسا ہی ماحول ملے گا، بیرون ملک میں آپ کو کہیں بھی دشمنی نہیں ملے گی۔ چونکہ ہماری زبان ایک جیسی ہوتی ہے اس لئے آپ کو ہزاروں کی تعداد میں پاکستانی اور انڈین اکٹھے رہتے ہوئے ملیں گے۔ جرمنی میں میں نے دو سال ایک انڈین ریسٹورنٹ میں کام کیا ہے اور میں سوتا بھی انڈین سٹاف کے ساتھ ہی رہا ہوں۔ ملک سے باہر ہم صرف پنجابی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے جان بھی دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی ماحول ایسگارڈ کے ڈیرے پر بھی تھا۔ لڑکوں کو پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ میں امریکہ پہنچ گیا ہوں اور میری آج شادی بھی ہوگئی ہے۔ تقریباً سارے ہی لڑکے مجھے جانتے تھے۔

ایسگارڈ کی محبت کی داستان صرف ان لڑکوں کو ہی نہیں معلوم تھی بلکہ پورا گاؤں جانتا تھا۔ ایسگارڈ کے والد کارٹر اس علاقے کے بڑے زمیندار تھے۔ بلڈنگ کے سامنے لکڑی کے تین چار بینچ لگے ہوئے تھے، ہم سب ادھر ہی جا کر بیٹھ گئے۔ سارے لڑکے باہر آ کر مجھ سے ملنے لگے۔ ایسگارڈ سب کو نام سے جانتی تھی، وہ باری باری سب کا تعارف کروانے لگی اور میں مذہب کے حساب سے کسی کو اسلام علیکم اور کسی کو ست سری اکال کہنے لگا۔

''راضی بھائی! بہت انتظار کروایا آپ نے۔۔۔ ہم تو پچھلے دو سال سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔''
ایک نوجوان لڑکے نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ یہ ناصر تھا جو راولپنڈی کی تحصیل واہ کینٹ کا رہنے والا تھا۔ 30 سال کے قریب عمر اور کافی پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔

''بس یار! قسمت میں دھکے لکھے ہوئے تھے اس لئے اپنے حصے کے دھکے کھا کر ہی ادھر تک پہنچا ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''راضی! میں نے اردو زبان اسی سے سیکھی ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے اور کافی پڑھا لکھا بھی ہے۔''

ایسگارڈ نے درمیان میں بولتے ہوئے کہا۔

اس نے CA کیا ہوا تھا اور وہ کینیڈا اسٹڈی ویزے پر آیا تھا۔ وہاں سے وہ امریکہ آ گیا اور اس نے امریکہ کا ویزہ بھی لے لیا تھا۔ بہت تعلیم یافتہ تھا لیکن چونکہ امریکی شہری نہیں تھا اور تعلیم بھی پاکستان سے حاصل کی تھی اس لئے مناسب نوکری نہیں ملی تھی۔ وہ تھک ہار کر زمیندار ے کے کام پر آ گیا اور ابھی پچھلے تین سال سے ادھر ہی سبزی کا کام کر رہا تھا۔ امریکہ میں کوئی بھی کام بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا ہے۔ پیسے، مزدوری اور نوکری دونوں طرف سے ایک جیسے ہی ملتے ہیں۔ یہاں رہائش فری تھی اور سبزی، دودھ وغیرہ بھی ڈیرے کا ہی تھا اس لئے یہاں کا کوئی خرچہ نہیں تھا اور ساری بچت ہی بچت تھی۔ شہر کے اندر کرائے کے مکانوں میں رہ کر نوکری سے اتنا پیسہ نہیں بنتا تھا جتنا یہاں سبزی کے کام سے مل جاتا تھا۔

ایسگارڈ کا والد کارٹر ایک گھنٹے کے دس ڈالر دیتا تھا اور سبھی لڑکوں کا ماہانا ٹیکس بھی وہ ہی ادا کرتا تھا جو کہ تقریباً تین ڈالر فی گھنٹہ کے حساب سے بنتا تھا۔ اس طرح وہ ٹوٹل تیرہ ڈالر فی گھنٹہ ادا کر رہا تھا۔ لڑکے روزانہ صبح چھ بجے سے شام چار بجے تک دس گھنٹے کام کرتے تھے اور سو ڈالر کما لیتے تھے۔ خرچہ وغیرہ نکال کر آسانی سے سبھی لڑکے دو ہزار ڈالر کما لیتے تھے جو پاکستانی دو لاکھ بیس ہزار کے برابر ہوتے ہیں۔ یہاں سبزی کے کام میں خرچہ بھی بہت ہوتا ہے اور کمائی بھی اسی حساب سے ہوتی ہے۔ کارٹر کے پاس پچاس کے قریب لوگ کام کرتے تھے اور وہ ایک کروڑ سے اوپر ان کی ماہانہ تنخواہ دیتا تھا۔ پاکستان میں میرا پورا گاؤں سارا سال مل کر اتنا نہیں کماتا تھا جتنی وہ ایک مہینے کی تنخواہ دیتا تھا۔

رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہوا تو ہم واپس گھر آ گئے۔ چونکہ آج سارا دن ہمارا مصروف ہی گزرا تھا اس لئے رات کا کھانا کھاتے ہی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میرا اور ایسگارڈ کا کمرہ سب سے اوپر والی منزل پر تھا جس کی بالکونی میں کھڑے ہو کر پورا گریٹ فالز نظر آتا تھا۔ آج ہماری شادی ہو گئی تھی، یورپ میں تو صرف میرج بک ہی بنوائی تھی لیکن یہاں پر باقاعدہ شادی ہوئی تھی اور ایسگارڈ قانونی طور پر میری بیوی بن گئی تھی۔ میں نے نہا کر کپڑے تبدیل کئے اور ایک سادہ ٹراوزر شرٹ پہن کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ ایسگارڈ میرے نکلنے کے بعد باتھ روم میں گھس گئی اور میں کمرے کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

ایمان نے کراچی میں اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی اور میں اس شادی شدہ ایمان کی محبت کو دل سے لگائے پچھلے گیارہ سال سے تڑپ رہا تھا۔ آج میں بھی شادی شدہ ہو گیا تھا۔ قدرت نے عجیب سا کھیل کھیلا

تھا، ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور دونوں نے ہی الگ الگ شادی کر لی تھی۔ ہماری زندگیوں میں مزید دو اور لوگ آ گئے تھے جن سے ہم نے شادی کی تھی۔ چار لوگ اور چاروں ہی ایک دوسرے کے طلب گار تھے۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ؛

''بیٹا! خدا نے ہم سب کی زندگیوں کے دائرے بنائے ہوئے ہیں۔ یہی دائرے جب ایک دوسرے سے الجھتے ہیں تو نئی یادیں بنتی ہیں۔ زندگی تو ہماری ہوتی ہے لیکن اسے چلانے والے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ ہم جانور نہیں ہوتے جنہیں کسی اور کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ انہیں صرف کھانے سے غرض ہوتی ہے۔ ہم انسان ہیں اور ہمیں معاشرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں، باپ بہن بھائی ہمیں سب سے محبت ہوتی ہے اور سب کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ جوانی آتی ہے تو چاہنا اور چاہے جانے کا احساس بھی اچھا لگتا ہے۔ عاشق اور معشوق کے دائرے بھی بنتے ہیں۔ محبت جب اپنا اثر دکھانا شروع کرتی ہے تو نئی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ انسان اس محبت کے بہاؤ میں بہتا ہے تو پھر بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر سبھی ٹھیک ہوتے ہیں۔''
میری اس کہانی میں سبھی ٹھیک تھے۔

ایمان کا پہلا شوہر اسلم وہ بوڑھا بھی تو ایمان سے محبت کرتا تھا، دوسرا شوہر واصف بھی اس سے محبت کرتا ہے اور ایسگارڈ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ ہم سب ہی محبت کرتے تھے اور سب ہی اپنی اپنی محبت کو پانے کے لئے محنت کر رہے تھے۔ ایسگارڈ نہا کر باہر آ گئی تھی۔ اس نے بھی ہلکے پھلکے کپڑے پہن لیے تھے۔

''راضی! آج سے میں تمہاری بیوی بن گئی ہوں اور آج سے تم میرے ہو گئے ہو۔ ہم دونوں کے درمیان سب کچھ ہی جائز ہو گیا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''راضی! آج ہماری سہاگ رات ہے نا؟ شادی کی پہلی رات کو پاکستان میں سہاگ رات ہی کہتے ہیں نا؟'' اس نے بیڈ پر میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

ٹیوب لائیٹ کی سفید روشنی میں اس کا چہرا چمک رہا تھا۔ کالی شرٹ میں اس کا سفید جسم چھلک چھلک کر باہر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی چلا گیا۔ وہ بہت خوبصورت تھی، شاید میری سوچ سے بھی زیادہ خوبصورت۔ خدا جب حسن دینے پر آتا ہے تو بہت زیادہ ہی نواز دیتا ہے۔ وہ حسن کا ایک شاہکار تھی جسے خدا نے میری قسمت سے منسلک کر دیا تھا۔

''ایسگارڈ!'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، سب کچھ پرفیکٹ تھا۔ سفید رنگت، سبز

آنکھیں، سنہری بال، گلابی ہونٹ جن کو لپ سٹک سے سرخ کرنے کی ضرورت تھی۔

''ایسگارڈ! سرخی نہیں لگاؤ گی یار؟ میں اس حسن کو مکمل دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی سے اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر سرخی لگانے لگی۔ وہ پیچھے مڑنے لگی تو میں نے اسے ادھر ہی روک دیا اور شیشے میں دونوں کا عکس دیکھنے لگا۔ حسن کا وہ شاہکار مکمل ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹی تو میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے بالوں سے ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ سامنے شیشے میں ہم دونوں کا عکس ابھر رہا تھا۔

''ایسگارڈ! تم بہت حسین ہو، اس دنیا کی کوئی بھی خوبصورتی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تم اس دنیا کی لگتی ہی نہیں ہو۔''

''راضی! کیا فائدہ ایسی خوبصورتی کا جو ایک شخص کو اپنی طرف مائل ہی نہ کر سکی۔ مجھ سے زیادہ خوبصورت تو وہ ایمان ہی ہو گی جس کی محبت میں تم نے 16 سال گزار دیئے اور دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آ گئے؟ جبکہ میری خوبصورتی تو تم سے تیری زندگی کے دو منٹ بھی نہ لے سکی۔ دو منٹ ۔۔۔ جو خالص میرے ہوتے، جس میں کسی اور کا حصہ نہ ہوتا۔۔۔ صرف اور صرف میرے۔ نہیں راضی! میں خوبصورت نہیں ہوں اور خوبصورت لوگ میرے جیسے نہیں ہوتے بلکہ وہ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔'' وہ مجھ سے الگ ہوئی اور بیڈ پر جا کر لیٹ گئی۔ میں بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے یار! آج کچھ شیطانیت جاگ رہی ہے، خیر تو ہے نا؟ کہیں محبت تو نہیں ہونے لگی مجھ سے؟ ویسے بھی ایک شوہر کو اپنی بیوی سے محبت کرنی چاہیے۔'' اس نے شوخی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا اور اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں میں لے کر ان کا رس پینے لگا۔ دو تین منٹ تک ہم دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کے ہونٹ چوستے رہے۔ سرخ ہونٹوں کی سرخی اپنے جسم میں اتارتے اتارتے مجھ پر مدہوشی سی طاری ہونے لگی۔ اس کے ہونٹ کسی شراب سے کم نہیں تھے جو مجھے مدہوش کر رہے تھے۔ میں نے اسے بیڈ پر گرایا اور ہونٹوں کو چھوڑ کر گالوں پر آ گیا۔ اس نے اپنے چہرے کو اوپر اٹھایا تو اس کی لمبی گردن میرے نشانے پر آ گئی اور میں اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں کو اس

کی گردن سے ٹھنڈا کرنے لگا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے چہرے پر تھا اور دوسرا ہاتھ میں نے اس کی شرٹ کے اندر ڈالا اور اسکے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تھیں اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ گردن سے ہوتا ہوا میں نیچے آیا تو اس کی شرٹ میرے آگے حمائل ہوگئی۔

میں نے اس کی شرٹ کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دے کر تھوڑا اٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ تھوڑا اوپر اٹھی اور میں نے اس کی شرٹ اتار دی۔ شرٹ کے نیچے اس نے اس وقت کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر اس کے چھلکتے ہوئے سینے کی طرف دیکھا اور اس کے گورے پیٹ پر جھک گیا۔ اس بار میں نیچے سے اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ آزادانہ اس کے سینے پر گھوم رہے تھے۔ اس کے پیٹ سے لے کر اوپر چہرے تک کوئی حصہ بھی ایسا نہیں تھا جہاں تک میں نہیں پہنچا تھا۔ میں اسے ہر جگہ سے چوم رہا تھا۔ اس کے جسم کی مٹھاس آہستہ آہستہ میرے اندر اتر رہی تھی۔ ایسگارڈ کی محبت آج جیت رہی تھی۔ اس کی خوبصورتی نے آج مجھے فتح کر لیا تھا۔ میرا ہاتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے ٹراؤزر پر پہنچ گیا۔ محبت کی آخری منزل آ گئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ٹراؤزر کے اندر ڈالا اور آہستہ سے اسے آگے کی طرف حرکت دی۔

''نہیں راضی! شاید اس کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔۔۔شاید ہم غلط کر رہے ہیں؟'' اچانک ایسگارڈ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر اسے مزید آگے کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔ اس کا جسم شدت جذبات سے لرز رہا تھا۔

''راضی! شاید یہ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ میں نے تم سے محبت کی ہے، میرے جسم کا ایک ایک انگ تمہارا ہے، سر سے لے کر پاؤں تک میرے جسم کی ایک ایک خوبصورتی کے تم ہی مالک ہو لیکن تم کسی اور کی بھی امانت ہو اور میں اس امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتی۔ راضی! میں پچھلے دو سال سے ملن کی اس رات کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے راضی اور یہی محبت بٹوارہ برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے آدھا نہیں پورا راضی چاہیے اور اس پورے راضی کے لئے میں قیامت تک بھی انتظار کر سکتی ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے اور یہ محبت تجھے کھونا نہیں چاہتی۔'' اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے اٹھالیا اور اوپر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

میرا ہاتھ اس کے ٹراؤزر کے اندر گھسا ہوا تھا اور وہ ادھر ہی ساکت ہو گیا تھا۔ میں اس کی بند آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے آنسوؤں کے ہلکے ہلکے قطرے باہر نکلنے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ اس نے

آنکھیں بھینچ کر آنسو ضبط کر رکھے تھے۔ اس کے سرخ ہونٹوں کی سرخی اتر کر میرے ہونٹوں پر لگ چکی تھی۔ میں نے آہستگی سے ہاتھ کو باہر نکالا اور بیڈ کے کنارے پر پڑی ہوئی شرٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔

''ایسگارڈ! تم وہ چیز ہو جس کی خاطر انسان ملی ہوئی جنت بھی ٹھکرا سکتا ہے۔ اس پوری دنیا کی ساری خوبصورتی مل کر بھی تمہاری ایک مسکراہٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے جو تو مجھ جیسے انسان سے محبت کرتی ہے اور تمہارا حسن آج میری دسترس میں ہے۔ ورنہ میری اتنی اوقات بھی نہیں ہے کہ تجھے ہاتھ بھی لگا سکوں۔ ہم ریگستانی لوگ ہیں ہمیں تو پینے کے لئے صاف پانی بھی نہیں ملتا اور یہاں آب حیات کی پوری کی پوری جھیل میرے سامنے ہے۔'' میں اس کے برابر لیٹ گیا۔ اس نے میری طرف کروٹ بدلی اور میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

''ایسگارڈ! میں نہیں جانتا کہ ہمارا مستقبل کیا ہے۔ ہماری یہ لازوال محبتیں پتہ نہیں ہمیں کس موڑ تک لے کر جائیں گی۔ محبت کا مطلب صرف جسم کا ملنا ہی نہیں ہوتا، محبت ان جسموں سے بہت اوپر کی بات ہوتی ہے۔ ایمان کی محبت میں بھاگتے بھاگتے اس راضی کو محبت تو تجھ سے بھی ہوگئی ہے۔ اسی لئے اس محبت کا درد میں اپنے سینے میں بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔'' میں نے اس کے ماتھے کو چومتے ہوئے کہا۔

''تجھ سے محبت ہوگئی ہے یار!'' میں نے زور سے اس کو اپنے ساتھ لپٹایا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دوسرے دن ایسگارڈ کے والد کارٹر نے تقریباً پورے گاؤں کو ہی دعوت دی ہوئی تھی۔ دعوت کا سارا انتظام انہوں نے ڈیرے پر ہی کیا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک ڈی جے پنجابی اور انگلش گانے بجاتا رہا۔ پنجابی میوزک بج رہا ہو اور بھنگڑا نہ ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں لڑکے جھجکتے رہے اور گورے ہی ہلکے میوزک پر ڈانس کرتے رہے۔ پھر سب سے پہلے ناصر نے ہی ابتدا کی اور پھر تو وہاں ایسی ایسی ڈانس کی قسمیں متعارف ہوئیں کہ گورے بھی حیران رہ گئے۔ ان گوروں نے اپنی پوری زندگی میں بھی ایسا ڈانس نہیں دیکھا تھا۔ وہ ویڈیو بھی بنا رہے تھے اور لڑکوں سے اس ڈانس کا نام بھی پوچھ رہے تھے۔ نام کا تو کسی کو بھی پتہ نہیں تھا سبھی بھنگڑا ہی کہہ رہے تھے۔ تیس لڑکے تھے اور یہاں کم از کم کوئی پچاس قسم کا ڈانس ہو رہا تھا اور نام سب کا بھنگڑا ہی تھا۔

میرے خیال میں اگر فرح خان بھی ادھر ہوتی تو وہ بھی ان ڈانس کی قسموں کو نہ پہچانتی اور شاید اتنا اچھا

ڈانس دیکھ کر ویسے ہی شرم سے بے ہوش ہو جاتی۔ یہ سارا ہنگامہ رات کو بارہ بجے تک چلتا رہا۔ اگلے دن چھٹی تھی اس لئے لڑکے بھی بےفکری سے اس ماحول کو انجوائے کرتے رہے۔

سبزی اور جانور میری جان ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک لکھاری کو صرف کتابوں سے محبت ہوتی ہے، مصور کو تصویروں سے محبت ہوتی ہے، اسی طرح مجھے ان جانوروں سے محبت تھی۔ میں نے اپنا پورا بچپن بکری کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے گزارا تھا۔ یہاں امریکہ کے اس گاؤں میں جب ایسا ماحول ملا تو جیسے میں سب کچھ ہی بھول گیا۔ میں صبح صبح ایسگارڈ کے والد کارٹر کے ساتھ ڈیرے پر آجاتا اور پھر رات کو ہی ادھر سے واپس جاتا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے ایسگارڈ بھی ڈیرے پر آنے لگی اور وہ بھی ڈیرے کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی۔

زمیندارے کے کام سے میری دلچسپی دیکھ کر انکل کارٹر بھی مجھ سے متاثر ہو گئے اور وہ مجھے مشینری کا استعمال سکھانے لگے۔ مجھے اس کام سے ویسے ہی بہت دلچسپی تھی اور میں ہر چیز کو پوری توجہ سے سیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک مہینے تک میرا گرین کارڈ آ گیا تو میں نے اس پر ڈرائیونگ لائسنس کا ڈپلومہ کر لیا۔ میں نے ہیلینا سے ڈرائیونگ لائسنس لیا اور شہر سے ہی نئی کار لے کر گھر آ گیا۔ انکل کارٹر نے مجھے نئی کار گفٹ کی تھی۔ ایوی ایشن کے ڈپلومے کے لئے امریکہ کے ویزے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ایوی ایشن کا ڈپلومہ بہت مشکل سے ملتا ہے اور اس کے لئے کافی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسگارڈ اور انکل کارٹر دونوں کے پاس جہاز اڑانے کا لائسنس تھا اور میں اکثر ہی ایسگارڈ کے ساتھ سیر کے لئے نکل جاتا تھا۔ میرا گرین گارڈ آ گیا تو انکل کارٹر نے میرا میڈیکل کارڈ اور نیشنل ٹیکس نمبر بنوایا اور انتہائی بھاری ٹیکس دینے لگے۔ اسی ٹیکس کی بدولت اگلے دو مہینوں میں ہی میرا پانچ سال کا ویزہ لگ گیا۔

اب میں امریکہ میں قانونی طور پر مقیم تھا اور پورے امریکہ میں کہیں بھی جا سکتا تھا۔ میرا ارادہ تو ویزہ لینے کے فوراً بعد ہی نیویارک جانے کا تھا لیکن ایسگارڈ نے روک لیا۔ چونکہ میں نے امریکہ میں شادی کی تھی اور میرے پاس امریکہ کا ویزہ تھا، اس لئے میں امریکہ میں زمین خرید سکتا تھا۔ انکل کارٹر نے پچاس ایکٹر کا ایک پلاٹ میرے نام پر خریدا اور میری اور ایسگارڈ کی شادی کے کاغذات اور پلاٹ کے کاغذات دونوں مونٹانہ کے مرکزی امیگریشن ڈیپارٹمنٹ میں جمع کروا کر امریکی شہریت اپلائی کر دی۔ میری ایسگارڈ کے ساتھ شادی ہوئی تھی اس لیے میں ویسے ہی امریکی شہریت کے لئے اپلائی کر سکتا تھا۔ مجھے امریکی شہریت بھی

مل جاتی تھی لیکن زمین کی خریداری اور بھاری ٹیکس کی بدولت یہ کام جلدی ہو جاتا۔

وکیل نے ہمیں یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ مجھے چھ مہینے کے اندر اندر امریکی شہریت دلوا دے گا۔ میرا ارادہ ایک بار نیو یارک جانے کا تھا لیکن ایسگارڈ نے مجھے روکے رکھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ اگر میں ایک بار مونٹانہ سے چلا گیا تو دوبارہ واپس نہیں آؤں گا اور میری امریکی شہریت اگر ایک بار مس ہو گئی تو پھر دوبارہ نہیں ملے گی۔ ایسگارڈ کے علاوہ انکل کارٹر بھی یہی کہہ رہے تھے کہ میں امریکی پاسپورٹ لے کر ہی جاؤں۔ جہاں گیارہ سال انتظار کیا ہے وہاں مزید تین چار مہینوں سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے، مجھے واقعی ایک بار ان سب چیزوں سے بے فکر ہو کر آگے بڑھنا تھا۔

نیو یارک کے بعد مجھے واپس پاکستان بھی جانا تھا، کراچی جا کر ایمان کو ڈھونڈنا بھی تھا، اس سے شادی کرنی تھی اور اسے امریکہ لے کر آنا تھا۔ نیو یارک کے پانیوں میں کھڑے اس دوسرے خدا کے پاس لے کر آنا تھا۔ میری اور ایمان کی اس محبت کی تکمیل صرف اس مجسمے کے سامنے ہی مکمل ہونی تھی۔ ایمان نے واصف سے شادی کر لی تھی۔ یہ اس کی دوسری شادی تھی اور اس نے اپنی مرضی سے دوسری شادی کی تھی۔ محبت تو صرف مجھ سے ہی کرتی ہے۔۔۔ اگر میں اس محبت کی خاطر گیارہ سال کی انتھک محنت کر کے امریکہ پہنچ سکتا تھا تو پھر محبت تو اس کو بھی اتنی ہی تھی، اس محبت کی خاطر وہ بھی سب کچھ چھوڑ سکتی تھی۔

میری ایسگارڈ کے ساتھ شادی کے ٹھیک سات مہینے بعد مجھے امریکی شہریت مل گئی۔ میں ہیلینا کے پاسپورٹ آفس سے اپنا امریکی پاسپورٹ لے کر باہر نکلا تو باہر ایسگارڈ اور انکل کارٹر دونوں ہی انتظار کر رہے تھے۔ میرا مونٹانہ میں سارا کام مکمل ہو گیا تھا اور اب میں ایک امریکی شہری تھا۔ ایک طاقت ور ترین ملک کا شہری جو پوری دنیا میں کہیں بھی جا سکتا تھا۔ ہم گھر سے اپنا سامان لے کر ہی آئے تھے اور یہیں سے میں اور ایسگارڈ آگے نیو یارک کی طرف چلے جاتے۔ ایسگارڈ کا ارادہ تو بذریعہ فلائیٹ نیو یارک جانے کا تھا لیکن میں اپنی گاڑی میں نیو یارک جانا چاہتا تھا۔

مونٹانا سے نیو یارک 3500 کلومیٹر کا فاصلہ بنتا ہے۔ بغیر رکے ایک کار یہ فاصلہ 33 گھنٹوں میں طے کرتی ہے۔ میرا ارادہ راستے میں رکتے ہوئے آرام سے تین دنوں میں پہنچنے کا تھا۔ میں امریکہ کے خوبصورت نظاروں کو دیکھتے ہوئے نیو یارک پہنچنا چاہتا تھا۔ مونٹانا سے نیو یارک جاتے ہوئے ہم امریکہ کی کم از کم آٹھ ریاستوں سے گزر کر جاتے اور میں ان سبھی ریاستوں سے گزر کر جانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک شہر

سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک گیارہ سال کا سفر کیا تھا۔ میری منزل یہی ملک تھا، ایک راستہ بند ہوتا تھا تو دوسرے راستے پر نکل پڑتا تھا۔ آج جب اس ملک کی شہریت مل گئی تھی تو اس ملک کی خوبصورتی دیکھنے کو بھی دل کر رہا تھا۔ میں اسی لئے اپنی گاڑی پر جانا چاہتا تھا۔ پاسپورٹ لینے کے بعد ہم تینوں نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور نیویارک جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

''ٹھیک ہے انکل کارٹر! ہم اب نکلتے ہیں؟ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔۔۔ایسگارڈ تو محبت کرتی ہے اس نے تو میرے لئے سب کچھ کرنا ہی تھا لیکن آپ نے اس سے بھی بڑھ کر میرے لئے کیا ہے۔ میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں راضی بیٹا! یہ سب کچھ میں نے اپنی بیٹی کے لئے تو کیا ہی ہے لیکن تجھ سے محبت ہم سب کو ہی ہو گئی تھی۔ خدا نے مجھے صرف ایک ہی اولاد دی تھی لیکن تمہارے آنے سے مجھے ایک بیٹے کا بھی احساس ہونے لگا تھا اور میں نے یہ سب کچھ ایک بیٹے کے لئے ہی کیا ہے۔ جتنی محبت مجھے ایسگارڈ سے ہے اتنی ہی محبت تم سے بھی ہے۔ تم آج چلے جاؤ گے۔۔۔ پتہ نہیں آگے کے کیا حالات ہوتے ہیں۔ تم ایسگارڈ کے ساتھ رہتے ہو یا ایمان کے ساتھ، یہ تمہاری زندگی ہے اور تم ہی بہتر فیصلہ کرو گے۔ بس بیٹا! ہمیں چھوڑ کر مت جانا، یہ گاؤں تمہارا ہے اور وعدہ کرو کہ تم اس گاؤں کو نہیں چھوڑو گے؟'' انکل کارٹر نے مجھے گلے لگا لیا۔

''نہیں انکل! میں اس گاؤں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ ایمان کو لے کر آؤں گا، وہ بہت اچھی ہے اور آپ کو اس سے بھی محبت ہو جائے گی۔ ہم سب اکٹھے رہیں گے ایک ہی گھر کی ایک ہی چھت کے نیچے، بس دعا کرنا انکل! ایمان مل جائے۔ کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ دو کروڑ کی آبادی میں ایک انسان کو ڈھونڈنا بہت مشکل ہے۔'' میں ان سے علیحدہ ہوا اور ہم دونوں ہیلینا سے نیویارک کی طرف چل پڑے۔

ابھی دو بجے کا ٹائم ہوا تھے، ہماری اگلی منزل ویومنگ ریاست کا ایک چھوٹا سا شہر جلیٹے (GILLETTE) تھی۔ ہیلینا سے جلیٹے 750 کلومیٹر کا سفر تھا۔ ہم دو بجے ہیلینا سے نکلے اور نو بجے سے پہلے جلیٹے پہنچ گئے۔ یہ شہر تیل اور کوئلے کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ 35 ہزار کی آبادی والا یہ شہر انرجی کیپیٹل (Energy Capital) کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ویومنگ ریاست امریکہ کی کوئلہ انڈسٹری میں 35 فیصد حصہ ڈالتی ہے اور یہ شہر اس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جلیٹے ہائی وے 90 پر واقع ہے جو 4861 کلومیٹر لمبی ہے۔ یہ واشنگٹن سے شروع ہوتی ہے اور میساچوسٹس (Massachusetts) تک

جاتی ہے۔ یہ امریکہ کی 13 ریاستوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ رات ہم نے اسی شہر کے ایک ہوٹل میں گزاری اور دوسرے دن صبح صبح ناشتہ کر کے اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ہم ہوٹل سے آٹھ بجے نکلے تھے اور دو گھنٹے بعد ہم ریپڈسٹی (Rapid City) پہنچ گئے۔ ریپڈسٹی جنوبی ڈکوٹا (South Dakota) کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اس شہر کی آبادی 75 ہزار کے قریب ہے۔ ہم شہر کے اندر جانے کی بجائے باہر سے ہی آگے بڑھ گئے۔ شام پانچ بجے کے قریب ہم جنوبی ڈکوٹا کے مرکزی شہر میسوفالز پہنچ گئے تھے۔ ایک لاکھ 80 ہزار کی آبادی کے ساتھ یہ اس ریاست کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس شہر کی سب سے خاص بات یہاں کا پانی ہے۔ شہر کے اندر بے شمار جھیلیں ہیں اور چھوٹے چھوٹے دریا بھی ہیں جو پورے شہر سے گزرتے ہیں۔ یہ دریا آگے تھوڑی دور میسوری دریا میں جا گرتے ہیں۔ آپ کو میسوفالز میں ہر طرف پانی ہی نظر آئیگا۔ یہاں پر ہم نے شام کا کھانا کھایا اور دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ میسوفالز جنوبی ڈکوٹا کا سرحدی شہر ہے۔

ہم شہر سے باہر آئے اور آدھے گھنٹے بعد ہی مینی سوٹا (Minnesota) ریاست میں داخل ہو گئے۔ دس ہزار سے زیادہ جھیلوں پر مشتمل اس ریاست کا رقبہ 86936 مربع کلومیٹر ہے اور یہ امریکہ کی بارہویں بڑی ریاست ہے۔ رات کو دس بجے کے قریب ہم روچسٹر (Rochester) پہنچے۔ رات کو ہم نے ادھر ہی قیام کیا اور اگلے دن صبح نکلے۔ بارہ بجے کے قریب ہم شکاگو (Chicago) پہنچ گئے۔ 28 لاکھ کی آبادی والا یہ شہر امریکی ریاست الینوئس (Illinois) کا دارالخلافہ اور سب سے بڑا شہر ہے۔ شکاگو سے ہم انڈیانا (Indiana) ریاست میں داخل ہوئے اور انڈیاناپولس (Indianapolis) شہر میں رک کر کھانا کھایا اور پھر اوھائیو (Ohio) ریاست کے مرکزی شہر کولمبس (Columbus) پہنچ گئے۔ کوسٹوفر کولمبس کے نام سے منسوب اس شہر کی آبادی 9 لاکھ کے قریب ہے اور یہ اوہائیو ریاست کا دارالخلافہ بھی ہے۔

کولمبس ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا۔ یہ شہر دریائے سیوٹو (Scioto River) کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ سے دریا گزرتا ہے۔ ہم رات ادھر ہی ٹھہرے اور کھانا بھی دریا کے کنارے پر بنے ہوئے ایک خوبصورت سے ہوٹل میں کھایا۔ اس شہر میں ایک عجیب سی کشش تھی، ایک عجیب سی محبت تھی جو ہر آنے والے سیاح کو اپنی طرف متوجہ بھی کرتی تھی اور وہ سیاح اس شہر کے حسن میں کھو جاتا تھا۔ رات کو کھانے کے بعد ہم دونوں بڑی دیر تک دریا کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے

رہے۔ دریا کے کناروں پر آباد بڑی بڑی عمارتوں کی روشنیاں جب دریا کے پانی پر پڑتی تھیں تو ان کا عکس ایک دلفریب سا نظارہ دیتا تھا۔

''ایسگارڈ! کیا تم کو بھی اس شہر کا حسن متاثر کر رہا ہے؟'' میں نے ایسگارڈ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں راضی! واقعی یہ شہر بہت خوبصورت ہے۔ میں اسی امریکہ کی رہنے والی ہوں لیکن دیکھ لو، یہاں کی ہوتے ہوئے بھی آج تمہارے ساتھ پہلی بار اس شہر کو دیکھ رہی ہوں۔'' ایسگارڈ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''راضی! میں جتنی بار بھی نیویارک گئی ہوں، ہمیشہ ہوائی جہاز کے ذریعے ہی گئی ہوں۔ پہلی بار سڑک کا سفر کیا ہے اور امریکہ کے چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ واقعی تمہارے ساتھ سفر کر کے مزا آیا، یہ سفر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔'' ہم دونوں ایسے ہی باتیں کرتے ہوئے واپس اپنے ہوٹل آ گئے۔

دوسرے دن سفر لمبا تھا، اس لئے ہم بغیر ناشتے کے ہی نکل گئے۔ ناشتہ ہم نے پٹس برگ (Pittis Busrgh) جا کر کیا۔ امریکی ریاست پنسلوینیا کا شہر پٹس برگ تین دریاؤں کے سنگم پر واقع ہے۔ یہاں پر تین دریا آ کر مل جاتے ہیں۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم روانہ ہوئے اور رات کو آٹھ بجے کے قریب نیویارک پہنچ گئے۔ ہم بروکلین (Brooklyn) کے ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ ہم نے اپنا سامان ہوٹل کے کمرے میں ہی چھوڑا اور مجسمۂ آزادی دیکھنے کے لئے باہر آ گئے۔ رات کو اس وقت تو ہم نہیں جا سکتے تھے کیونکہ وہ نیویارک اور نیو جرسی کے درمیان سمندر میں ایک چھوٹے سے جزیرے پر بنا ہوا تھا۔ بروکلین کے ساحل پر کھڑے ہو کر مجسمہ نظر آ جاتا ہے۔

''سمندر کے بیچوں بیچ روشنیوں سے چمکتا ہوا مجسمہ آزادی بہت اچھا لگتا ہو گا؟'' میں نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

ہمارا ہوٹل ساحل کے بالکل پاس ہی تھا، پانچ منٹ میں ہی ٹیکسی ہمیں لے کر ساحل پر آ گئی۔ میں ٹیکسی سے باہر نکلا تو مجھے دور سمندر میں کھڑا وہ مجسمہ نظر آ گیا۔ ایک بہت بڑا مجسمہ جو سمندر کے بالکل درمیان میں کھڑا تھا۔ اصل میں یہ سمندر نہیں بلکہ دریائے ہڈسن (Hudson River) کا دھانہ ہے۔ یہاں سے دریائے ہڈسن سمندر سے مل جاتا ہے۔ 151 فٹ بلند یہ مجسمہ روشن تو نہیں تھا بلکہ نیویارک اور نیو جرسی

دونوں کناروں کی روشنیاں اسے منور کیئے ہوئے تھیں۔ پورا سمندر ہی روشنیوں سے بھرا ہوا تھا اور انہی روشنیوں میں وہ مجسمہ بھی روشن نظر آرہا تھا۔ میں سڑک سے اتر کر ساحل کی ریت پر جا کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں مسلسل اس مجسمے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایسگارڈ خاموشی سے میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں ہی خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ میرے پاس کچھ بھی بولنے کے لئے الفاظ ہی نہیں تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کئی صدیاں بیت گئی ہوں۔ یہاں ساحل پر بہت رش تھا۔ لوگ آرہے تھے جا رہے تھے لیکن میں ان سب سے بے خبر بس اسی مجسمے کو دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے گیارہ سال اس خدا کی تلاش میں گزار دیئے تھے اور آج یہ خدا اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔

''ایسگارڈ!'' میں نے آہستگی سے اسے پکارا تو وہ متوجہ ہوگئی۔

''ایسگارڈ! کیا یہ ادھر سے بھی ہماری دعائیں سنتا ہے یا پھر ہمیں اس کے پاس جانا ہوگا اور اس کے قدموں میں سر رکھنا ہوگا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''راضی! یہ خدا نہیں ہے بلکہ یہ صرف ایک مجسمہ ہے۔ ہماری ساری دعائیں تو اوپر بیٹھا ہوا خدا ہی سنتا ہے۔ ہم امریکیوں کا کوئی الگ خدا نہیں ہے۔''

''نہیں ایسگارڈ! نہیں! تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' میں نے اس کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔

''ایسگارڈ! یہ صرف ایک مجسمہ نہیں ہے، یہ پورے امریکہ کا خدا ہے۔ یہ پورے امریکہ کی آزادی۔۔۔ بلکہ نہیں، امریکہ ہی کیوں؟ یہ پوری انسانیت کی آزادی کی علامت ہے۔ مجھے معلوم ہے اس پوری کائنات کا صرف ایک ہی خدا ہے اور اسی نے ہم سب کو بنایا ہے، اس مجسمے کو بھی اس نے بنایا ہے اور طاقت اور عزت بھی اسی خدا کی دی ہوئی ہے۔ اسی دنیا میں یہ اکیلا ہی مجسمہ نہیں ہے بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مجسمے ہیں۔ بس عزت اور وقار صرف اسی کو حاصل ہے۔ سجدہ کرنے سے کوئی خدا نہیں بن جاتا، کچھ مجسمے بغیر سجدے کے بھی خدا ہوتے ہیں۔'' میں ریت سے اٹھا اور واپس سڑک کی طرف چل دیا۔

ہم نے ٹیکسی لی اور ہوٹل آگئے۔ رات ادھر ہی گزار کر ہم صبح آٹھ بجے کے قریب ہوٹل سے ناشتہ کر کے باہر آگئے۔ ہم نے مجسمۂ آزادی کے لئے دو ٹکٹیں لیں اور فیری میں بیٹھ کر جزیرے پر پہنچ گئے۔ سمندر کے اندر ایک چھوٹی سے سڑک تھی جہاں پر کشتیاں لنگر انداز ہوتی تھیں۔ ہم فیری سے نیچے اترے اور اس سڑک پر چلنے لگے۔ تقریبا 75 میٹر لمبی یہ چھوٹی سی سڑک تھی جس کے آخر پر گھاس کا ایک چھوٹا سا میدان اور اس سے

آگے مجسمے کی عمارت تھی۔ یہ ایک عمارت تھی جس کے اوپر مجسمے کو کھڑا کیا گیا تھا۔ ادھر سے لوہے کا جنگلہ لگا ہوا تھا جو لوگوں کو آگے جانے سے روکتا تھا۔ میں ادھر جنگلے کے پاس کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''راضی! دوسری طرف چلتے ہیں، ادھر ایک کافی شاپ بھی ہے اور بیٹھنے کے لئے پارک وغیرہ بھی بنے ہوئے ہیں۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں دوسری طرف چلے گئے۔

وہاں ایک بڑا پارک تھا جس کے ایک طرف کچھ درخت لگے ہوئے تھے، نیچے خوبصورت گھاس اور اوپر بڑے بڑے درخت۔۔۔ بہت خوبصورت منظر تھا۔ گھاس پر ایک عورت درختوں سے گرنے والے پتے چن رہی تھی، اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ مجھے ایک کشش سی اس عورت میں محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ایمان ہو۔ میں بے اختیار اس کی طرف بڑھنا شروع ہو گیا۔

''راضی! ادھر مت جاؤ، ادھر جانا منع ہے۔'' ایسگارڈ نے مجھے ادھر جاتے ہوئے دیکھا تو اونچی آواز میں مجھے منع کیا۔ میں اس سے تھوڑا دور ہو گیا تھا۔

''راضی۔۔۔!'' اس بار اس نے قدرے اونچی آواز میں پکارا تو پتے چنتی ہوئی عورت کو رک گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور میں پتھر کا ہو گیا۔

وہ ایمان ہی تھی جو ادھر پارک میں پتے چن رہی تھی۔ بچپن کی کہانیوں میں سنا تھا کہ جب شہزادہ کسی پھول کو لینے کے لئے جاتا ہے تو ایک روحانی بزرگ اسے کہتا ہے کہ تم نے کسی بھی حالت میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا ہے چاہے کچھ بھی ہو جائے کیسی بھی ڈراؤنی آوازیں آئیں، تم پیچھے مڑ کر مت دیکھنا ورنہ پتھر کے ہو جاؤ گے۔ یہاں مڑ کر تو ایمان نے پیچھے دیکھا تھا اور اس کی سزا میں ہم دونوں ہی پتھر کے ہو گئے تھے۔ وقت ایک ایک پل کر کے گزر رہا تھا اور ہم دونوں پلک جھپکے بغیر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ صدیوں کی پیاس تھی ایک پل میں کیسے سیراب ہو جاتی۔۔۔ اس کے لئے تو سمندر بھی ناکافی تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی اپنی آنکھوں کو سیراب کر رہے تھے۔

''راضی! کیا ہوا تم اچانک رک کیوں گئے ہو۔ ایسگارڈ میرے نزدیک آ گئی تھی۔

''ایمان۔۔۔!'' میں نے لرزتے ہوئے پکارا تو وہ اچانک لڑکھڑائی اور ادھر ہی گر گئی۔

''راضی!'' ایسگارڈ نے ایمان کو یوں اچانک گرتے ہوئے دیکھا تو مجھے بازو سے پکڑ کر ہلایا۔ میں تو بالکل آخری کنارے پر کھڑا تھا۔ ایسگارڈ کے ہلکے سے ہلانے سے ہی اپنا توازن کھو بیٹھا اور میں بھی ادھر ہی

گھاس پر گر گیا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا سانس بند ہو گیا ہو اور میں بالکل پکا پھلکا ہو گیا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے میں کسی خلا میں سفر کر رہا ہوں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اور اس میں اکیلا میرا جسم تیر رہا تھا۔ کوئی آواز، کوئی سانس، کوئی روشنی تک نہیں تھی۔ صرف میں تھا اور میری سوچ تھی جو مجھے خلا میں گھما رہی تھی۔

''راضی۔۔۔! راضی۔۔۔! اچانک مجھے دور سے ایسگارڈ کی ہلکی سی آواز سنائی دی جو آہستہ آہستہ میرے نزدیک بھی آرہی تھی اور اس کی شدت میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔

''راضی!'' اچانک اس نے مجھے زور سے جھنجھوڑا تو مجھے ایک زوردار کھانسی لگی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایمان بھی وقتی جھٹکے سے سنبھل گئی تھی اور وہ میرے پاس آکر بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ آواز اسی کی تھی جو مجھے خلا کی بیکراں وسعتوں سے کھینچ کر لے آئی تھی۔ مجھے ہوش آ گیا تھا۔

ایمان۔۔۔۔! تم یہاں۔۔۔؟ تم یہاں کب سے ہو؟'' مجھ سے صحیح طریقے سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔

''ہاں راضی! یہ میں ہی ہوں۔ میں تو اسی سال امریکہ آ گئی تھی اور پچھلے گیارہ سال سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے امید تھی کہ تم لازمی ایک دن ادھر آؤ گے اور اسی امید کے سہارے میں تمہارا انتظار کرتی تھی۔'' وہ سامنے گھاس پر ہی بیٹھ گئی۔

''راضی! بہت دیر لگا دی یار! امریکہ آتے آتے۔۔۔ بہت لمبا انتظار کروایا تم نے۔'' وہ مسلسل میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میرا تو سب کچھ ہی وہ تھی اور اس کے علاوہ میں اور کہیں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

''راضی! اٹھو، اندر کیفے ٹیریا میں جا کر بیٹھتے ہیں۔'' ہم دونوں اب سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔ پارک کے اندر بیٹھنا اچھا نہیں تھا، ہم آرام سے اندر جا کر بیٹھ سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے ایسگارڈ! اندر ہی چلتے ہیں۔'' میں نے ایسگارڈ کو کہا اور دوبارا ایمان کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کا جسم پہلے سے تھوڑا ابھر گیا تھا۔ میں اسے سولہ سال کی نوجوان لڑکی کے روپ میں چھوڑ کر آیا تھا اور اب میرے سامنے ستائیس سال کی ایک بھرپور جوان عورت کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کی روشنی ابھی بھی اسی آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ چہرہ اب بھی تر و تازہ اور جوان تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین ہو گئی تھی۔

''راضی !ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' میری نظروں کی تپش سے وہ شرما گئی۔

''بس ایسے ہی۔۔۔خدا کے بنائے ہوئے حسن کو دیکھ رہا ہوں۔یار!میں اس خدائی کی تلاش میں بہت بھٹکا ہوں اوراسی خدا کی خدائی کی تلاش میں بہت سی ٹھٹھرتی اور کالی راتیں کاٹی ہیں۔آج جب اس خدائی کو پایاہےتو ایک بار جی بھرکرتو دیکھ لینے دو۔'' میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

''ایمان!تمہاری چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے؟'' میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''چھٹی تو چار بجے ہوتی ہےلیکن میں ابھی چھٹی کر لیتی ہوں۔مجھے صرف ایک فون کرنا پڑے گا؟'' وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔اس نے پینٹ کی جیب سے موبائل نکالا اوراپنے سپروائزر کوچھٹی کا بتا دیا۔

جزیرے کے اوپر ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں سارا صفائی والا سامان رکھا ہوا تھا۔اس نے سارا سامان ادھر رکھااور کپڑے بدل کر ہمارے ساتھ اندر کیفے ٹیریا میں آ گئی۔ناشتہ تو ہم پہلے ہی ہوٹل سے کر کے آئے تھے، یہاں پر ہم نے ایک ایک برگرلیااور ساتھ میں کافی لے لی۔آرام سے ادھر بیٹھ کر برگر کھانے کے بعد ہم فیری پر بیٹھ کر نیوجرسی آ گئے۔ایمان نیویارک کی بجائے نیوآرک میں رہتی تھی۔نیو یارک بہت مہنگا شہر ہےاور یہاں کرائے پر مکان ملنا مشکل ہے۔سستا اور بہترین مکان نیو یارک میں نہیں مل سکتا۔ہم نے ادھر سے میٹرو پکڑی اورتقریبا ایک گھنٹے کا سفر کر کے نیوآرک کے نسبتاً کھلے علاقے میں آ گئے۔یہیں ایک بیس منزلہ عمارت کے بارہویں فلور پرایمان رہتی تھی۔ایمان نے فون کر کے اپنے شوہر واصف کوبھی بلا لیا تھا۔ہم دونوں ایمان کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوگئے۔سامنے ہی کمرے میں ایمان کے شوہر بیٹھے ہوئے تھےاور دو چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے ہوئے تھے۔جن میں ایک لڑکی جس کی عمر قریباً آٹھ سال تھی اورایک لڑکا جو چھ سال کے قریب تھا۔دونوں ہی ماں پر گئے تھے۔گورے چٹے اور بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔میں انہیں دیکھ کر ادھر ہی رک گیا۔ایمان کے شوہر واصف مکرانی تھے۔کالا سیاہ چہرہ۔۔۔بالکل افریقن لگتے تھےلیکن دونوں بچے اپنی ماں پر گئے تھے۔ان میں کوئی ایک بھی نشانی اپنے باپ کی نہیں تھی۔

''ایمان!یہ تمہارے بچے ہیں؟'' میں ایمان سے پوچھنے لگا۔

''ہاں راضی!یہ میرے ہی بچے ہیں اور دونوں ادھرامریکہ میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ہم سب کے پاس اب امریکی شہریت ہے۔راضی!ہم امریکی ہوگئے ہیں۔جس ملک کے خواب دیکھتے ہوئے بھی مجھے ڈرلگتا تھا، میں سوچتی تھی کہ میری اتنی اوقات ہی نہیں ہے کہ میں اس ملک کے خواب بھی دیکھ سکوں۔دیکھ لو!آج

میں اسی ملک کا پاسپورٹ لیے ہوئے ہوں۔‘‘ اس کی آنکھیں فرط جذبات سے چمک رہی تھیں۔

’’تم سناؤ راضی! تم امریکہ کب پہنچے ہو اور یہ لڑکی تمہارے ساتھ کون ہے؟‘‘ وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔

میں نے خاموشی سے اپنی جیب سے پاسپورٹ نکالا اور ایمان کو پکڑا دیا۔اس نے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ پکڑ کر اسے کھولا تو وہاں میری تصویر لگی ہوئی دیکھ کر خوشی سے اچھلنے لگی۔

’’راضی! مبارک ہو یار، تم کو بھی امریکی شہریت مل گئی ہے۔۔۔ہم سب کی زندگی بن گئی ہے یار! تم دونوں ادھر ہمارے ساتھ ہی رہو، واصف تمہارے لئے کوئی اچھا سا کام تلاش کر کے دے دے گا۔‘‘ وہ صوفے پر بیٹھنے لگی تو میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

’’ایمان! میں یہاں تمہارے لیے آیا ہوں۔۔۔میں نے گیارہ سال کا سفر صرف تمہاری خاطر طے کیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ آگے کیا کرنا ہے؟‘‘

’’راضی۔۔۔کیا کہہ رہے ہو، میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟‘‘ اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

’’ایمان! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کیا۔۔۔؟ کیا کہہ رہے ہو؟ میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے ہیں۔ میں کیسے تم سے شادی کر سکتی ہوں؟‘‘ اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

’’شادی شدہ؟ تم شادی شدہ ہو تو اس میں کونسی نئی بات ہے؟ تم تو میرے گاؤں میں آئی ہی شادی شدہ تھی۔سترہ سال ہو گئے ہیں اس محبت کو، چھ سال پاکستان میں اور گیارہ سال پاکستان سے باہر۔۔۔ان سترہ سالوں میں تم تو ہمیشہ سے ہی شادی شدہ تھی۔ ہماری یہ محبت کسی بھی شادی کو نہیں مانتی تھی۔‘‘ میں نے چلّاتے ہوئے کہا۔

’’راضی! وہ بچپن تھا۔۔۔اسلم کے ساتھ میری شادی زبردستی ہوئی تھی جبکہ واصف کے ساتھ میں نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے اور میں ان کے دو بچوں کی ماں بھی ہوں۔ واصف مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔‘‘ وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

’’ایمان! محبت تو میں بھی تجھ سے کرتا ہوں۔۔۔تم ہی انتظار کرتی تھی شہزادے کے آنے کا جو تمہیں دیو سے آزاد کروا کر لے جائے۔ میں تو ہر بار ہی تمہیں لینے کے لئے آتا رہا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ آگ کے اس دریا کو پار کرنے میں صرف کر دیا ہے۔اب جب تمہارے پاس پہنچ گیا ہوں تو تمہیں دیو

سے ہی محبت ہو گئی ہے۔ ان سب چیزوں میں بتاؤ میرا کیا قصور تھا؟ ہر بار مجھے ہی کیوں سزا ملتی ہے؟'' میں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''ایمان! میں نے اس سفر میں بہت کچھ کھویا ہے، بہت سے لوگ، بہت سے ہمسفر جو ساتھ چلتے چلتے ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ انہیں موت چھین کر لے جاتی تھی، پولیس اور فوج چھین کر لے جاتی تھی۔ ملکوں کے درمیان لگی ہوئی لکیریں صرف بارڈر ہی نہیں ہوتے بلکہ یہ وہ آگ کے دریا ہوتے ہیں جنہیں پار کرنے کے لئے لاکھوں ماؤں کے شہزادے اپنی جان سے چلے جاتے ہیں۔ میں نے ان لکیروں پر تڑپتے ہوئے سینکڑوں نوجوان دیکھے ہیں اور ان کی آنکھوں میں چھپے ہوئے درد کو دیکھا ہے جو صرف اپنے گھر رہنے اور چاہنے والوں کے درمیان مرنا چاہتے تھے۔ دیکھو ایمان! تمہارا یہ راضی ان سبھی چیزوں کو دیکھنے کے بعد بھی زندہ ہے اور تجھ سے محبت بھی کرتا ہے۔'' میں ایمان کی گود میں سر رکھے روتا چلا گیا۔

''اٹھو راضی! حوصلہ رکھو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ایسگارڈ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اٹھا کر اوپر صوفے پر بٹھا دیا۔ میں آہستہ آہستہ نارمل ہو گیا۔

ایمان کے دونوں بچے بہت پیارے تھے۔ ایمان اور ایسگارڈ دونوں کچن میں چلی گئیں تو میں بچوں کے پاس بیٹھ گیا۔ شروع شروع میں تو بچے مجھ سے جھجکتے رہے لیکن پھر ساری جھجک ختم ہو گی اور وہ میرے ساتھ اپنی باتیں شیئر کرنے لگے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم شام کو ایک پارک میں چلے گئے۔ دو تین گھنٹے تک ادھر ہی رہنے کے بعد وہ تو واپس اپنے گھر چلے گئے جبکہ میں اور ایسگارڈ واپس بروکلین آ گئے۔ ہم نے اسی رات اس ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا اور نیوآرک میں ایمان کے گھر کے قریب ہی ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ دوسرے دن ایمان اور واصف دونوں ہی اپنے اپنے کام پر چلے گئے اور بچے بھی سکول چلے گئے۔

واصف ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں کام کرتے تھے۔ وہ پاکستان میں بہت اچھے سرکاری عہدے پر کام کرتے تھے۔ ان کی کچھ آبائی زمین بھی تھی۔ ایمان کے امریکہ جانے کی خواہش کا انہیں پتہ چلا تو اس نے اپنا سب کچھ بیچ کر نوکری سے استعفیٰ دیا اور امریکہ آ گئے۔ چونکہ وہ سرکاری افسر تھے اس لئے ان کے لئے ویزہ حاصل کرنا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ یہاں پر کچھ عرصہ تو وہ نیویارک میں مختلف فیکٹریوں میں کام کرتے رہے ،اس کے بعد ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ پیچھے پاکستان میں زمین کی فروخت سے جتنا بھی پیسہ آیا تھا انہوں نے

اس سے پہلے ایک چھوٹی سی پیزا شاپ کھول لی۔ دونوں میاں بیوی پیزا شاپ پر کام کرتے رہے۔ ایمان کے ہاتھ میں ذائقہ بہت تھا، وہ ہر چیز بڑی محبت سے بناتی تھی۔ پیزے کے ساتھ ساتھ انہوں نے پاکستانی کھانے بنانے شروع کر دیئے۔ آمدنی بڑھی تو انہوں نے پیزا شاپ کو بیچ کر ایک ریسٹورنٹ کھول لیا۔ یہ ریسٹورنٹ ادھر ہی نیو آرک کے علاقے میں تھا اور پاکستانی اور انڈین کھانوں کے لیے کافی مشہور تھا۔

ایمان کو چونکہ میرے امریکہ آنے کی امید تھی اس لئے وہ لگاتار روزانہ ایک گھنٹے کا سفر کر کے جزیرے پر جاتی تھی۔ یہاں ماہانہ کارڈ ہوتا ہے، ایک مہینے کا پاس خرید لو تو پھر پورے شہر میں کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ وہ روزانہ صبح صبح پہلے جزیرے پر جاتی اور پھر واپس آ کر پیزا شاپ پر چلی جاتی۔ ہوٹل اور ریسٹورنٹ وغیرہ ویسے بھی دوپہر کو 12 بجے سے پہلے نہیں کھلتے ہیں۔ صبح کا ناشتہ لوگ کافی ٹیریا میں کافی اور اس کے ساتھ سینڈوچ وغیرہ سے کرتے ہیں۔ ریسٹورنٹ کے اندر صرف دوپہر کا اور رات کا کھانا ملتا ہے۔ اس لئے چار بجے سے پہلے کوئی بھی ریسٹورنٹ نہیں کھلتا اور کھانا کھانے والوں کا اصل رش رات کو آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک رہتا ہے۔ ریسٹورنٹ کا 80 فیصد کام انہی تین گھنٹوں میں ہوتا ہے۔

شاید یہ ایمان کی چاہت ہی تھی جو اسے جزیرے پر صفائی کا کام مل گیا اور وہ صفائی کا کام کرنے لگی۔ اسی دوران ان کے دو بچے ہو گئے اور ان سب کو امریکی شہریت بھی مل گئی۔ واصف نے ریسٹورنٹ پر چار لڑکے ملازم بھی رکھے ہوئے تھے۔ ان کی بالکل پرفیکٹ زندگی گزر رہی تھی۔ ان کو بیوی، بچے اور اپنا کاروبار سب کچھ مل گیا تھا۔ میں تو اچانک ہی ان کی خوبصورت زندگی کے درمیان آ گیا۔ نہیں شاید میں غلط لکھ رہا ہوں میں ان کے درمیان نہیں آیا تھا۔ میری اور ایمان کی کہانی تو سترہ سال پرانی تھی۔ یہ سب لوگ ہماری زندگی کے درمیان آ گئے تھے۔

’’راضی! آگے کا کیا ارادہ ہے، کیا کرنا ہے؟‘‘ ہم دونوں اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسگارڈ میرے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں سامنے ٹی وی پر لگی ہوئی فلم پر جمی ہوئی تھیں۔

’’کچھ نہیں، صرف تھوڑا ٹائم چاہیے۔۔۔ ایمان کے ساتھ رہوں گا تو وہ آہستہ آہستہ میری طرف مائل ہو جائے گی۔ محبت کرتی ہے مجھ سے، زیادہ دیر تک میرے بغیر نہیں رہ سکے گی۔‘‘ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

راضی! اس کے دو بچے ہیں، ایک شوہر ہے اور وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم اس کے سامنے اس کی

بیوی سے اپنی محبت کا اعتراف کر رہے تھے، اس کے سامنے اسے چھوڑنے کی بات کر رہے تھے لیکن دیکھ لو، وہ ایک بار بھی نہیں بولا۔ راضی! میں نے اس کی آنکھوں میں محبت دیکھی ہے اور بے بسی بھی۔۔۔ تم اسی کے گھر میں اسی کے سامنے اس کی بیوی سے لپٹ رہے تھے اور اسے طلاق لینے کی بات کر رہے تھے لیکن پھر بھی وہ چپ تھا، ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ سوچو کتنی محبت کرتا ہوگا وہ؟'' ایسگارڈ نے ٹی وی کا والیوم بند کر دیا۔

''ایسگارڈ! تم نے صرف واصف کو ہی دیکھا ہے، ایمان سے صرف واصف ہی محبت نہیں کرتا بلکہ اس سے اسلم بھی محبت کرتا تھا۔ نمبرداروں کا بیٹا بھی محبت کرتا تھا۔ میرے گھر والے اور عامر۔۔۔ کس کس کا نام لوں میں؟ وہ سب ہی اس سے محبت کرتے تھے اور سب ہی اس کے لئے جان بھی دینے کے لئے تیار ہیں۔ ایمان ہے ہی ایسی کہ ہر کوئی اس سے محبت کرتا ہے۔ بات وہ نہیں ہے، بات ایمان کی محبت کی ہے کہ وہ کس سے محبت کرتی ہے؟'' ایمان کے واپس گھر آنے کا ٹائم ہو گیا تھا۔ ہم دونوں اسٹیشن پر اسے رسیو کرنے چلے گئے۔

ایسگارڈ نے کرائے پر ایک کار بھی لے لی تھی۔ بچوں کو سکول سے واصف لے کر آتے تھے۔ ہم گھر آئے تو وہ بھی بچوں کو لے کر آ گئے۔ بچے اب مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ میں انہیں لے کر نیچے پارک میں آ گیا۔ کھانا تیار ہو گیا تو ایمان نے فون کر دیا اور ہم سب اکٹھے کھانا کھانے لگے۔ واصف واپس ریسٹورنٹ چلے گئے تھے۔ اب وہ ادھر سے رات کو بارہ بجے ہی واپس آتے۔ اگلے ایک ہفتے ایسے ہی روٹین چلتی رہی۔ میں ایمان پر زور دیتا رہا لیکن وہ ہر بار ہی انکار کرتی رہی۔ واصف کا رویہ پہلے دن سے جو تھا وہی رہا، وہ اس سارے معاملے سے دور تھا۔ وہ ایمان کی خوشی میں ہی خوش تھا۔

آخری فیصلہ ایمان کو ہی کرنا تھا، اسی کی محبت تھی اور اسی کی زندگی تھی۔ وہ جس کے ساتھ جانا چاہتی چلی جاتی۔ ایمان کی ایسگارڈ سے بھی دوستی ہو گئی تھی۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ صرف ایک میں ہی ایسا تھا جس کا کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے بہت محنت کی تھی، بہت محبت کی تھی اور اس محبت کے لئے اپنا سب کچھ ہی داؤ پر لگا دیا تھا۔ آخر میں حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں آج سے سترہ سال پہلے بھی خالی ہاتھ تھا اور آج بھی خالی ہاتھ تھا۔

آج ویک اینڈ تھا۔ چھٹی تھی اس لئے میں اور ایسگارڈ صبح صبح ہی ایمان کے گھر چلے گئے۔ واصف بھی گھر پر ہی تھے۔ ایمان چائے بنانے کچن میں گئی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن میں چلا گیا۔

''راضی ! ادھر ہی بیٹھتے، کسی چیز کی ضرورت تھی تو مجھے بتا دیتے میں دے جاتی؟'' وہ کچن میں پڑے ہوئے برتن دھونے لگی۔

''کوئی چیز نہیں چاہیے ایمان! میں ویسے ہی تمہارے پاس کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔'' میں گیلے برتنوں کو کپڑے سے صاف کر کے ریک میں رکھنے لگا۔

''یار تمہیں دیکھ دیکھ کر میں بہت پریشان رہی ہوں۔ایسگارڈ بہت اچھی لڑکی ہے۔۔۔بہت تعلیم یافتہ، تم خوش رہو گے اس کے ساتھ۔'' اس نے نارمل انداز میں کہا۔

''ایمان! میں تمہارے علاوہ اور کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔اب تو سب کچھ ہی ٹھیک ہے، ہم دونوں کے پاس ہی امریکی شہریت ہے اور تمہارے دونوں بچے تو مجھے اپنی جان سے بھی پیارے ہوں گے۔ ہم دونوں ہی ان کو مل کر پالیں گے۔'' میں برتن صاف کرتے کرتے رک گیا۔

''راضی! یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ واصف بہت اچھے ہیں اور انہوں نے صرف میری خاطر اپنی بہترین نوکری اور گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا۔اب میں انہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟'' اس نے بھی برتن دھونا چھوڑ دیئے۔

''ایمان! میں مانتا ہوں کہ واصف نے بہت قربانیاں دی ہیں۔ اس نے ملک چھوڑا ہے، نوکری چھوڑی ہے۔ مانا کہ قربانیاں دی ہیں مگر اس نے قربانیاں دی ہیں تو میں نے کیا نہیں کیا؟ ماں، باپ، بہن، بھائی، ملک سب کچھ تو چھوڑا ہے تیری خاطر۔۔۔اور کون سی قربانی ہوتی ہے؟ تم اس کی قربانی تو یاد کر رہی ہو لیکن میری قربانی کو کیوں فراموش کر رہی ہو؟'' میری آواز تیز ہو گئی۔

''یار! تم سمجھنے کی کوشش تو کرو نا!' وہ مجھے سمجھانے لگی۔

''نہیں ایمان! میں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن تم نہیں سمجھ رہی ہو۔'' میں نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ایسگارڈ اور واصف دونوں میری چیخ سن کر کچن میں آ گئے۔

''کیا ہوا راضی! کیوں چیخ رہے ہو؟'' ایسگارڈ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''ایسگارڈ! ادھر ہی رک جاؤ، یہ میرا اور ایمان کا معاملہ ہے اور اسے ہمارے درمیان ہی رہنے دو۔'' میں نے ایسگارڈ کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ادھر ہی رک گئی۔

واصف پہلے ہی دروازے کے قریب کھڑے تھے۔ وہ اس پورے معاملے سے بالکل لاتعلق تھے اور وہ

ایمان کی کسی بھی بات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔ایمان جو بات کہہ دیتی تھی وہ خاموشی سے اسے مان لیتے تھے۔انہوں نے ایمان کی کسی بھی بات کو کبھی نہیں ٹالا تھا۔شاید محبت اسی کو کہتے ہیں کہ جو محبوب چاہے وہی اہم ہوتا ہے۔

''راضی پلیز یار! میں اپنی زندگی سے خوش ہوں اور تجھے بھی خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گے۔'' ایمان نے ایسگارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایمان! میں تمہارے ساتھ خوش ہوں اور صرف تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔'' میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے، میں رہتی ہوں تمہارے ساتھ۔۔۔پھر ان سب کا کیا ہوگا؟ ایسگارڈ، واصف اور میرے دونوں بچے ان سب کا کیا ہوگا؟ اس بارے میں بھی سوچو! صرف اپنے بارے میں مت سوچو، یہ بھی ہم سے محبت کرتے ہیں۔'' وہ بھی غصے میں آ گئی۔

''راضی! تم تو محبت کرتے تھے پھر یہ خودغرض کب سے ہو گئے؟ صرف اپنے بارے میں سوچ رہے ہو لیکن باقی کسی کا تم کو احساس نہیں ہے۔'' اس بار اس کی آواز بہت اونچی تھی۔

''ہاں! میں خودغرض ہوں۔۔۔مجھے صرف اپنے آپ سے ہی محبت ہے اور صرف تمہاری فکر ہے۔باقی میری طرف سے ساری دنیا کو آگ لگ جائے لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''ایمان صاحبہ! خودغرض میں نہیں ہوں بلکہ تم ہو۔۔۔تم نے ہمیشہ میرا استعمال کیا ہے۔صرف اپنے مقصد کے لئے، اپنی زندگی کے لئے، تم نے تو کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔'' میں نے اسے فرش پر دھکا دیا تو وہ فرش پر گر گئی۔

''ایمان!'' واصف تڑپ کر آگے بڑھے تو میں درمیان میں آ گیا۔

''میں نے بولا ہے نا تم سب کو کہ کوئی بھی ہمارے درمیان میں نہیں آئے گا؟'' میں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

''وہ۔۔۔وہ گر گئی تھی۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''باہر جاؤ اور ادھر ہی کھڑے رہو!'' میں نے انہیں باہر کی طرف دھکا دے دیا۔

''راضی پلیز! یہ سب کچھ مت کرو یار، میں تم سے آج بھی محبت کرتی ہوں۔'' ایمان اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''نہیں ایمان نہیں! تم جھوٹ بولتی ہو۔تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہی نہیں ہے۔کسی سے بھی نہیں، نہ مجھ سے نہ میرے گھر والوں سے اور نہ ہی واصف سے۔۔۔میں غلط تھا جو 17 سال سے ایک ان دیکھے خدا کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔تم خدا نہیں ہو ایمان! تم کچھ بھی نہیں ہو۔میں غلط تھا جو ایک سچے خدا کو چھوڑ کر تجھ جیسے جھوٹے خداؤں کی تلاش میں بھٹکتا رہا، بہت غلط تھا۔ میں نے صرف تمہاری خاطر اپنی پوری زندگی تباہ کر دی۔'' میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے اور میں سسک سسک کر رو رہا تھا۔

''راضی! پلیز مجھے معاف کر دو، میں تم سے آج بھی محبت کرتی ہوں۔'' وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے میری آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کو پونچھنا شروع کر دیا۔

''نہیں ایمان! یہ جھوٹ ہے۔تمہیں اس امریکہ کے علاوہ اور کسی سے محبت نہیں تھی۔اسی امریکہ کے لئے تم نے ہم سب کو استعمال کیا ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا۔

''ایمان! تمہاری وجہ سے صرف میری ہی زندگی تباہ نہیں ہوئی ہے بلکہ میرا گھر، میرے ماں باپ، بہن بھائی تم نے سب کی زندگی تباہ کر دی۔کتنی پیاری زندگی تھی ہماری۔۔۔میرا والد، یار اس کا کیا قصور تھا؟'' میری آواز ایک بار پھر اونچی ہو گئی۔

''ہاں! بتا سکتی ہو کہ میرے والد کا کیا قصور تھا؟ میں نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ نفرت اپنے باپ سے کی ہے۔کیوں؟ اس بے چارے کا کیا قصور تھا جو تمہاری اس محبت کی بھینٹ چڑھ گیا؟ کپڑے ہی پھاڑے تھے نا تمہارے؟ اگر اسے معاف کر دیتی تو؟ اگر تم نے میرے ساتھ رہنا ہی نہیں تھا تو پھر اس بے چارے کو کیوں سزا دی تم نے؟ مجھے کیوں امریکہ کے خواب دکھائے؟ میں تو خوش تھا اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں۔۔۔صرف تمہاری خاطر یہاں تک آیا ہوں تو پھر خالی ہاتھ کیوں لوٹا رہی ہو؟'' میری آواز حلق میں ہی گھٹ رہی تھی۔

''راضی! مجھے خود غرض مت کہو، میں نے زندگی میں صرف ایک ہی شخص سے محبت کی ہے اور وہ تم ہو۔ میں نے ہمیشہ تم سے ہی محبت کی ہے اور مرنے کے بعد صرف تم ہی میرے محبوب بنو گے۔ہاں راضی! میں خدا سے مانگ کر تمہیں لوں گی، بس اس دنیا میں تمہاری نہیں ہو سکتی۔ یہ زندگی صرف واصف کی ہے، اگلی زندگی

میں ایمان صرف تمہاری ہوگی۔'' اس نے نرمی سے بولتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایمان! تمہاری محبت کی تڑپ سہنے کے لئے یہی زندگی بہت ہے۔مرنے کے بعد راضی تمہارا نہیں بلکہ وہ جو باہر کھڑی ہے ناں ایسگارڈ، اس کا ہوگا۔ مجھے اسی زندگی میں بس ایمان چاہیے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''نہیں راضی! یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا۔تم میری جان مانگ لوتو میں خوشی خوشی ابھی تمہاری خاطر جان دے سکتی ہوں لیکن تمہارے ساتھ رہ نہیں سکتی۔اگر زندہ ہوں تو واصف کے ساتھ، ورنہ موت قبول ہے۔'' ایمان نے کچن سے چھری اٹھالی، اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی۔ باہر والے ایک بار پھر کچن میں آ گئے اور پھٹی پھٹی نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔

''بولو راضی! کیا کہتے ہو؟ جان چاہیے؟ آج تک تم نے ہی محبت دکھائی ہے اور اب میری محبت بھی دیکھ لو!'' اس نے چھری کو اپنی کلائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، محبت کا امتحان دینا چاہتی ہوتو صرف تم ہی کیوں یہ امتحان دو؟ سب نے محبت کی ہے تو امتحان بھی سب ہی دیں گے۔محبت کو بھی تو پتہ چلے کہ محبت ہوتی کیا ہے اور اس محبت کی خاطر کوئی کس حد تک جاسکتا ہے۔'' میں نے اونچی آواز میں بولتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے راضی! محبت کی بات ہورہی ہے تو پہلا امتحان میرا لو!'' واصف ہم دونوں کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔

''ایمان! چھری مجھے دو، سب سے پہلے میں اپنی کلائی کاٹتا ہوں۔'' اس نے ایمان کے ہاتھ سے چھری لینی چاہی تو ایمان نے چھری اپنے پیچھے کر لی۔

''نہیں واصف! یہ ہم دونوں کا معاملہ ہے، ہم دونوں کی محبت ہے اور دونوں ہی اس کا امتحان دیں گے۔'' ایمان نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار! اس نے اگر آج محبت میں امتحان کی بات کی ہے تو سب سے پہلے میں ہی امتحان دوں گا۔ یہ غلط سوچتا ہے کہ اس دنیا میں صرف یہی محبت کرتا ہے اور اس محبت کی خاطر جان دے سکتا ہے۔ میں بتاؤں گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ یار! محبت تو بہت چھوٹا لفظ ہے، یہ اس سے کہیں اوپر کی بات ہے۔ یہ وہ عشق ہے جو کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے، جو اظہار کا محتاج نہیں ہوتا، جو صرف دینا جانتا ہے اور کبھی محبت کا

صلہ مانگ کر شرمندہ نہیں کرتا۔'' واصف ہمارے درمیان کبھی نہیں بولا تھا۔آج جب بولنا شروع ہوا تو پھر بولتا ہی چلا گیا۔

''مجھے کسی کی جان نہیں چاہیے۔۔۔محبت میں جان دینا تو بہت آسان ہے اور یہ تو ہر کوئی دے سکتا ہے۔'' میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''ایمان !تم نے اس امریکہ کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔مجھ سے محبت کی ،مجھے امریکہ کے راستے پر لگایا، واصف سے شادی کی اور اسے امریکہ لے کر آئی۔میری زندگی تباہ ہوگئی لیکن تم نے تو کچھ بھی نہیں کھویا۔ امریکہ کی شہریت،اپنا کاروباراور بچے۔۔۔کتنی اچھی زندگی ہے۔کیا یہ زندگی چھوڑ سکتی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ایمان! مجھ سے شادی کر کے امریکہ میں رہ لو یا پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سبھی پاکستان کے اسی ریگستانی گاؤں میں چلتے ہیں؟ ہم دونوں نمبرداروں کے کھیتوں میں کام کریں گے جیسے میرے والد اور بھائیوں نے کیا تھا۔ ہمارا اپنا کاروبار تھا،صرف تمہاری وجہ سے وہ سب کچھ تباہ ہوا اور ہم نمبرداروں کے کھیتوں میں کام کرنے پر مجبور ہوئے۔آج تمہیں بھی اس سارے کاروبار کو چھوڑنا ہوگا اور امریکہ کی شہریت چھوڑنی ہوگی۔وہ مکان آج بھی خالی ہے جہاں تم اور اسلم رہتے تھے۔ہم سب اسی مکان میں رہیں گے۔ میں اور واصف نمبرداروں کے کھیت میں کام کر کے پیسے کما کر لائیں گے اور اسی پیسے سے گھر کا خرچہ چلے گا۔ نہ ایسگارڈ اور میں اپنے گھر سے کوئی پیسہ لیں گے اور نہ تم ادھر سے کوئی پیسہ لوگے۔بولو منظور ہے؟'' میں نے اپنی گفتگو کو ایک پل کا وقفہ دیا اور پھر بولنے لگا۔

''ایمان! میں نے تمہاری محبت کی خاطر اپنا ملک پاکستان چھوڑا اور آج تم میری محبت کے لئے امریکہ چھوڑ دو! خدا ایک ہی ہوتا ہے اور کوئی دوسرا خدا نہیں ہوتا۔'' میں کچن سے باہر نکل کر ٹی وی روم میں جا کر بیٹھ گیا۔میرے سینے میں بہت درد ہو رہی تھی لیکن میں برداشت کر کے بیٹھا ہوا تھا۔

''راضی! میں جانے کے تیار ہوں۔تم جہاں کہو گے میں وہیں جاؤں گی،جیسے رکھو گے ویسے ہی رہوں گی۔یہ زندگی بھی تمہاری ہے اور اگلی زندگی تو تم نے ویسے ہی میرے نام لکھی ہوئی ہے۔'' ایسگارڈ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تو میرے سینے کی جلن تھوڑی کم ہوگئی۔وہ ڈاکٹر تھی اور شاید اسے روح پر لگے زخموں کا علاج کرنا بھی آتا تھا۔ایسگارڈ کے پیچھے پیچھے واصف بھی آ گئے اور خاموشی سے میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔

''کیا سوچا ہے واصف بھائی! قربانی دو گے یا پھر امریکہ ہی اچھا ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''راضی! فیصلہ ایمان کا ہے۔۔۔ ہم سب لوگ اسی کے گرد گھوم رہے ہیں، وہ جو بھی فیصلہ کرے گی مجھے منظور ہو گا۔ محبت کرنے والے سوال نہیں کرتے بلکہ صرف محبت کرتے ہیں۔'' اس نے ایمان کو آتے ہوئے دیکھا تو خاموش ہو گیا۔

''راضی! پاکستان کے لئے ٹکٹیں کروالو، میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امریکہ چھوڑ رہی ہوں۔'' وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''راضی! اس امریکہ سے محبت کرنا بھی تم نے ہی سکھایا تھا اور آج تمہاری خاطر اس محبت کو بھی چھوڑ رہی ہوں۔ واصف سے میں نہیں پوچھوں گی کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ یہ میری کسی بات کو ٹالتے نہیں ہیں۔ واصف صاحب! کچھ محبتیں واقعی الفاظ کی محتاج نہیں ہوتیں اور وہ محبت تم مجھ سے کرتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری یہ محبت کس انتہا پر ہے۔'' وہ اٹھ کر دوبارہ کچن میں چلی گئی۔ ایسگارڈ بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن میں چلی گئی۔ باقی سارے کام آسان تھے۔

ایسگارڈ نے اگلے ہی دن پاکستان جانے کے لئے ٹکٹیں بک کرلیں۔ یہ تین دن بعد کی ٹکٹیں تھیں کیونکہ اس سے پہلے سبھی فلائٹس بک تھیں۔ ایمان نے اگلے دن کام سے استعفیٰ دے دیا اور واصف نے بھی ریسٹورنٹ اپنے ایک دوست کے حوالے کر دیا، بیچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہم ویسے ہی کوئی پیسہ اپنے ساتھ لے کر نہیں جا رہے تھے۔ ہم نے پاکستان میں زیرو سے سفر شروع کرنا تھا۔ چونکہ ابھی تین دن باقی تھے اس لئے ہم سب نیویارک سے بائی ایئر مونٹانہ آ گئے۔ چونکہ ایسگارڈ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاکستان جا رہی تھی اس لئے ایمان زور دے کر اسے مونٹانہ لے کر آئی تھی تا کہ وہ ایک بار اپنے ماں باپ سے مل لے اور اپنے گاؤں والی دوستوں سے بھی مل لے۔ اس کے بعد دوبارہ اس کے ماں باپ ہی پاکستان ملنے کے لئے آتے۔

دو دن ہم نے مونٹانہ میں ہی گھومتے ہوئے گزار دیئے۔ ایسگارڈ کی ایمان کے ساتھ بہت دوستی ہو گئی تھی اور وہ اسے سارا دن میرے والے جہاز میں بٹھا کر پورے علاقے کی ہوائی سیر کرواتی رہی۔ ایمان کے دونوں بچے بھی ایسگارڈ کے آگے پیچھے پھرتے رہتے تھے۔ میں اور واصف انکل کارٹر کے ساتھ کھیتوں میں گھسے رہتے۔ واصف کی مکران میں زرعی زمین تھی لیکن وہ کراچی میں ہی پلا بڑھا تھا۔ اسے کھیتی باڑی کا کوئی تجربہ نہیں تھا، بس وہ ٹائم گزارنے کے لئے ہمارے ساتھ ساتھ گھومتا رہا تھا۔ دو دن بڑی تیزی سے گزرے

اور ہمارے جانے کا وقت آ گیا۔ ایسگارڈ کے والد اور والدہ دونوں ہمیں ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئے۔ وہ ایسگارڈ سے ملے اور میری طرف آ گئے۔

''راضی یار! میری خواہش تھی کہ تم ادھر میرے پاس رہتے، میرا داماد نہیں بلکہ بیٹا بن کر۔۔۔ میرے اس کام کو تم سے بہتر اور کوئی نہیں سنبھال سکتا۔ بیٹا! کوشش کرنا کہ واپس آ سکو، یار! ہم بھی محبت کرتے ہیں تم سے اور چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔'' انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور ایمان کے بچوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''راضی! ایک بیٹی لے کر جا رہے ہو تو یہ دوسری بیٹی ہی مجھے دے جاؤ؟'' انہوں نے ایمان کی 8 سالہ بیٹی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ بھائی بہن کی جوڑی ہے، آپ دونوں کو کیسے علیحدہ کر سکو گے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ایسا کرو کہ پوری جوڑی ہی مجھے دے جاؤ؟ دونوں بچے بہت پیارے ہیں۔'' انہوں نے آگے سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''انکل! ان کی ماں بھی ہے۔''

''ایسا کرو کہ اسے بھی ادھر ہی رہنے دو۔ میرا گھر بھی بڑا ہے اور دل بھی۔۔۔ سب کے لئے جگہ ہے۔'' انہوں نے بالکل ہی مجھے لاجواب کر دیا۔

''ایسا کرتے ہیں انکل! آپ سب کو اپنے پاس رکھ لو اور صرف میں اور ایسگارڈ ہی چلے جاتے ہیں۔'' میری ہنسی مزید گہری ہو گئی۔

''انکل! ہم تو امریکہ نہیں آ سکتے لیکن آپ کیلئے تو ہمارا گھر ہمیشہ کھلا ہے۔ امریکیوں کو پاکستان جانے کیلئے کون سا ویزے کی ضرورت ہوتی ہے؟ آپ کا اپنا گھر ہے جب مرضی آ جائیں۔'' میں ان سے گلے ملا اور ایئرپورٹ کے مرکزی لاؤنج کی طرف بڑھنے لگا۔

ہیلینا کا چھوٹا سا ایئرپورٹ شہر سے باہر تھا۔ یہاں سے ہم نے پہلے نیویارک اور پھر نیویارک سے آگے پاکستان کی فلائیٹ پکڑی۔ یہ ڈائریکٹ فلائٹ نہیں تھی بلکہ پہلے ہم نیویارک سے براستہ لندن، دوبئ گئے اور پھر دوبئ سے آگے لاہور کی فلائیٹ پکڑ لی۔ نیویارک سے لاہور کی ڈائریکٹ فلائیٹ 15 گھنٹے کی تھی جس میں 9 گھنٹے کا ٹائم ڈفرنس بھی پڑتا ہے اور یہ 15 گھنٹے 24 گھنٹے بن جاتے ہیں۔ چونکہ ہم نے لندن اور

دوبئی میں اسٹے کیا تھا اس لئے ہمارا سفر 24 سے بڑھ کر 32 گھنٹے ہو گیا تھا۔ پاکستان میں مارچ کا بہت پیارا سا موسم تھا۔ گرمی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔

بہار کا موسم پاکستان میں بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ میں نے اپنے گھر میں آنے کا کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ اس لئے ایئرپورٹ پر کوئی بھی ہمیں لینے نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی لاہور سے بہاولپور بہت دور ہے۔ یہ ملتان سے ہوتے ہوئے 440 کلومیٹر کا سفر ہے اور اپنی گاڑی پر یہ سفر 6 گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ ہم نے ایک کیری ڈبہ کرایہ پر لیا اور کیری ڈبے میں بیٹھ کر بہاولپور آ گئے۔ ڈرائیور سے ہماری کلومیٹروں کے حساب سے بات ہوئی تھی۔ ڈرائیور بہت تیز تھا، وہ 6 کی بجائے پانچ گھنٹوں میں ہی ہمیں بہاولپور لے کر آ گیا۔ ہم بہاولپور سے مزید 32 کلومیٹر آگے یزمان اور اس سے بھی آگے روہی میں رہتے تھے۔ گاڑی یزمان سے آگے بڑھی اور روہی میں داخل ہوئی تو مجھے ریت سے اٹھنے والی خوشبو محسوس ہونے لگی۔

گھر کیسا بھی ہو آخر گھر ہی ہوتا ہے اور انسان کو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ میں نے گیارہ سال اس مٹی کی خوشبو کے بغیر گزارے تھے لیکن اس خوشبو کو کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔ یہ ہمیشہ سے میرے ذہن کے کسی گوشے میں چھپی رہتی تھی۔ آج جب روہی کے صحرا میں گاڑی اتری تو وہی خوشبو باہر آ گئی۔ میں نے اپنی طرف کا شیشہ کھولا اور ایک طویل سانس اپنے اندر کھینچنے لگا۔ شاید کہیں بارش ہوئی تھی اس لئے ریت کی خوشبو اور تازگی باقیوں کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ صحرا میں بارش کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ ہم صحرائی لوگ بارش کے لئے سارا سال انتظار کرتے رہتے ہیں۔ یہاں پورے سال میں صرف تین چار ہی بارشیں ہوتی ہیں اور یہی بارشوں کا پانی صحرا کے سبھی انسانوں اور جانوروں کے لئے آب حیات سے کم نہیں ہوتا۔ یہاں بارش ہی زندگی ہے۔ آج بھی شاید آسمان ہمارے آنے کی خوشی منا رہا تھا۔ پورے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش برس چکی تھی اور اب صحرا میں چلنے والی ہوا ٹھنڈک اور فرحت کا احساس دے رہی تھی۔

یزمان سے آگے سڑک چھوٹی تھی لیکن بالکل ٹھیک حالت میں تھی۔ یہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ سائیڈوں سے ریت سڑک پر آ جاتی تھی تو اس سے سڑک کے کنارے محفوظ رہتے تھے اور سڑک ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوتی تھی۔ ویسے بھی جب ٹریفک ہی نہ ہونے کے برابر ہو تو سڑک محفوظ ہی رہتی ہے۔ آزادی کے بعد پورا پاکستان ترقی کر گیا تھا لیکن ہمارا بہاولپور ابھی تک وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ بلکہ ہم لوگ پہلے سے زیادہ غریب ہو گئے تھے۔ ایریا کے لحاظ سے بہاولپور پنجاب کا سب سے بڑا ضلع ہے اور یزمان اس کی

سب سے بڑی تحصیل ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ پورے بہاولپور میں ایک بھی کارخانہ نہیں ہے۔ یہاں کے سبھی نوجوان مزدوری کے لئے کراچی، لاہور، سیالکوٹ، فیصل آباد اور دوسرے شہروں کا رخ کرتے ہیں۔

پنجاب کا سب سے بڑا ضلع جو پورے ریگستان پر مشتمل ہے، بے روزگار ہے۔ یہاں کے نوجوان روزگار کی تلاش میں دوسرے شہروں کے دھکے کھاتے ہیں۔ اتنی بے روزگاری کے باوجود بھی یہ پورے پاکستان کا سب سے پرامن علاقہ ہے۔ یہاں کوئی دہشت گردی کوئی جرم نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہم سندھ کے کچے کے علاقے سے صرف 150 کلومیٹر اور ڈیرہ بگٹی سے 200 کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ جوڑا کووٗں اور دہشت گردی کا گڑھ جانے جاتے ہیں۔

''ایسگارڈ! یزمان اور امریکہ میں ایک قدر مشترک ہے۔'' میں نے ایسگارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا! وہ کون سی چیز ہے جو یزمان اور امریکہ میں ایک جیسی ہے؟'' اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

کیری ڈبے میں موجود باقی بھی میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''کونسی بات ایک جیسی ہے امریکہ اور یزمان میں؟'' اس بار ایمان نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ ایسگارڈ کے پیچھے دونوں بچوں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ جبکہ آگے ڈرائیور کے ساتھ واصف بیٹھا ہوا تھا۔

''کونسی بات ہے راضی؟'' ایمان کا تجسس عروج پر پہنچ چکا تھا۔

''یزمان اور امریکہ دونوں مہاجر دوست ہیں اور دونوں جگہوں پر مہاجر رہتے ہیں۔ آپ پورے امریکہ میں کسی بھی شہر یا گاؤں کے کسی باشندے سے پوچھیں گے تو اس کا اصل ملک امریکہ نہیں ہو گا بلکہ اس کے آباؤ اجداد یورپ یا افریقہ کے کسی ملک سے اٹھ کر آئے ہوں گے۔ امریکہ کے سبھی گورے انگلینڈ، سپین، جرمنی یا فرانس سے آئے ہوں گے۔ اسی طرح پورے یزمان میں آپ کو کوئی بھی ایسا فرد نہیں ملے گا جو اصل میں یزمان کا رہنے والا ہو۔ پورے یزمان میں جتنے بھی لوگ آباد ہیں ان کے آباؤ اجداد سندھ اور بالائی پنجاب کے علاقوں سے اٹھ کر ادھر آئے ہوں گے۔''

بہاولپور کے اصل لوگ سرائیکی ہیں جو آپ کو یزمان تحصیل کے علاوہ پورے بہاولپور اور لودھراں ڈویژن

میں ملیں گے۔ یہ سرائیکی خطہ میانوالی سے شروع ہوتا ہے اور نیچے صادق آباد تک جاتا ہے۔ اس میں صرف یزمان ہی وہ واحد تحصیل ہے جو مکمل طور پر پنجابی ہے۔ پنجاب کے سب سے بڑے ضلع کی سب سے بڑی تحصیل میں سارے ہی مہاجر رہتے ہیں۔ امریکہ اور یزمان دونوں ہی مہاجرین کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔ میرے ماں باپ بھی سیالکوٹ سے ہجرت کر کے ادھر آئے تھے۔

یزمان سے آگے سیدھا ہی روڈ تھا، اس لئے ڈرائیور کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا گاؤں مرکزی سڑک سے ایک کلومیٹر ہٹ کر تھا۔ وہاں تک جانے کے لئے ایک تو کچا راستہ تھا جو نہر کے ساتھ ساتھ جاتا تھا اور یہ شارٹ کٹ بھی تھا۔ پیدل جانے والے اسی راستے پر گاؤں جاتے تھے۔ دوسرا راستہ تھوڑا آگے جا کر تھا۔ یہ پکی سڑک تھی جو ہمارے گاؤں کے سرے سے ہوتی ہوئی آگے چانن پیر تک جاتی تھی اور پھر وہاں سے آگے پورا ریگستان تھا۔ آخری آبادی چانن پیر تک ہے، اس کے بعد 100 کلومیٹر کا ریگستان ہے اور یہاں کوئی بھی انسانی آبادی نہیں ہے۔ صرف کچھ مقامی چرواہے ہوتے ہیں جو اس ریگستان کی جھاڑیوں میں گائے اور بکریاں چراتے ہیں۔

ریگستان 100 کلومیٹر کے بعد ختم نہیں ہوتا بلکہ آگے انڈیا کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ انڈین سرحد سے مزید آگے 100 کلومیٹر پر جیسل میر ہے۔ سرحد کی دوسری طرف بھی ریگستان ہے جسے راجھستان کہتے ہیں۔ یہ سارا صحرا راجھستان ہی ہے جو پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ پنجاب میں آنے والے صحرا کو روہی جبکہ سندھ میں آنے والے صحرا کو تھر کہتے ہیں، جو نیچے انڈین گجرات تک جاتا ہے۔ یہ ایک ہی ریگستان ہے جو ڈھول پور سے شروع ہوتا ہے اور پاکستان کے شہر بدین تک آتا ہے۔ اس کی لمبائی ایک ہزار کلومیٹر بنتی ہے۔ یہ سارا راجھستان کا علاقہ ہے۔ رحیم یار خان اور صادق آباد کی 60 کلومیٹر کی چھوٹی سی نخلستانی پٹی اسے بلوچستان کے صحرا سے الگ کرتی ہے، جو اس خطے کا سب سے بڑا صحرا ہے۔ یہ نخلستانی پٹی اصل میں دریائے سندھ کی گزرگاہ ہے۔ یہاں سے دریائے سندھ گزرتا ہے اور اسی وجہ سے یہ علاقہ نخلستان بن گیا ہے۔

گاڑی ہمارے گاؤں کے نزدیک پہنچی تو میں نے ڈرائیور کو راستہ بتایا اور اس نے گاڑی مین روڈ سے اتار کر ہمارے گاؤں کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دی۔ یہ صرف ایک کلومیٹر کا سفر تھا اور گاڑی کو گھر تک پہنچنے تک دو منٹ بھی نہیں لگے۔ ہمارا گھر گاؤں کے بالکل درمیان میں تھا۔ میں نے ڈرائیور کو گلی بتائی اور وہ ہمیں لے کر گھر پہنچ گیا۔ یہ چھوٹا سا گھر تھا جس کا بہت بڑا لوہے کا گیٹ تھا جو ٹریکٹر کے اندر جانے کے لئے

تھا۔ یہاں گاڑیاں گھروں کے اندر ہی کھڑی کی جاتی ہیں۔ ہمارے گھر کے سامنے جو نمبرداروں کا بہت بڑا احاطہ تھا وہاں اب ایک بہت بڑی کوٹھی بن گئی تھی۔ ویسے بھی یہ بہت بڑا احاطہ تھا اور اس کی تین سائیڈوں پر گلی لگتی تھی۔ اس سے آگے دوسری طرف ہمارا 10 مرلے کا گھر تھا۔ جس کی ایک طرف پر بیٹھک، دوسری طرف باتھ روم اور درمیان میں بہت بڑا لوہے کا گیٹ۔۔۔ گھر کے اندر پورا صحن تھا اور صحن کے بعد ایک برآمدہ اور اس کے پیچھے دو کمرے۔ میرے جانے کے بعد ابو نے گھر میں دو کمرے چھت پر مزید ڈال کر گھر کو ڈبل سٹوری بنالیا تھا۔

ہم گاڑی سے نیچے اترے تو میں نے ڈرائیور کو کرایہ دیا اور کچھ اضافی پیسے دیئے تاکہ راستے میں کھانا وغیرہ کھالے۔ ہم نے اپنے بیگ وغیرہ گاڑی سے اتار لئے تو وہ ادھر سے ہی واپس چلا گیا۔ ابھی دوپہر کا ہی وقت ہوا تھا۔ گلی سے گزرنے والے لوگ ہمیں دیکھ کر رک رہے تھے۔ لوگوں نے مجھے اور ایمان دونوں کو پہچان لیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی اور باہر ہی کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ دروازہ کھلا تھا لیکن مجھے اپنے ہی گھر میں بغیر اجازت کے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''کون ہے بھائی؟'' ابو کی آواز گھر کے اندر سے آئی۔ اس وقت وہ گھر پر ہی تھے اس لئے دروازہ کھولنے آ گئے۔

''کون ہے بھائی؟ آواز کیوں نہیں دے رہے؟'' ابو کی آواز ایک پھر میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''ابو۔۔۔'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ اس سے آگے میرے پاس اور کوئی الفاظ ہی نہیں تھے۔ ابو نے میری آواز پہچان لی تھی اور انہوں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

''راضی۔۔۔!'' میں سامنے ہی کھڑا تھا۔

''راضی! کیسا ہے یار؟'' میں آگے بڑھا اور ان کے گلے لگ گیا۔

''ابا! مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں نے بہت غلطیاں کی ہیں، بہت ستایا ہے آپ لوگوں کو، مجھے معاف کر دو۔'' میں ان کے گلے لگا روتا رہا۔

''نہیں راضی! غلطیاں تو ہم نے کی ہیں۔۔۔ ہم تمہارے جذبات کو سمجھ ہی نہیں سکے۔ معافی تو ہمیں تم سے مانگنی چاہیے۔'' انہوں نے مجھے کمر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''ابو جی! معافی تو مجھے بھی آپ سے مانگنی ہے۔'' ایمان کا رخ ایسگارڈ کی طرف تھا۔ وہ اس سے بات

کررہی تھی اس لئے ابو پشت سے ایمان کو پہچان نہیں سکے۔اب وہ سیدھی ہوکر ہمارے پاس آ گئی تھی۔

''ابا! کیا مجھے بھی معاف کردو گے؟'' اس نے دوبارہ کہا تو ابو میری بانہوں میں ہی کانپ کررہ گئے۔

''ایمان۔۔۔'' وہ مجھ سے الگ ہوئے تو لڑکھڑا گئے۔گرنے ہی والے تھے لیکن میں نے بروقت ان کا کندھا پکڑ کر انہیں سہارا دیا۔

''ایمان!'' انہوں نے ایمان کے آگے ہاتھ باندھ دیئے۔آواز ان کے گلے میں ہی اٹک گئی تھی۔ ایمان آگے بڑھی تو وہ ادھر ہی اس کے پیروں میں بیٹھتے چلے گئے۔میں نے ان کا کندھا پکڑا ہوا تھا۔وہ نیچے کی طرف بیٹھے تو میں بھی ان کے ساتھ جھکتا چلا گیا۔ایمان جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔

''نہیں ابو! یہ مت کریں، باپ کبھی بھی اپنی بیٹی کے پیروں میں نہیں بیٹھتے۔میری تو جنت آپ کے قدموں میں ہے۔کیوں اس جنت کو مجھ سے دور کررہے ہیں؟'' وہ بھی ادھر ہی ان کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے ابو کے پیر پکڑ لئے۔

''نہیں ایمان!نہیں! میں اس قابل نہیں ہوں جو تجھے اپنی بیٹی کہہ سکوں۔میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی اور اس کی سزا تم دونوں بچوں کو ملی۔آج معافی بھی مجھے ہی مانگنی ہوگی اور میں تب ہی ادھر سے اٹھوں گا جب تم مجھے معاف کردوگی۔بیٹی! میں تو معافی کے قابل بھی نہیں ہوں، میرا گناہ بہت بڑا تھا لیکن یقین کرو کہ تم دونوں کے ساتھ ساتھ سزا میں نے بھی کاٹی ہے۔ایک اچھی اور گہری نیند سوئے ہوئے مجھے بھی گیارہ سال ہوگئے ہیں۔مجھے معاف کردو بیٹی! میں نے تم سے بہت زیادتی کی ہے۔ہر رات مجھے یہ سوچ کر نیند ہی نہیں آتی تھی کہ اگر میں تم سے معافی مانگے بغیر مر گیا تو میرا کیا ہوگا۔اس زندگی میں صرف ایک بار تم سے ملنا چاہتا تھا اور تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔'' وہ زمین پر بیٹھے روتے چلے جارہے تھے۔

''اٹھ جاؤ ابو! میں کسی سے ناراض نہیں ہوں، میرے ساتھ کسی نے زیادتی نہیں کی ہے۔میں سب سے خوش ہوں۔'' وہ کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابو کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بھی اوپر اٹھالیا۔ابو کھڑے ہوئے اور ایمان سے لپٹ گئے۔

''بیٹی! تم بہت بہادر ہو۔تمہارے جیسی بیٹیاں قسمت والوں کو ملتی ہیں۔'' ابو اب نارمل ہوگئے تھے۔

''راضی اور اریج ادھر آؤ! یہ تمہارے نانا ابو ہیں۔'' ایمان نے اپنے بچوں کو بلایا اور انہیں ابو کے سامنے کردیا۔اس نے لڑکی کا نام اریج اور لڑکے کا نام میرے نام پر رضوان رکھا تھا۔

''اوہ! تو ہمارے چھوٹے شہزادے کا نام راضی ہے؟ بہت پیارا نام ہے۔ خدا اس کی قسمت اچھی کرے۔'' ابو نے اس کا گال چومتے ہوئے کہا۔

''ابو! یہ ایسگارڈ ہے۔۔۔میری بیوی۔'' میں نے ایسگارڈ کا تعارف کروایا تو وہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ مجھے تھوڑی حیرت ہوئی لیکن انہوں نے کوئی بھی ردعمل نہیں دیا تھا۔

''کیسی ہو ایسگارڈ بیٹی! اور تمہارے ابو امی کیسے ہیں؟'' انہوں نے اردو میں ایسگارڈ سے حال احوال پوچھا تو میری حیرت مزید بڑھ گئی۔

''ابو! آپ کو کیسے پتا ہے کہ یہ اردو جانتی ہے اور اس کے امی ابو۔۔۔کیا آپ کی پہلے بھی اس سے بات ہوئی ہے؟'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اندر چلو! سب سمجھ میں آ جائے گا۔'' ہم گھر میں داخل ہو گئے۔ سامنے صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر امی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں دروازے سے اندر داخل ہوا تو وہ جلدی سے چارپائی سے اٹھ گئیں۔

''راضی! میرا بیٹا! راضی تو آ گیا میرے بچے۔۔۔'' وہ ابھی چارپائی سے کھڑی ہی ہوئی تھیں جب میں بھاگ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

''امی! آپ کیسی ہیں؟'' میں ان کے گلے لگ کر ان کا حال پوچھنے لگا۔

گھر میں دو اور بھی عورتیں تھیں اور چار بچے تھے۔ یہ طارق اور فاروق بھائی کی بیویاں تھیں۔ دونوں بھائیوں کی شادی ہو گئی تھی۔ طارق بھائی کے تین بچے تھے جن میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں جبکہ فاروق بھائی کی ایک لڑکی تھی۔ سب سے چھوٹا عامر ابھی کنوارہ تھا۔ اس کی منگنی ہو گئی تھی لیکن شادی نہیں ہوئی تھی۔ میری چھوٹی بہن ارم کے دو بچے تھے اور دونوں ہی بیٹیاں تھیں۔ ابو نے فون پر میرے آنے کی اطلاع دی تو وہ ایک گھنٹے میں ہی دونوں بچوں اور میاں کے ساتھ آ گئی۔ وہ قریب ہی دوسرے گاؤں میں رہتے تھے جو ہمارے گاؤں سے تین کلومیٹر دور تھا۔ ارم سے پہلے دونوں بھائی بھی گھر آ گئے تھے۔ وہ بھی ابو کے ساتھ کھیتوں پر ہی کام کرتے تھے۔

عامر لاہور میں ہوتا تھا اور وہاں کمپیوٹر انجینئرنگ کر رہا تھا۔ ابو نے اسے بھی فون کر دیا تھا اور وہ اب ویک اینڈ پر ہی آتا۔ میں نے ابو سے فون لے کر اس سے بات کر لی تھی اور ایمان کی بھی بات کروا دی تھی۔ عامر اور ایمان کی آپس میں بہت بنتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ عامر تو اسی

وقت ہی آنا چاہتا تھا لیکن ابو نے روک دیا۔ دو دن بعد ہی ویک اینڈ تھا، اس کی دو دن کی کلاسز مس ہو جاتیں۔ اس نے مجھ سے صرف دو منٹ اور ایمان سے پورا آدھا گھنٹہ بات کی تھی۔ ان کی بات بھی تب ختم ہوئی تھی جب ارم نے زبردستی ایمان سے فون لیا تھا۔ وہ بھی ایمان سے بات کرنا چاہتی تھی۔

''ابو! چائے پیو گے نا؟ ہم دونوں چائے بنا کر لاتی ہیں۔'' ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے جب ایمان نے ابو کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔

پورا گھر اچانک ایمان کی بات سن کر چپ ہو گیا۔ پرانی یادیں ایک بار پھر تازہ ہو گئی تھیں۔ ابو نے ایمان کے جانے کے بعد کبھی چائے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا بلکہ گھر والے ابو کے سامنے چائے بھی نہیں بناتے تھے۔ ہمارے گھر کے کچن میں ہی خاموشی سے چائے بنتی تھی اور ادھر ہی سبھی پی لیتے۔ ابو نے کبھی کسی کو منع نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی سبھی کو معلوم تھا کہ ابو کو اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس لئے وہ ان کے سامنے چائے نہیں پیتے تھے۔ ایمان کی چائے والی بات سن کر سبھی گھر والے چپ ہو گئے۔

''ہاں بیٹی! ضرور بناؤ، میں اپنی بیٹی کے ہاتھ سے بنی ہوئی چائے پیوں گا۔'' انہوں نے ایمان کے سر پر ہاتھ رکھا اور ارم اور ایمان دونوں کچن میں چائے بنانے چلی گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے عائشہ بھابھی بھی کچن میں چلی گئیں۔ پندرہ بیس منٹ تک چائے بن کر آ گئی تو سارے گھر والے بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ ابو نے بھی ایمان کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیا اور پینے لگے۔

''ایمان! اپنا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات دو!'' میں نے چائے کا کپ خالی کیا اور ایمان سے پاسپورٹ مانگنے لگا۔ ایمان اٹھی اور ایک چھوٹے سے بیگ سے کاغذات نکالنے لگی۔ اس میں سبھی کے پاسپورٹ، بینک کارڈ اور میڈیکل کارڈ تھے۔ اس نے ساری چیزیں نکالیں اور ایک لفافے میں ڈال کر مجھے پکڑا دیں۔

''ایسگارڈ! تمہارے کاغذات؟'' میں نے ایسگارڈ کی طرف دیکھا تو وہ پہلے ہی سبھی کاغذات ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔ میں نے اس سے بھی پاسپورٹ لیا، اس کے ساتھ اپنا پاسپورٹ رکھا اور اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگا۔ میرا ارادہ ان کاغذات کو جلانے کا تھا۔

''راضی! کاغذات کو لے کر کدھر جا رہے ہو؟'' ابو نے مجھے کچن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی میرے پیچھے آ گئے۔

''کچھ نہیں ابو! آپ ادھر بیٹھو جا کر۔۔۔ میں ایک منٹ میں آیا۔'' میں نے ابو کو واپس جانے کا کہا لیکن وہ میرے پیچھے پیچھے آ گئے۔ میں کچن میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''بیٹا! کاغذات کہیں رکھنے ہیں تو مجھے دے دو۔۔۔ میں صندوق کے اندر حفاظت سے رکھ دیتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ یہ بہت قیمتی کاغذات ہیں۔ ادھر کچن میں ان کو رکھنے کے لئے کوئی بھی جگہ نہیں ہے۔ میں صندوق میں رکھ کر تالہ لگا دوں گا۔'' انہوں نے پاسپورٹ والا لفافہ مجھ سے لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ابو! آپ فکر مت کریں، میں انہیں سنبھال کر رکھ لوں گا۔'' مجھے معلوم تھا کہ ابو کبھی بھی ان کاغذات کو جلانے نہ دیتے، اس لئے میں واپس کچن سے باہر آ گیا۔

''راضی! کاغذات دے دو یار، اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہیں ہے تم کو؟'' انہوں نے لفافے کو میرے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ میں نے جلدی سے جھٹکا دیا اور واپس لفافہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔

''ابو! میں نے بولا ہے نا کہ میں انہیں سنبھال لوں گا، آپ فکر مت کرو!'' میری آواز تھوڑی اونچی ہو گئی۔ صحن میں دوسرے بھی ہماری طرف دیکھنے لگے۔

''ٹھیک ہے یار! غصہ کیوں کرتے ہو؟ میں تو ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو ٹھیک ہے تمہاری مرضی، تم انہیں جہاں مرضی رکھ لو۔'' انہوں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو میں واپس کچن میں چلا گیا اور لائٹر تلاش کرنے لگا۔ وہ نیچے دراز میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے سارے کاغذات اور پاسپورٹ کچن کے واش بیسن میں رکھے اور لائٹر کو ہاتھ میں پکڑ کر اسے جلا لیا۔ لائٹر کا شعلہ بہت چھوٹا تھا اس لئے میں نے ایک کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا اور پہلے اسے آگ لگانے لگا۔ اس سے پہلے کہ لائٹر کا شعلہ کاغذ کو پکڑتا۔ ابو نے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟'' انہوں نے قدرے غصے سے کہا۔

''ابو! میں ان کاغذات کو جلانے لگا ہوں، ہم میں سے کوئی بھی واپس امریکہ نہیں جائے گا۔ اسی گاؤں میں رہیں گے اور ادھر ہی کھیتوں میں کام کریں گے۔'' میں نے ان کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ تم واپس نہیں جانا چاہتے تو نہ جاؤ لیکن دوسروں کو کیوں روک رہے ہو؟ ایسگارڈ تو امریکہ کی ہے وہ کیسے واپس جائے گی؟'' انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔ انہیں ابھی تک پوری بات کا پتہ

نہی تھا۔

''ابو! یہی طے ہوا ہے۔۔۔ ایمان اگر واصف کے ساتھ رہے گی تو اسے امریکہ چھوڑنا پڑے گا۔'' میں کچن میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہے، وہ تمہارا دونوں کا معاملہ ہے۔۔۔ ایسگارڈ کا پاسپورٹ کیوں جلا رہے ہو؟ واصف کا پاسپورٹ بھی مان لیتا ہوں، اسے ایمان مل رہی ہے مگر ایمان کے دونوں بچوں کا کیا قصور ہے؟ راضی! تم اپنی محبت میں ان تینوں کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ ایمان کی محبت تیرے اور واصف کے درمیان بٹی ہوئی ہے لیکن باقی تینوں کا کیا قصور ہے؟ تم ان کے پاسپورٹ کیوں جلا رہے ہو؟''

''ابو! بچے ماں باپ کے بغیر تو نہیں رہ سکتے ہیں نا؟'' مجھے اب بھی ابو کی بات پر اعتراض تھا۔

''راضی! یہ ان کی زندگی ہے، تم کون ہوتے ہو فیصلہ کرنے والے؟ ان کو بڑا ہونے دو اور پھر ان کی مرضی پر چھوڑ دو۔ وہ پاکستان میں رہیں یا امریکہ۔۔۔ وہ بڑے ہو کر خود ہی فیصلہ کر لیں گے۔''

''ٹھیک ہے ابو، مگر ایسگارڈ تو جوان ہے اور اس نے اپنی مرضی سے فیصلہ کیا ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی ہمیشہ ہمیشہ یہاں پاکستان میں ہی رہے گی۔ اس نے محبت کی ہے تو اسے بھی قربانی دینی ہوگی۔'' میں راضی اور ارتیج کے معاملے پر جان گیا لیکن ایسگارڈ کے پاسپورٹ پر اڑ گیا۔

''راضی! پچھلے تین سال سے وہ اور کیا کر رہی ہے، قربانی ہی تو دے رہی ہے؟ ورنہ کون سی ایسی لڑکی ہو گی جو اپنا ماں باپ، ملک اور پیسہ سب کچھ چھوڑ دیتی ہے؟ وہ ڈاکٹر ہے اور تم کیا ہو؟ تمہارے پاس کیا ہے؟ ایک محبت ہی تو ہوتی ہے اور وہ بھی تم ایمان سے کرتے ہو۔ وہ بے چاری تو پھر بھی تمہارے ساتھ چلتے ہوئے یہاں تک آ گئی ہے۔ راضی بیٹا! قربانی اور کیا ہوتی ہے؟ اپنا سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ ہمارے گھر میں کھڑی ہے اور مستقبل کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ اگر کل کو تم ایمان سے شادی کر لیتے ہو تو اس بے چاری کا کیا ہوگا؟ جواب دو مجھے۔۔۔ کوئی گارنٹی ہے تمہارے پاس اس کے مستقبل کی؟'' وہ بھی پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

''راضی بیٹا! فیصلے جلدی بازی میں نہیں کرتے۔ تم یہاں اس گاؤں میں رہنا چاہتے ہو تو بالکل رہو، کھیتوں میں کام کرنا چاہتے ہو کرو۔ اپنی ان محبتوں کو تھوڑا ٹائم دو اور دیکھو کہ آنے والے حالات کیسے ہوتے ہیں۔ پھر ان حالات کو دیکھ کر جو تمہارا دل کرے وہی فیصلہ کر لینا۔ آخری فیصلہ تمہارا ہوگا اور ہم سب اسے ماننے کے پابند ہیں۔'' وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور باہر جانے لگے۔

''راضی! میں مانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔تمہاری زندگی کے 16 سال ہم لوگوں نے چھینے ہیں۔اس کا کفارہ شاید ہم ساری زندگی بھی نہیں ادا کر سکتے۔ بیٹا! مانتا ہوں کہ ہم سب سے غلطی ہوئی ہے لیکن ہم سب کوئی غیر تو نہیں ہیں؟ تمہارے اپنے ہیں اور اپنوں سے بدلہ نہیں لیتے بلکہ انہیں معاف کر دیتے ہیں۔ بیٹا! مجھے بھی معاف کر دو اور ایمان کو بھی۔۔۔اس بے چاری نے بہت دکھ سہے ہیں۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر چلے گئے جبکہ میں ادھر ہی کرسی پر بیٹھا رہ گیا۔

''ماموں! آپ ادھر اکیلے کیوں سیڈ سیڈ بیٹھے ہو؟'' ارم کا چھوٹا بیٹا کچن میں میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ماموں! سیڈ ہونا اچھی بات نہیں ہے۔'' اس نے میری انگلی پکڑ کر کہا۔میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔دل زور زور سے اور چیخ چیخ کر رونے کو کر رہا تھا لیکن اس بچے کے سامنے میں رو نہیں سکتا تھا۔

''بیٹا! میں ٹھیک ہوں،تم باہر جاؤ! مجھے کچن میں تھوڑا کام ہے۔'' میں نے اسے باہر بھیجا اور ادھر ہی بیٹھ کر رونے لگا۔

''راضی!'' کچن کا دروازہ کھلا اور اس بار ایمان اندر آئی۔اس نے کچن کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئی۔

''راضی! رونا چھوڑ دو یار،تمہاری اس تکلیف سے مجھے بہت درد ہوتا ہے۔یار! میں تجھے یوں بکھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ پلیز راضی! تمہاری یہ محبت اب بہت درد دینے لگی ہے۔مجھ سے تمہاری یہ تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ایمان نے اپنی زندگی میں سب کچھ ہی برداشت کیا ہے لیکن کبھی بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔آج تمہاری یہ بے بسی مجھے اندر سے کاٹ رہی ہے۔پلیز راضی! سنبھل جاؤ،اس سے پہلے کہ میں مر جاؤں۔'' وہ میر گود میں سر رکھے سسک رہی تھی۔

''راضی! تمہارا یہ درد میری جان لے لے گا۔آج تک تم نے ہی کلائیاں کاٹی ہیں لیکن ایک دن اس ایمان کی بھی کلائی کٹی ہو گی۔تمہاری قسم راضی! اب تو زندگی کی خواہش ہی ختم ہو گئی ہے۔'' ایمان کی بات سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔میں جس سے محبت کرتا تھا اسی کی زندگی تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔واقعی میں محبت میں بہت خود غرض ہو گیا تھا۔مجھے تو ایسگارڈ کی طرح ہونا چاہیے تھا جو ہمیشہ میری خوشی میں ہی خوش تھی،جس کی اپنی کوئی خواہش نہیں تھی،جس کی اپنی کوئی زندگی نہیں تھی۔

''ایمان!'' میں نے اس کا سر اپنی گود سے اٹھایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ایمان! میں نے تجھے اپنی محبت سے آزاد کیا۔۔۔اس راضی نے تم سے محبت کرنا ہی چھوڑ دی ہے۔ واش بیسن میں تمہارے سبھی کاغذات پڑے ہوئے ہیں۔آج سے تم آزاد ہو، میں تمہیں اپنی محبت سے آزاد کرتا ہوں۔میری منزل تم نہیں بلکہ ایسگارڈ تھی، میری محبت تو باہر بیٹھی ہوئی ہے۔یہ میری غلطی تھی جو میں اس محبت کو پہچان ہی نہیں سکا۔جاؤ ایمان! جہاں جانا چاہتی ہو چلی جاؤ۔راضی نہ اس دنیا میں تمہارا ہے اور نہ اس دنیا میں تمہارا ہو گا۔خدا نے مجھے بنایا ہی ایسگارڈ کے لئے تھا اور وہی میری محبت ہے۔'' میں نے کچن کا دروازہ کھولا اور باہر آ گیا۔

سامنے صحن میں سارے گھر والے پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔سبھی کے چہرے اداس تھے اور سبھی خاموشی سے میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا اور گھر میں ٹیوب لائٹ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

''ابو! ٹریکٹر کی چابی دو، میں نے ابھی ڈیرے جانا ہے۔'' میں نے ابو سے چابی مانگی تو وہ جلدی سے اٹھے اور اندر کمرے سے چابی لا کر دے دی۔

''بیٹا! پلیز کوئی غلط قدم مت اٹھانا، ہم سب تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔صرف کچھ دن ٹائم دو، حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔بیٹا! یہ چھوٹے چھوٹے بچے دیکھو۔۔۔یار پلیز! کچھ غلط مت کرنا۔'' ابو نے میرے آگے ہاتھ باندھ دیئے۔

''نہیں ابو! ایسی کوئی بات نہیں، میں ٹھیک ہوں اور کچھ بھی نہیں کروں گا۔صرف ایسگارڈ کو اپنا ڈیرہ دکھانا چاہتا ہوں۔''

''چلو ایسگارڈ! ڈیرے پر چلتے ہیں۔'' میں نے ایسگارڈ کا ہاتھ پکڑا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

''راضی! ایسگارڈ تمہارے ساتھ جائے گی تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔مجھے بھی ڈیرے پر کچھ کام ہے۔'' ابو بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''ایسگارڈ! سرائیکی زبان جانتی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔وہ صرف اردو ہی جانتی تھی۔

''چلو شکر ہے، اگر کوئی راز کی بات کہنی ہو تو بندہ کہہ سکتا ہے۔'' اس بار میں نے سرائیکی میں کہا جسے

ایسگارڈ اور واصف کے علاوہ سبھی سمجھتے تھے۔

”ابو! شادی کے لئے کوئی اچھا سا دن رکھ لیں، میں صحیح اسلامی طریقے سے ایسگارڈ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے سرائیکی لہجے میں کہا تو پورا گھر ہی خوشی سے مسکرانے لگا۔ ایمان بھی ابو کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ابو نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ابو مطمئن ہو گئے۔

میں نے ٹریکٹر سٹارٹ کر کے گھر سے باہر نکالا اور ایسگارڈ کو لے کر ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ ہمارے ڈیرے سے کوئی دو کلومیٹر آگے ریگستان شروع ہو جاتا تھا۔ میں ڈیرے کی بجائے ریگستان میں آ گیا۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا اور اس کی روشنی سے سارا صحرا منور ہو رہا تھا۔ میں نے ٹریکٹر ریت کے ایک اونچے ٹیلے پر چڑھایا اور اسے بند کر کے ایسگارڈ کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے اتار لیا۔ وہ نیچے اتری تو ہم دونوں پیدل چلتے ہوئے ایک دوسرے ٹیلے کی طرف چلے گئے۔

”ایسگارڈ! مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”راضی! محبت کی شدت کا تو پتہ نہیں ہے لیکن تمہارے لئے جان دے سکتی ہوں۔“ وہ بھی برابر میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”شادی کرو گی مجھ سے؟“ میں نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”راضی! تمہاری اور میری تو پہلے ہی شادی ہو چکی ہے!“ وہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ رہی تھی۔

میں اس کے سامنے ریت پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور جیب سے ایک انگوٹھی نکال کر اس کے سامنے کر دی۔

”ایسگارڈ! وہ کاغذی شادی تھی اور یہ محبت کی شادی ہو گی۔ مجھے بھی تم سے محبت ہو گئی ہے ایسگارڈ! اور دل سے تجھے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔“ میں انگوٹھی کا کیس کھول کر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہی انگوٹھی تھی جو میں نے نیویارک میں ایمان کے لئے خریدی تھی اور آج ایسگارڈ کو دے رہا تھا۔

”ایسگارڈ! میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا، ہمیشہ تمہاری عزت کرتا رہوں گا اور تمہیں چھوڑ کر کبھی بھی کہیں نہیں جاؤں گا۔“ میری آنکھیں مسلسل اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ایسگارڈ! مجھ سے شادی کرو گی؟“ میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں تو اس نے جلدی سے میرے آگے ہاتھ کر دیا۔

”ہاں راضی! میں تم سے شادی کے لئے تیار ہوں، دل و جان سے میں تمہاری ہوں اور تمہارے نام

ہونا چاہتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں نے کیس سے انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہنا دی۔

''سوری ایسگارڈ! ان سب چیزوں کیلئے سوری جن چیزوں سے تمہارا دل دکھا ہو۔'' وہ ایک قدم آگے بڑھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ 17 سال پہلے شروع ہونے والی محبت کی یہ داستان آج اپنی منزل پر پہنچی تھی۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ بیٹا! خدا کے فیصلے ہمیشہ صحیح ہوتے ہیں۔ وقتی طور پر ہمیں اچھے نہیں لگتے، ایسا لگتا ہے جیسے خدا ہم سے محبت نہیں کرتا لیکن ہم غلط ہوتے ہیں۔ خدا کبھی اپنی مخلوق کا برا نہیں سوچتا۔ ہم دنیاوی محبت میں پڑ کر اپنی اصل محبت بھول جاتے ہیں۔

''ایسگارڈ! شادی کے بعد رہنا کہاں ہے، پاکستان یا امریکہ؟'' میں نے اوپر سر اٹھا کر ایسگارڈ کی طرف دیکھا۔

''تمہاری مرضی ہے راضی! جدھر رکھو گے ادھر ہی رہوں گی، بس! تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ محبت کرنے والے سوال نہیں کرتے بلکہ آنکھیں بند کرتے ہیں اور ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ میں نے تمہارا ہاتھ پکڑا ہے راضی! جدھر چاہو گے ادھر جاؤں گی۔ بس ایک التجا ہے اپنی اس ایسگارڈ کا ہاتھ مت چھوڑ دینا! محبت کرتی ہوں تم سے۔۔۔ اگر چھوڑ گئے تو مر جاؤں گی۔'' اس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''ایسگارڈ! ہم راجھستانی لوگ ہیں۔۔۔ ہماری رگوں میں راجھستانی خون دوڑتا ہے، ہم مر جاتے ہیں مگر ساتھ نہیں چھوڑتے۔ میری منزل تم تھی ایمان نہیں تھی۔ وہ تو صرف ایک راستہ تھی تم تک پہنچنے کا۔۔۔ اور میں اس راستے کو ہی منزل سمجھ بیٹھا تھا۔'' میں بھی اس کے ساتھ لپٹ گیا۔

آسمان پر چمکتا ہوا چاند آج روہی کے صحرا میں کچھ اور ہی بہار دکھا رہا تھا۔ مجھے اس ریت کی خوشبو سے محبت تو بہت پہلے ہی تھی لیکن آج ایسگارڈ کی موجودگی اس خوشبو کو اپنی انتہا تک پہنچا رہی تھی۔ مجھے روہی سے عشق تھا اور آج ایسگارڈ سے بھی عشق ہو گیا تھا۔ اندھیری رات میں ایسگارڈ کا سفید چہرہ چمک رہا تھا۔ میں نے اس کی شرٹ پکڑ کر اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ وہ بالکل میرے سامنے بیٹھ گئی اور میں اس کے سفید چہرے اور اس پر موجود بڑی بڑی سبز آنکھوں کے سحر میں کھونے لگا۔

اس نے اب بھی سرخ لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے سرخ ہونٹ پسند ہیں، اس لئے وہ ہر وقت ہی اپنے ہونٹوں کو سرخ رکھتی تھی۔ سفید چہرے پر سبز آنکھیں اور سرخ ہونٹ۔۔۔ روہی کے سحر

انگیز حسن کی چکا چوند خوبصورتی ایسگارڈ کی خوبصورتی کے آگے ماند پڑ چکی تھی۔ وہ جنت سے آئی ہوئی کوئی حور ہی تھی اور اس کا حسن آج اس پورے راجھستان کو خوبصورتی سے منور کر رہا تھا۔ پورا راجھستان۔۔۔ بارڈر کے اس طرف بھی اور بارڈر کے اس طرف بھی۔ آج ریت کا ایک ایک ذرہ اس کے حسن سے چمک رہا تھا۔

''ایسگارڈ! تم بہت خوبصورت ہو۔ خدا کی بنائی ہوئی اس پوری کائنات سے بھی زیادہ خوبصورت ہو۔'' میں نے اس کے گالوں پر ہاتھ رکھا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔ ان سترہ سالوں میں آج پہلی بار محبت مزا دے رہی تھی۔ میں نے اس کی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور اس کے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''راضی! جب ہماری شادی ہو رہی ہے تو پھر کچھ دن انتظار کر لو! ایسگارڈ ساری کی ساری تمہاری ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک میرے جسم کا ایک ایک حصہ تمہارا ہے اور تم ہی اس کے مالک ہو، لیکن یہ سب کچھ سہاگ رات والے دن ہی ملے گا۔ آج سے تم اور میں الگ الگ۔۔۔ جلدی سے شادی کرو اور دلہن بنا کر لے جاؤ۔ شادی سے پہلے ان چیزوں کے بارے میں سوچنا بھی مت!'' وہ مجھ سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

''شادی تو ہماری ہو چکی ہے، اب کون سی شادی باقی ہے؟'' میں دوبارہ اس کے پاس پہنچا تو وہ ٹیلے سے نیچے اترنے لگی۔

''راضی! مجھے سرائیکی صرف بولنی نہیں آتی، سمجھ پوری آتی ہے۔ جس سے محبت کرتے ہیں اس کی ہر چیز سے محبت ہوتی ہے۔ ادھر جتنے بھی لڑکے تھے ان میں سے کسی کو بھی سرائیکی نہیں آتی تھی اس لئے میں بولنا نہیں سیکھ سکی۔ لیکن سرائیکی گانے اور فلمیں دیکھ دیکھ کر اس زبان کی سمجھ ضرور آ جاتی ہے۔ تم نے انکل سے جو بھی کہا تھا مجھے سب سمجھ آ گئی تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں اسے پکڑنے کے لئے بھاگا۔ وہ مجھ سے زیادہ تیز نکلی اور مجھ سے اپنا بازو چھڑوا کر ریت پر بھاگنے لگی۔ میں بھی مسکراتا ہوا اس کے پیچھے اسے پکڑنے کے لئے بھاگنے لگا۔

ہم دونوں دو گھنٹے تک گھر واپس آئے تو ابو تب تک سارا پروگرام طے کر چکے تھے۔ شادی اگلے ہفتے یعنی پورے نو دن بعد مقرر ہوئی اور تب تک کے لئے ایسگارڈ ایمان کے ساتھ سامنے والی کوٹھی میں منتقل ہو گئی۔ سامنے والی کوٹھی ہماری ہی تھی۔ ابو نے یہ پورا پلاٹ خرید کر اس کو میرے نام پر کروا دیا تھا اور یہاں پر خوبصورت سا بنگلہ بنوا دیا تھا۔

قارئین شاید سوچ رہے ہوں گے کہ اتنے پیسے کہاں سے آ گئے؟ تو جناب! ایسگارڈ نے یونان سے ہی

میرا گھر کا نمبر لے لیا تھا۔ جب میں تھیوا سے بھاگ کر سلونیکی گیا تھا تو ایسگارڈ نے میرا پتہ کروانے کیلئے ڈیرے سے میرا گھر کا نمبر لیا تھا اور وہ پچھلے تین سال سے لگا تار میرے گھر والوں سے بات کر رہی تھی۔ میرے گھر کے سبھی افراد ایسگارڈ سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اسے دل سے اپنے گھر کی بہو بھی مان چکے تھے۔ گھر میں عامر اور ارم کے علاوہ اور کوئی بھی انگلش نہیں جانتا تھا۔ ایسگارڈ نے محنت کر کے اردو بھی سیکھی اور پورے گھر کا دل بھی جیتنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہی لگا تار میرے گھر میں پیسے دیتی رہی تھی جس سے ابو نے نہ صرف یہ بنگلہ بنوایا بلکہ کوئی 200 ایکڑ سے اوپر زمین بھی خرید لی تھی۔

اس وقت اس پورے علاقے میں سب سے بڑے زمیندار میرے ابو ہی تھے۔ انہوں نے گاؤں سے باہر زمین لے کر چاروں بھائیوں کیلئے علیحدہ علیحدہ گھر بھی بنوا دیئے تھے۔ مجھے دو گھر ملے تھے، ایک باہر اور ایک سامنے والا بنگلہ۔ امریکی ڈالروں کی کمائی تھی۔ ان میں اتنی برکت تو نہیں ہوتی لیکن اگر آگے سنبھالنے والے میرے والد جیسے لوگ ہوں تو برکت آ ہی جاتی ہے۔ انہوں نے ایک بھی پیسہ ضائع نہیں کیا تھا۔ انہوں نے سبزی کا کام بھی بہت پھیلا دیا تھا۔ روزانہ کم از کم 100 لڑکے سبزی توڑتے تھے۔ آس پاس کے تین چار دیہاتوں سے لڑکے ادھر سبزی توڑنے کے لئے آتے تھے۔ ابو نے عامر کو بھی فون کر دیا اور وہ بھی چھٹیاں لے کر رات کو ہی پہنچ گیا۔

اگلے دن گھر میں پرات رکھ دی گئی اور شادی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ روزانہ رات کو گھر میں پرات بجا بجا کر لڑکیاں گاتیں اور دن کو دوسرے ہنگامے ہوتے رہتے۔ ایسگارڈ ایک بار ایمان کے ساتھ دوسرے گھر گئی تو اس کے بعد دیکھنا ہی نصیب نہ ہوسکا۔ میں لاکھ کوششیں بھی کرتا لیکن پھر بھی وہ میرے سامنے نہ آتی۔ شادی سے پہلے ہم دونوں کو مکمل طور پر جدا کر دیا گیا تھا۔ صرف فون کی سہولت موجود تھی اور ہم دونوں اسی پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہتے۔ امریکہ میں ایسگارڈ کے والد کو بھی شادی کی اطلاع کر دی گئی اور دو دن بعد ہی وہ بھی پاکستان آ گئے۔ شادی کے فوراً بعد ایمان واپس نیویارک چلی گئی، ایسگارڈ کے ماں باپ بھی واپس چلے گئے جبکہ میں اور ایسگارڈ ادھر ہی رک گئے۔ ہمارا ہنی مون تھا اور میں اپنا یہ ہنی مون روہی کے حسن سے دور جا کر نہیں منانا چاہتا تھا۔ ایک مہینے کے خوبصورت سے ہنگاموں کے بعد ہم دونوں واپس امریکہ آ گئے اور ادھر مونٹانہ میں ہی رہنے لگے۔

اب امریکہ ہی میرا ملک تھا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی امریکہ میں بسنے کا کہا لیکن کوئی بھی

نہیں مانا، میں نے سب کے ویزے بنوا کر دے دیئے تھے۔ وہ امریکہ آتے تھے، مہینہ دو مہینے رہتے تھے اور پھر واپس چلے جاتے تھے۔ کوئی بھی اپنا ملک چھوڑ کر ادھر نہیں بسنا چاہتا تھا۔ میرے باپ کے پاس تین بیٹے تھے۔ انکل کارٹر کی صرف ایک ہی اولاد تھی ایسگارڈ۔۔۔ اور میں اسے ان سے دور نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ ان کو ایک بیٹے کی ضرورت تھی اور وہ بیٹا میں بن گیا تھا۔ سب کچھ ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔

''راضی! خدا کو مانتے ہو؟'' ہم دونوں اس وقت سن ریور کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''مانتا ہوں ایسگارڈ! بلکہ صرف مانتا ہی نہیں ہوں بلکہ پورے دل و جان سے محبت بھی کرتا ہوں۔ وہ واقعی کبھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کے فیصلوں کو سمجھنے میں ٹائم ضرور لگتا ہے لیکن سمجھ ضرور آ جاتی ہے۔ میں نے ایک کنکر پکڑا اور اسے دریا کے پانی میں پھینکنے لگا۔

''ایسگارڈ! خدا صرف ایک ہی ہوتا ہے، کوئی دوسرا خدا نہیں ہوتا۔ پاکستان سے لے کر امریکہ تک۔۔۔ بلکہ پوری دنیا میں سبھی جگہ اسی کی صرف اس کی بادشاہی ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنی منزل پا لی تھی اور محبت کا سفر ختم ہو چکا تھا۔

ختم شد

اس کے چہرے کی حسین آنکھ یاد آتی ہے
سرخ لبوں کی سرخی وہ کالی زلف یاد آتی ہے
اس نے بولا تھا بچھڑتے وقت بھول جاؤ گے مجھے
اپنی ہستی کو تو بھول گیا تو اب بھی یاد آتی ہے
تیرا ملنا مل کے بچھڑ جانا ایک خواب سا لگتا ہے
تیری معصوم سی مسکراہٹ وہ محبت یاد آتی ہے
دسمبر کی سخت سردی میں احساس بھی جم جاتے ہیں
زرد پتے نہر کا کنارہ تیرے قدموں کی آہٹ یاد آتی ہے
اب جو بچھڑے ہو جو تم ملنا بھی کبھی ہو گا
شبِ وصل میں تیری پائل کی چھن چھن یاد آتی ہے
روہی کی محبت کبھی ٹوٹ کے بکھرے گی نہ عمر بھر
وہ تیرے وعدے تیری ایک ایک بات یاد آتی ہے
تو یاد آتی ہے تو خود کو بھول جاتا ہوں میں راضیؔ
میرے محبوب تیری یاد ہر دن ہر رات پل پل آتی ہے

رضوان علی راضیؔ

رضوان علی گھمن کا نام اب کسی تعارف کامحتاج نہیں رہا، ہر خاص و عام ان کے نام اور مقام سے واقف ہے۔ آپ بہاولپور کے ایک ریگستانی گاؤں میں پیدا ہوئے اور پچھلے گیارہ سال سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ آپ کی مصروفیات میں ناول نویسی، کالم نگاری اور شاعری شامل ہیں۔

رضوان علی گھمن آج کے ممتاز ترین اردو ناول نگار ہیں اور ان کا رومانوی داستانوں اور سفرناموں کو پیش کرنے کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ ان کی تحریروں میں تاریخی حقائق اور افسانوی رومانس کا بھی حسین امتزاج پایا جاتا ہے جو کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔ رضوان علی گھمن کا زیادہ تر کام رومانوی اور فکشن ناولوں پر مشتمل ہے۔

اگرچہ رضوان علی گھمن نے اور بھی بہت سے ناول لکھے اور مختلف ملکی و بین الاقوامی اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہتے ہیں لیکن ''دوسرا خدا'' سیریز انکی پہچان کا باعث بنا۔ ''دوسرا خدا'' سیریز میں انہوں نے نئے نئے کردار متعارف کروائے اور رومانوی ناولوں کو ایک نئی جہت دی۔ کئی ناول بہت ہی اچھوتے موضوع اور انداز میں لکھے، جن میں ''زرداری'' ''چانسلر'' اور ''سرائیکی ٹرمپ'' کے نام مثال کے طور پر لئے جاسکتے ہیں۔

زیرِ نظر ناول ''27140 کلومیٹر'' دوسرا خدا سیریز کا آخری ناول ہے جس میں ستائیس ہزار ایک سو چالیس کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد محبوب کے وصال کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے قارئین کو پسند آئے گا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ناول پسند آنے پر رضوان علی گھمن صاحب کو اپنی قیمتی آراء سے ضرور نوازیں۔ شکریہ!